ڈیجیٹل ایڈیشن سوم
قُوا
أَنْفُسَكُمْ
وَأَهْلِيكُمْ
نَارًا

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

اس کتاب کا اصل موضوع اس میزان کا تعین ہے، جس کا حصول انفرادی سطح پر اخروی نجات کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔ وہ میزان جس کے استعمال سے، مجھ جیسے ایک غیر عالم شخص کے لیے بھی، اس دنیاوی زندگی میں عصر حاضر کے فتنوں کی پہچان ممکن بن سکے۔ جو اس دنیا میں صراط المستقیم کی نشاندہی کا ذریعہ؛ آخرت کی منازل کی آسانی کا باعث اور جہنم سے نجات کا پروانہ بن سکے۔ یقیناً جس میزان پر پورا اترنے والے اقوال و اعمال ہی روز محشر نفع بخش کہلانے کے قابل ہوں، اس میزان کے لیے لازم ہے کہ اس کی بنیاد صرف قرآن و احادیث ہی پر ہو اور میرے نزدیک جس میزان کی تصدیق میں قرآن اور حدیث کے واضح اور صریح دلائل موجود ہوں، تو اسی میں تولے جانے والے ایک وزن کے ذریعے، اس کی مزید توثیق کروانا ایک لایعنی کاوش ہے؛ یقیناً یہ میری ذاتی رائے ہے اور قارئین اپنے اپنے حلقہ جات میں جس عالم دین پر چاہیں، اس کتاب کے مندرجات کو پیش کر کے عمل سے پہلے اطمینان قلبی کے حصول کی کوشش کر سکتے ہیں۔

ان مضامین میں جو بھی غلطی یا کوتاہی ہو، وہ میرے نفس کی گمراہی اور شیطان کی دخل اندازی ہے؛ اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس غلطی یا کوتاہی سے پاک ہیں۔ میرا یہ دعوی نہیں ہے کہ ان مضامین میں موجود مواد کو حرف آخر سمجھتے ہوئے اس کو ماننا لازم ہے؛ میرا تو فقط یہ مطالبہ ہے کہ اگر آپ کو ان مضامین میں موجود کسی بات سے علمی اختلاف ہے اور اس کی بنیاد فقط قرآن اور حدیث ہے تو راقم کی اصلاح فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

طالب دعا

فرقان الدین احمد

+92 (0)304 515 3435

کتاب	------------	قوا انفسکم و اھلیکم نارا
تحریر	------------	فرقان الدین احمد
تاریخ تکمیل	------------	ذوالحجہ ۱۴۴۳
ناشر	------------	---
ڈیجیٹل ایڈیشن	------------	سوم
ترتیب	------------	5.5انچ8.5xانچ
تعداد	------------	---
صفحات	------------	۲۹۱
قیمت	------------	برائے صدقہ جاریہ

یہ کتاب صدقہ جاریہ کی نیت سے ہدیہ کے طور پر آپ کے ڈیجیٹل ڈیوائس تک پہنچی ہے، اب آپ سے دلی درخواست ہے کہ اس کتاب کو اپنے تک محدود نہیں رکھیں۔ اگر خود مطالعہ نہ بھی فرمائیں تو کم از کم اس کو اپنے اہل وعیال اور دوست واحباب تک صدقہ جاریہ کی نیت سے پہنچادیں؛ کیا معلوم کہ اگر آپ کی وساطت سے اللہ سبحان وتعالیٰ نے کسی ایک شخص کو بھی دین کی فکر نصیب فرمادی تو روزِ محشر آپ اس کے اجر سے اپنے آپ کو محروم نہیں پائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

فہرست مضامین

	مضمون کا نام		صفحہ نمبر
۱	مقدمہ	------	2
۲	حق کے پہچان کی حقیقت	------	7
۳	رخصت اور حفاظتی تدبیر کی حقیقت	------	16
۴	تقلید کی حقیقت	------	20
۵	محاسبہ کی حقیقت	------	24
۶	اولاد۔[صدقہ جاریہ] کی حقیقت	------	30
۷	عقیدہ توحید کی حقیقت	------	36
۸	عقیدہ رسالت کی حقیقت	------	49
۹	عبادت اور عبادات کی حقیقت	------	60
۱۰	تقدیر کی حقیقت	------	64
۱۱	ضروریات دین کی حقیقت	------	74
۱۲	ایمان کی حقیقت	------	80
۱۳	طاغوت کی حقیقت	------	87
۱۴	نظام کی حقیقت	------	94
۱۵	شریعت کی حقیقت	------	105
۱۶	گناہوں کی حقیقت	------	115
۱۷	نفاق کی حقیقت	------	123
۱۸	کفر کی حقیقت	------	132

۱۹	نواقض اسلام کی حقیقت	------	150
۲۰	تبلیغ کی حقیقت	------	161
۲۱	الولاء والبراء کی حقیقت	------	170
۲۲	جہاد کی حقیقت	------	183
۲۳	جہاد پر عمومی اعتراضات کی حقیقت	------	198
۲۴	اصطلاحات کی حقیقت	------	213
۲۵	جمہوریت کی حقیقت	------	226
۲۶	آئین پاکستان کی حقیقت	------	235
۲۷	علمائے حق کی حقیقت	------	245
۲۸	فتنہ عظیم کی حقیقت	------	260
۲۹	امام مہدی کی حقیقت	------	272
۳۰	اسراف، ابذار اور تکلف	------	279
۳۱	اسبال ازار	------	286

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

مقدمہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ

وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ [سورة التحريم؛٦]

مومنو!

اپنے آپ کو اور اپنے اہل عیال کو آتش (جہنم) سے بچاؤ

جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے (مقرر) ہیں جو

ارشاد خدا ان کو فرماتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور

جو حکم ان کو ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔

یہ دنیا دار الامتحان ہے اور ہماری کل زندگی پر محیط اس امتحانی پرچہ کی اصل کامیابی، جس کا تعلق ہماری ذاتی کوششوں سے ہے، وہ جہنم سے نجات کا پروانہ ہے نہ کہ جنت کا حصول۔ جنت تو محض اللہ کا انعام، اس کا فضل اور رحمت خصوصی ہے، نہ کہ ہمارے کسی بھی کوشش یا عمل کے عوض ہمارا استحقاق۔

ہماری عملی کوششوں کی سمت صحیح ہونے کا دارومدار دین کے چند بنیادی حقائق کے ادراک پر ہے، ورنہ کہیں ہماری مثال قرآن کے مطابق ان لوگوں کی سی نہ ہو جائے "وہ لوگ جن کی سعی دنیا کی زندگی میں برباد ہوگئی اور وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں" [سورة الكهف ؛ ۱۰۴] کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے ہمارے سامنے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں بائیں کچھ اور لکیریں کھینچیں اور فرمایا کہ یہ مختلف راستے ہیں **جن میں سے ہر راستے پر شیطان بیٹھا ہے** اور ان راستوں پر چلنے کی دعوت دے رہا ہے، اس کے بعد نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ "یہ میرا سیدھا راستہ ہے سو اس کی پیروی کرو، **دوسرے راستوں کے پیچھے نہ پڑو**، ورنہ تم اللہ کے راستے سے بھٹک جاؤ گے"۔ [مسند احمد۔ جلد دوم۔ حدیث ۲۱۸۸]

یہ تمام مضامین اسی "الصراط المستقیم" کو عصر حاضر میں ہر قسم کی باطل رخصتوں اور نفس پرستانہ مصلحتوں پر مبنی تاویلات کے بیچ میں ڈھونڈنے کی کوشش ہے اور اسی سعی میں راقم سمیت اس کتاب کے ہر قاری پر [انشاء اللہ] رسول اللہ ﷺ کا وہ فرمان مکمل طور واضح ہو جائے گا جس میں آپ ﷺ نے فرمایا "ابتداء میں اسلام اجنبی [مسافر کی مانند غیر معروف] تھا اور **عنقریب پھر غیر معروف ہو جائے گا** پس خوشخبری ہے بیگانہ بن کر رہنے والوں کے لئے"۔ [سنن ابن ماجہ۔ جلد سوم۔ فتنوں کا بیان۔ حدیث ۸۲۶] کیونکہ اس دجالی فتنوں کے دور میں جس "اسلام" کی دعوت قرآن اور حدیث دیتے نظر آتے ہیں، وہ نہ صرف ہمارے معاشروں میں ناپید ہے بلکہ اس کے ذکر سے بھی ہمارے منبر، مساجد، مدارس، دینی و سیاسی حلقے، انفرادی، باہمی یا اجتماعی سوچ عاری نظر آتی ہے [الا ما شاء اللہ]۔

عصر حاضر میں "حق کے دعویداروں" میں کثرت کی بنا پر، یہ کتاب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مندرجہ ذیل قول کی روشنی میں ایک ادنی سی طالب العلمانہ کوشش ہے؛

- ✓ "تم میں سے کوئی دین میں کسی آدمی کی تقلید نہ کرے کہ اگر وہ ایمان لائے تو یہ بھی ایمان لائے اور اگر وہ کفر کرے تو یہ بھی کفر کرے، اور اگر اقتداء کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تو مردوں (فوت شدہ) کی کرو، زندوں کی نہیں کیوں کہ **زندہ افراد پر فتنہ سے بچنے کی کوئی ضمانت نہیں**" [مجمع الزوائد جلد:۱ صفحہ:۱۸۰]

ہر دینی کتاب میں دو لوازم کی موجودگی ہی اس کو فکری طور پر قبولیت کی سند عطا کرتی ہے؛ اول اس کتاب میں موجود دلائل کی بنیاد فقط قرآن ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حج الوداع کے موقع پر فرمایا؛۔۔۔۔۔اور میں تم میں ایک چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور تم لوگ اللہ کی کتاب **قرآن مجید کو مضبوطی سے**

پکڑے رکھنا۔۔۔۔[صحیح مسلم۔ جلد دوم۔ حج کا بیان۔ حدیث ۴۵۶] اور دوم ان قرآنی دلائل کی وہی تاویل بیان کی جائے جو احادیث رسول ﷺ کے تابع ہو؛ جیسا کہ ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ "جو لوگ دلائل کی باتیں کرتے ہیں ان کے سامنے قرآن نہ پیش کیا کرو کیونکہ "کلام اللہ ذو وجوہ" قرآن کریم کے ایک جملے کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، لوگ اپنی مرضی کا معنی کریں گے۔ اس لیے **جب بھی دلیل پکڑو تو حدیث سے پکڑو**، کیونکہ سنت واضح ہے، دوٹوک ہے۔ سنت اور حدیث بتاتی ہے کہ فلاں آیت کا معنی یہ ہے جبکہ قرآن کریم ذو وجوہ ہے اس کے الفاظ کا ایک معنی بھی کیا جاسکتا ہے اور دوسرا بھی، ایک لفظ کے کئی معنی کیے جاسکتے ہیں"۔ امید ہے کہ آپ اس کتاب میں یہ دونوں لوازم اپنی پوری جامعیت کے ساتھ موجود پائیں گے۔

اس کتاب کے مضامین کے عنوانات میں "**حقیقتوں سے مراد**" وہ نظریاتی امور نہیں ہیں، جو صدیوں سے اس امت کے علماء کے درمیان بحث و مباحثہ کا موضوع رہے، مگر علماء نے عام عوام کو ان دقیق بحثوں سے دور رکھا؛ مثلاً جیسے عقائد کے مسائل میں الماتریدیۃ، الاشعریۃ، اور سلف کے اختلافات؛ علم اور عِلْمُ الکلام کے مسائل، طریقت و شریعت کی بحثیں وغیرہ، مزید براں عام عبادات میں فقہی اختلاف تو آج بھی ہر فقہی و غیر فقہی مذہب کے صاحب نظر علماء کے نزدیک فقط ترجیح کا اختلاف ہے۔ بلکہ اس کتاب میں موجود مضامین میں "**حقیقتوں سے مراد**"، وہ تمام ظاہری عقائد، اقوال اور اعمال ہیں جن کی حقانیت، دلائل کی بنیاد پر علماء پر واضح ہے اور ان کے مد مقابل وہ ظاہری عقائد، اقوال اور اعمال جن کا کفر؛ نفاق؛ فسق و فجور ہونا بھی دلائل کی بنیاد پر علماء پر واضح ہے۔ اس کتاب کا ہر مضمون اپنی اہمیت کے حساب سے ایک مکمل کتاب کا متقاضی ہے، مگر اس کتاب میں ان مضامین کی حیثیت محض تذکیر کی سی ہے اور بنیادی مقصد قاری کے ذہن میں اس تصنیف کے ذریعے اس "**میزان**" کا تصور اجاگر کرنا ہے جس پر دنیاوی اور اخروی کامیابی کا دارومدار ہے اور جس کے جامع تصور سے ہر مسلمان معاشرہ عمومی طور پر محروم ہے۔

اس کتاب کے پہلے تین مضامین کی حیثیت کسی بھی دینی معلومات سے فائدہ اٹھانے کے طریقہ کار کے متعلق ہے، تیسرے اور چوتھے مضمون کی حیثیت مواعظ حسنہ کی اور آخری دو مضامین کی حیثیت محض ایک تحقیقی نقطہ نظر کی ہے۔ باقی تمام مضامین کا تعلق عصر حاضر کے تناظر میں، دین کے چند بنیادی اور اہم ترین عقائد یا ان گمراہیوں سے ہے جو دین کے بنیادی عقائد کی نفی کا باعث بنتی ہیں۔ التماس ہے کہ اس کتاب کا مکمل

مطالعہ فرمائیں کیونکہ اسلام کے تمام اجزا کا باہمی ربط اس نوعیت کا ہے کہ کسی ایک مضمون میں بیان کردہ حقیقت کے مکمل ادراک اور دین میں اس کی اہمیت کے احساس کا دارومدار شاید دوسرے مضامین میں بیان کردہ حقیقتوں کی آگاہی پر ہو۔

اس کتاب کی تدوین مندرجہ ذیل دو احادیث کو مد نظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے؛

- ✓ "علم کا طلب کرنا ہر **مسلمان پر فرض** ہے"۔ [بحوالہ ابن ماجہ اور بیہقی]

اس کتاب کے اکثر مضامین کا تعلق ان موضوعات سے ہے، جن کی علمی حیثیت دین میں ضروریات دین کی ہے؛ جن کا جاننا اور ماننا ایمان کے لیے لازم اور ان کا انکار کفر کے مترادف۔ اسی تناظر میں چند انتہائی بنیادی اور اہم ترین عقائد یا ان گمراہیوں کو جو دین کے بنیادی عقائد کی نفی کا باعث ہیں، سوال و جواب کی صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش کرنا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے اعمال کا جائزہ لے کر فیصلہ کر سکیں کہ ہم "**قوا انفسکم و اہلیکم نارا**" والے مقصد میں کتنے کامیاب ہیں۔

- ✓ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس آدمی نے **علم کو اس غرض سے حاصل کیا** کہ اس کے ذریعے علماء پر فخر کرے، بیوقوفوں سے جھگڑے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ میں داخل کرے گا"۔ [مشکوۃ شریف ۔ جلد اول ۔ علم کا بیان ۔ حدیث ۲۱۸]

کسی بھی دینی کتب سے عمومی طور پر اور قرآن حکیم سے خصوصی طور پر استفادہ کے لیے لازم ہے کہ انسان کے دل میں "**تقویٰ**" کا وصف موجود ہو؛ جیسا کہ قرآن حکیم نے اپنے آغاز میں ہی اس شرط کو لازم ٹھہرا دیا ہے۔ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى **لِّلْمُتَّقِينَ** [سورة البقرة ؛ ۲] یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں **(خدا سے) ڈرنے والوں** کی رہنما ہے۔

"**تقویٰ**" جس کا آسان ترین ترجمہ "**اللہ تعالیٰ کے خوف**" سے کیا جاتا ہے؛ مگر اس خوف کی عملی شکل سے ناواقفیت کی وجہ سے اکثریت کے نزدیک "**خالق سے خوف**" کی حیثیت محض "**مخلوق سے خوف**" کے مترادف ہونے کے باعث یہ بھی انتہائی جز وقتی اور مبنی بر واقعات ہے۔

درحقیقت "تقویٰ" کا وصف دو مثبت قسم کے کل وقتی خوف کا مجموعہ ہے؛

- اول "اللہ کی ناراضگی کا خوف"۔
- دوم "اپنے اعمال کے رائگاں ہونے کا خوف"۔

پہلا خوف انسان کو عملی طور پر اللہ کی معصیت سے روکتا ہے اور دوسرا خوف انسان کے لیے نہ صرف نیک اعمال پر اضافہ اور استقامت کا باعث بنتا ہے بلکہ ان اعمال میں اخلاص کے حصول کا ذریعہ بھی۔

جو مسلمان بھی تقویٰ کے وصف سے مزین ہو گا وہ کبھی بھی اپنی دینی و دنیاوی زندگی سے مطمئن نہیں ہو سکتا؛ جیسا کہ صحابہ ﷢ کی زندگیاں، جن کو اپنی زندگیوں میں ہی اللہ تعالٰی کی رضامندی کا پروانہ مل جانے کے باوجود، اس تقویٰ کے کل وقتی وصف نے اپنے مقصد تخلیق سے کبھی غافل نہیں ہونے دیا۔

- ✓ رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ [سورة الكهف ؛ ۳۷] (یعنی ایسے) لوگ جن کو خدا کے ذکر اور نماز پڑھنے اور زکوٰة دینے سے نہ سوداگری **غافل کرتی ہے** نہ خرید و فروخت۔ وہ اس دن سے جب دل (خوف اور گھبراہٹ کے سبب) الٹ جائیں گے اور آنکھیں (اوپر کو چڑھ جائیں گی) ڈرتے ہیں۔

لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله محمد رسول الله

اللهم صل على سيدنا محمد و على اٰله و صحبه و بارك و سلم تسليماً كثيرا كثيرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

حق کے پہچان کی حقیقت

اس پر فتن دور میں ہر مسلمان کا ایمان، الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کی بدولت، ہر وقت امتحان کی کیفیت سے گزر رہا ہے۔ دینی اور دنیاوی معلومات کا سیلاب موجزن ہے، جس کے سامنے جہاں کوئی بند باندھنا ناممکن ہے، وہیں فقط عقلی و من پسند نقلی دلائل کی بنیاد پر ان مختلف فیہ دینی و دنیاوی معلومات میں سے حق کو پہچاننا اس بند باندھنے سے بھی زیادہ ناممکن ہے۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے دجال کے بارے میں فرمایا کہ "اس کے ساتھ پانی اور آگ ہو گی پس اس کی **آگ ٹھنڈا پانی** ہو گا اور اس کا **پانی آگ** ہو گی پس تم ہلاک نہ ہونا"۔ [صحیح مسلم ۔ جلد سوم ۔ فتنوں کا بیان ۔ حدیث ۲۸۶۷]

مندرجہ بالا حدیث فقط اس دجالی فتنوں کے دور میں محض عقلی و من پسند نقلی دلائل کی بنیاد پر ثابت شدہ حقیقت کو ہی نہیں، بلکہ ان آنکھوں دیکھے ظاہری حقائق کی نفی کو بھی، ایمان کی سلامتی کے لیے لازم قرار دے رہی ہے، جو قرآن اور حدیث کے صریح عقائد سے متصادم ہوں۔ مزید بر آں۔۔۔۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم لوگ اپنے سے **پہلے لوگوں کی [ایسی زبردست] پیروی کرو گے** [حتّٰی کہ] ایک ایک بالشت اور ایک ایک گز پر [یعنی ذرا سا بھی فرق نہ ہو گا] حتّٰی کہ اگر وہ لوگ کسی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں گے تو تم بھی داخل ہو گے"؛ ہم نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ یہود و نصاریٰ مراد ہیں؛" آپ ﷺ نے فرمایا "پھر اور کون مراد ہو سکتا ہے"۔ [صحیح بخاری ۔ جلد دوم ۔ انبیاء علیہم السلام کا بیان ۔ حدیث ۷۱۳]

اس حدیث کے مخاطب ہمارے تمام طبقات [یعنی عوام و خواص] ہیں۔ امت محمدیہ کے علمائے سوء میں بھی بنی اسرائیل کے علمائے سوء کی مانند دنیا پرستی عروج پر ہو گی اور انہی کی بدولت "**اللہ کا دین**" حکمرانوں اور

صاحب حیثیت لوگوں کے نزدیک گھر کی باندی کے برابر ہوگا اور مسلمان عوام کی اکثریت بھی بنی اسرائیل کی عوام کی طرح [قرآن کے فتوی کے مطابق]، دنیا کی محبت میں اپنے علماء اور مشائخ کے تاویل باطلہ، بے دلیل اور قیاس باطلہ کی بنیاد پر فتاوٰی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم صریح[1] پر ترجیح دیں گے اور اس حدیث کی سچائی، عصر حاضر میں اس امت کے کسی اندھے پر بھی مخفی نہیں ہے؛ جہاں حکومتی منشور کی پاسداری میں کبھی تو ہمارا دینی طبقہ قتال کے بغیر جہاد کا علم بردار ہوتا ہے اور کبھی صف بندی کے بغیر باجماعت نماز کا مبلغ۔

- ✓ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ [سورة التوبة ؛ ۳۱] انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابن مریم علیہ السلام کو **اللہ کے سوا خدا بنالیا** حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔

بہر کیف، الحمد للہ، امت محمدیہ پر اللہ سبحان و تعالیٰ کا انعام خصوصی ہے، کہ پچھلی امتوں کی طرح یہ امت کلی طور پر کبھی بھی گمراہ نہیں ہوگی اور اس میں "طائفہ المنصورہ" کی صورت میں، علمائے حق اور ان کے متبوعین کا ایک گروہ موجود رہے گا، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا نزول ہو جائے۔ اسی لیے اس دجالی فتنوں کے دور میں ہمیں در حقیقت اپنے جان و مال سے زیادہ اپنے ایمان کی حفاظت کی فکر ہونی چاہیے، اور ایمان کی حفاظت فقط دو ہی طریقوں سے ممکن ہے، یا تو خود عالم حق کے درجہ پر پہنچ جائیں ورنہ کم از کم ان کے متبوعین کے درجہ پر، کیونکہ بھیڑیا اسی بکری کو کھاتا ہے جو گلے سے الگ ہو۔

مزید براں، اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں "قوۤا انفسکم و اہلیکم نارا" کی آیت نازل فرما کر، ہم پر اپنی اور اپنے گھر والوں کی جہنم کی آگ سے نجات کی کوشش کو لازم ٹھہرا دیا ہے اور یہ کتاب اسی مقصد اور فرض کے حصول کی ادنی سی طالب العلمانہ کوشش ہے؛ کیونکہ علمائے حق کی پہچان کے لیے لازم ہے کہ طالب حق

---

[1] حکم صریح سے مراد دین کے وہ اصولی احکامات مراد ہیں جن پر اہل سنت والجماعۃ کا کلی اتفاق ہے اور ان کی حیثیت دین میں ضروریات دین کی ہے۔

کو ان چند بنیادی اصولوں اور عقائد کا ادراک ہو جن کی کسوٹی پر کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہو سکے، ورنہ عرب و عجم میں، آج تک ہر عالم فقط "**عالم حق**" ہونے کا ہی دعویدار ہے۔

اُ۔ اصول اول؛عقائد کی حفاظت

قرآن وحدیث میں موجود علم کی تین نوعیتیں ہیں، ایک علم کا تعلق "**عقائد**" سے ہے جو کہ بنیادی اور اصل مطلوب ہے اور دوسرے علم کا تعلق "**عمل**" سے ہے، جس کی حیثیت پہلے علم کے متبوع کی ہے نہ کہ اصل کی۔ میزان پر بھی اعمال میں وزن انہی عقائد کی وجہ سے ہے ورنہ ان عقائد کے بغیر تو اعمال "هباء منثورا" بنا دیئے جائیں گے۔ یعنی عقائد کی حیثیت "**اعمال کی نیتوں**" کے قائم مقام اور ان اعمال کے صدور کی واحد بنیاد ہونا ہے، جن کی بدولت ہی یہ اعمال دنیاوی اور اخروی کامیابی کے ضامن قرار پا سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن و سنت میں دینی و دنیاوی اعمال میں حقیقی امور کی بنیاد پر رخصتوں اور احتیاطی تدابیر کا دروازہ موجود ہے، بر خلاف عقائد کے جو ہر قسم کی رخصتوں اور احتیاطی تدابیر سے ماوراہیں۔ تیسرے علم کا تعلق "**اخبار**" سے ہے جو قرآن و حدیث میں موجود امثال؛ قصص؛ بشارتوں اور انذار پر مشتمل ہے۔

دین اسلام میں دینی یا دنیاوی اعمال کا واحد مقصد، ان اعمال سے منسوب قرآن و حدیث میں بیان کردہ عقائد کا "**اثبات**"، ان عقائد کی "**تشہیر**" اور ان عقائد میں "**ایمان کے اضافہ**" کا باعث بننا ہے۔

> مثلاً کلمہ شہادت ایک عقیدہ ہے اور نماز اس عقیدہ کے "**اثبات**" کا اظہار ہے؛ اسی لیے حدیث میں نماز کو کفر اور اسلام کے درمیان فرق قرار دیا گیا ہے؛ اسی طرح حج، امر بالمعروف و النہی المنکر، اقدامی جہاد وغیرہ نہ صرف دینی عقائد کو "**ثابت**" کرتے ہیں بلکہ ان کی "**تشہیر**" کا بھی باعث بنتے ہیں؛ اور ان اعمال پر استقامت اور ہماری نیت کا اخلاص ہی ان عقائد میں "**ایمان کے اضافہ**" کا باعث بنتا ہے۔

ہر وہ دینی و دنیاوی رائے جو کسی ایسے عمل کے جواز کو ثابت کرے جو اس عمل سے منسوب قرآن و حدیث میں بیان کردہ عقائد کی "**نفی**"، ان عقائد کے "**اخفا**" یا ان عقائد پر "**ایمان کی کمی**" کا باعث بنے، تو اگر اس عمل کا تعلق دینی امور سے ہے تو یہ رخصت کہلوائے گا ورنہ حفاظتی تدبیر یا مصلحت۔ رخصت کی صورت

میں اس عمل کو قرآن اور حدیث سے ثابت ہونا لازم ہے اور حفاظتی تدبیر یا مصلحت کا ذکر قرآن اور حدیث میں عنقا ہونے کی صورت میں، ان کا مقاصد شریعت [یعنی بالترتیب دین؛ انسانی جان؛ نسل؛ عزت؛ عقل اور مال] کے تابع ہونا لازم ہے۔ مگر دونوں کے حدود و قعود کا دارومدار حقیقی امور سے ہے نہ کہ غیبی یا فرضی امور سے۔

مثلاً قرآن و احادیث میں باجماعت نماز سے پیچھے رہنے کی تمام رخصتوں کا تعلق حقیقی امور سے ہے۔ غیبی یا فرضی امور کی وجہ سے تو ایک نابینا صحابیؓ تک کو بھی رخصت عطا نہیں فرمائی گئی۔ اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کی تمام رخصتوں کا تعلق بھی حقیقی امور سے ہے نہ کہ جان جانے کہ غیبی امر سے، ورنہ تو جہاد فرض ہی نہ قرار پا سکتا۔ دین میں رخصت اور حفاظتی تدبیر کے مطلوب تصور سے مزید آگاہی کے لیے، اس سے اگلے مضمون "رخصت اور حفاظتی تدبیر کی حقیقت" کا مطالعہ فرمائیں۔

ب. اصول دوم؛ "اَلْوَھَنُ" سے حفاظت

اپنی حقیقت میں پہلا اصول ہی حق کی پہچان کا بنیادی اور دائمی اصول ہے؛ اس دوسرے اصول کی حیثیت محض وقتی اور پہلے اصول کے فروع کی سی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور اس کی روشنی میں عصر حاضر میں امت مسلمہ کی عمومی حالت کے پیش نظر، یہ دوسرا اصول ہمارے زندگیوں میں پہلے اصول کی موجودگی کا پیمانہ ہے۔

- ✓ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ثوبانؓ سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ثوبانؓ! اس وقت تمہاری کیا کیفیت ہو گی جب تمہارے خلاف دنیا کی قومیں ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گی جیسے کھانے کی میز پر دعوت دی جاتی ہے؟"۔ حضرت ثوبانؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا اس وقت ہماری تعداد کم ہونے کی بنا پر ایسا ہو گا؟"۔ فرمایا "نہیں، بلکہ اس وقت تمہاری تعداد بہت زیادہ ہو گی لیکن تمہارے دلوں میں "اَلْوَھَنُ" ڈال دیا جائے گا" صحابہ کرامؓ نے پوچھا "یارسول اللہ ﷺ "اَلْوَھَنُ" کیا چیز ہے؟"------

[مسند احمد۔ جلد چہارم۔ حدیث ۱۵۳۵] ------فرمایا "دنیا سے محبت اور جہاد سے نفرت"۔

[مسند احمد۔ جلد نہم۔ حدیث ۲۴۳۷] ------فرمایا "زندگی کی محبت اور موت سے نفرت"۔

اس اصول کے اطلاق کا طریقہ کار، قرآن اور حدیث میں موجود نقلی دلائل کا عصر حاضر میں پیش کردہ دینی یا دنیاوی معلومات، رائے یا فتوی کے مابین تقابلی جائزہ پر مبنی ہے۔ اب ہر وہ دینی یا دنیاوی معلومات، رائے یا فتوی، جو اس "**اَلْوَهَنُ**" کی بیماری کے استحکام یا افزائش کا باعث بنے، وہ رائے یا فتوی قرآن اور حدیث کے ناقص علم پر مبنی ہے اور ایسی ظاہری دینی یا دنیاوی معلومات قابل ردّ ہے۔

اب ہم ان مندرجہ بالا دونوں اصولوں کے سچے اور بے لاگ نفاذ میں کتنے کامیاب ہیں، اس کے لیے ہم قرآن میں موجود مندرجہ ذیل آئینہ میں "یہود" کی جگہ اپنے انفرادی نام کو رکھ کر ہر وقت جائزہ لے سکتے ہیں۔

- ✓ "کہہ دو کہ اے **"یہود"** اگر **تم کو دعویٰ ہو** کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں، تو اگر تم سچے ہو تو [ذرا] **موت کی آرزو تو کرو**۔ اور یہ ان [اعمال] کے سبب جو کر چکے ہیں، ہرگز اس کی **آرزو نہیں کریں گے**۔ اور خدا ظالموں سے خوب واقف ہے۔ کہہ دو کہ **موت جس سے تم گریز کرتے ہو**، وہ تو تمہارے سامنے آ کر رہے گی۔ پھر تم پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے [خدا] کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر **جو کچھ تم کرتے رہے** ہو وہ سب تمہیں بتائے گا"۔ [سورة الجمعة؛٦۔٨]

عصر حاضر میں اختلافی امور کی کثرت اور دینی طبقہ کی طرف سے متضاد حق کے دعووں کے باعث، اپنے ایمان اور اعمال کی صحت کے لیے ان اصولوں کی سمجھ اور اطلاق کی ضرورت دوچند ہو جاتی ہے؛ اسی لیے ان اصولوں کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ اگر ان اصولوں کا اطلاق ہم نیک نیتی سے اپنے نفس پر نہیں بھی کر سکتے تو کم از کم ایسی کسی دینی یا دنیاوی معلومات کی ترویج یا تشہیر میں اپنا حصہ تو نہ ڈالیں، جو ان اصولوں کے منافی ہو اور باطل کی ترویج کے مترادف ہو۔

اگر اس کتاب کے باقی تمام مضامین کو آپ انہی دونوں اصولوں کی روشنی میں مطالعہ فرمائیں گے تو نہ صرف عصر حاضر کے تمام اختلافی امور کی حیثیت آپ پر واضح ہو جائے گی، بلکہ آخرت میں مطلوب اسلام کی اصل شکل بھی انشاء اللہ تعالیٰ آپ پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔

اس مضمون کی تحریر کے وقت چونکہ کروناوائرس کا فتنہ اپنے عروج پر تھا؛اسی لیے اس فتنہ میں اختیار کردہ دینی ودنیاوی اعمال میں موجود حق اور باطل کو ان اصولوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عقائد کی حفاظت کا اصول کا اطلاق؛

کسی بھی غیبی یا فرضی امر کے نتیجہ میں جانی ومالی نقصان کے اندیشہ سے بچاؤ سے کے لیے ایک مسلمان کے ظاہری اقوال اور اعمال کی بنیاد دین اسلام کے مندرجہ ذیل تین بنیادی عقائد ہیں؛

أ. اللہ تعالٰی پر توکل خالص کا عقیدہ۔

ب. تقدیر خیر وشر کا من جانب اللہ تعالٰی ہونے کا عقیدہ۔

ت. موت کا وقت متعین ہونے کا عقیدہ۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا"۔۔۔۔جان لو کہ اگر پوری امت اس بات پر متفق ہو جائے کہ تمہیں کسی چیز میں فائدہ پہنچائیں تو بھی وہ صرف اتنا ہی فائدہ پہنچا سکیں گے جتنا اللہ تعالٰی نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اور اگر تمہیں نقصان پہنچانے پر اتفاق کر لیں تو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر وہ جو اللہ تعالٰی نے تیرے لئے لکھ دیا۔اس لئے کہ قلم اٹھا دیئے گئے اور صحیفے خشک ہو چکے۔" [جامع ترمذی۔جلد دوم۔قیامت کا بیان۔حدیث ۴۱۶]

ان عقائد سے حقیقی امور میں اپنے ایمان کو شک سے محفوظ رکھنے کی کوشش میں عام مسلمان کے لیے حفاظتی تدابیر کی نفی کا اثبات نہیں ہوتا؛جیسا کہ

- ✓ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ "کیا اونٹنی کو باندھ کر توکل کروں یا بغیر باندھے؟" آپ ﷺ فرمایا"باندھو اور اللہ پر بھروسہ رکھ"۔[جامع ترمذی۔جلد دوم۔قیامت کا بیان۔حدیث ۴۱۷]

تقدیر اور حفاظتی تدابیر کے باہمی تعلق کی مزید تفصیل کے لیے مضمون "تقدیر کی حقیقت" مطالعہ فرمائیں۔

اور بیماریوں یا وباؤں کی صورت میں ایک چوتھا عقیدہ بھی مندرجہ بالا تین عقائد کے ساتھ مل کر مسلمان اور کفار کے ظاہری اعمال میں مماثلت میں مانع کا باعث ہوتا ہے؛

ث. مرض کے متعدی نہ ہونے کا عقیدہ۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "**مرض کے متعدی ہونے کی کوئی اصل نہیں** اور نہ بدشگونی، صفر اور الّو کی نحوست کی کوئی اصل ہے۔۔۔۔ [صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ سلام کرنے کا بیان۔ حدیث ۱۲۹۲]

وبائی بیماریوں کا تصور کوئی جدید تصور نہیں ہے کہ جس کے ذکر سے احادیث کا ذخیرہ خالی ہو؛ وباؤں کے سلسلے میں ہمیں حقیقی امور سے منسلک چار حفاظتی تدابیر کا ذکر تو ملتا ہے مگر رخصتوں کے ذکر سے خالی ہے۔ عصر حاضر میں ان حفاظتی تدابیر کو تاویل باطلہ کے ذریعے رخصتوں کے مقام سے بھی بلند کر کے دین کے فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات کو ترک یا ساقط قرار دینے سے، نہ صرف ان اعمال کے ساتھ منسلک دیگر عقائد بلکہ مندرجہ بالا چاروں عقائد کی "**نفی**"، ان کا "**اخفا**" اور ان عقائد پر "**ایمان کی کمی**" کا باعث بننا روز روشن کی طرح عیاں ہے اور مزید کسی دلیل کا محتاج نہیں۔

"اَلْوَهَنُ" سے حفاظت کے اصول کا اطلاق؛

اس اصول کے اطلاق کا طریقہ کار، قرآن اور احادیث میں موجود معلومات اور اس فتنہ کے ردّ عمل میں اختیار کردہ اعمال کا تقابلی جائزہ ہے۔

قرآن اور احادیث میں موجود "وبا" کے نتیجہ میں دینی اعمال میں رخصتیں	
[طاعون عمواس] سن ۱۸ ہجری، شام میں بہت ہی خطرناک اور مہلک طاعون کی وبا پھیلی، جس میں ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم وفات پا گئے، جن میں ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، حرث بن ہشام رضی اللہ عنہ، سہیل بن ہشام رضی اللہ عنہ جیسے کبائر صحابہ بھی شامل تھے، مگر کسی ایسی رخصت کا ذکر ہماری تاریخ کی ضعیف ترین کتابوں میں بھی نہیں ملتا جس کی بنیاد پر اس وبا کے دوران دینی اعمال ساقط یا ترک قرار دیئے ہوں یا ان کی ادائیگی کی ہیبت میں تغیر کیا گیا ہو۔	
قرآن اور احادیث میں موجود "وبا" کے نتیجہ میں دنیاوی اعمال میں احتیاطی تدابیر	
جذامی سے شیر کی طرح ڈر کر بھاگو	جذامی سے سو نیزے کی دوری پر کلام کرو

وبا میں مبتلا شخص کو اپنے گھر رہنے کی ترغیب	وبا والے علاقہ میں داخلے اور خروج کی ممانعت

دینی اعمال میں "کرونا" کے نتیجہ میں دینی طبقہ کی حمایت یافتہ اختیار کردہ رخصتیں		
عمرہ اور حج کا ساقط قرار دینا	جمعہ کی نماز کا ساقط قرار دیا جانا	باجماعت نماز کا ساقط قرار دینا
مسجدوں کی بندش [بشمول مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے]	جماعت کی نماز میں صف بندی کو ساقط قرار دینا	مصافحہ و معانقہ پر بندش
مریض کی عیادت پر پابندی	بچوں اور بزرگوں پر مسجد میں داخلہ پر پابندی	حالت احرام اور حالت نماز میں منہ کو ماسک سے ڈھانپنا
وبا میں فوت شخص کی نماز جنازہ پر پابندی		
دنیاوی اعمال میں "کرونا" کے نتیجہ میں نافذ شدہ احتیاطی تدابیر		
ہر شخص کو اپنے گھر رہنے کا حکم	ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی سفر پر پابندی	ہر شخص سے سماجی فاصلے کا پرچار
ہاتھوں پر دستانوں کا استعمال کی تلقین	ہر وقت چہرہ پر ماسک کے استعمال کی تلقین	ہاتھوں کو متعدد بار بیس سیکنڈ تک دھونے کی ترغیب
سرکاری، غیر سرکاری، کاروباری اور غیر کاروباری اداروں پر بندش	ہسپتالوں میں دیگر تمام مریضوں کے علاج معالجہ پر بندش	تعلیمی اداروں پر بندش
کرونا سے بچاؤ کے حفاظتی ٹیکوں کو لازم قرار دیتے ہوئے عوام پر حیات زندگی کو تنگ کرنا		

اب کوئی بھی صحیح العقل شخص دونوں فہرستوں کا جائزہ لے کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ دین اسلام کے مزاج سے کون سی فہرست ہم آہنگ ہے۔

کس فہرست کا ماخذ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی "**اطاعت**" پر مبنی ہے اور

کس فہرست کا ماخذ دنیا کی محبت اور موت کے خوف یعنی "**اَلْوَھَنُ**" کی بیماری کی بنیاد پر ہے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

رخصت اور حفاظتی تدبیر کی حقیقت

اسلامی شریعت، اللہ سبحان و تعالٰی کا انسانیت پر ہدایت کی نعمت عظمٰی کے بعد، سب سے بڑا احسان عظیم ہے کیونکہ یہ انسان کی ان تمام انفرادی؛ باہمی اور اجتماعی ضروریات زندگی کی ضامن ہے، جن کے ادراک اور باہمی ربط سے انسان اپنی عقل اور صدیوں پر محیط دستاویزی اور غیر دستاویزی تجربات کے بعد بھی احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

اسلامی شریعت انسان کی چھ بنیادی ضروریات کی ضامن ہے اور انہی کو مقاصد شریعت بھی کہا جاتا ہے، جن میں سر فہرست دین کی حفاظت ہے اور دین کے بعد ہی انسانی جان؛ اس کے مال؛ اس کی عقل؛ اس کی عزت اور اس کی نسل کی حفاظت مطلوب ہے۔

حفاظتی تدابیر کا تعلق تمام مقاصد شریعت سے ہے؛ اور یہ ان ظاہری اسباب کا نام ہے، جن کے اختیار نہ کرنے سے ایک مسلمان کے دین؛ جان؛ مال؛ عقل؛ عزت یا نسل کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور جس کے نتیجہ میں اس کا ایمان اپنے دین کے مسلمہ عقائد کی طرف سے شک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

دینی امور میں حفاظتی تدبیر، رخصت کہلاتی ہے اور چونکہ اسلامی شریعت میں دینی امور کا تعلق براہ راست اللہ سبحان و تعالٰی سے ہونے کے باعث، ہر وہ عمل ممنوع اور بدعت ہے جس کی بنیاد قرآن اور حدیث سے ثابت نہ ہو، اسی لیے رخصت کا بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہونا لازم ہے۔ دین میں ان رخصتوں کی حیثیت مطلوب؛ مستحب اور مباح کی سی ہے۔ مثلاً سفر کی حالت میں نماز میں قصر کی رخصت مطلوب ہے، مگر اسی حالت میں روزہ کی رخصت کبھی مطلوب اور کبھی مستحب ہے، جبکہ بارش میں باجماعت کی نماز کی ادائیگی سے رخصت کی حیثیت مباح کی سی ہے۔ رخصتوں کا تعلق صرف انسان کے دین سے نہیں ہے، بلکہ اس کا

دائرہ اختیار انسان کی جان؛ مال؛ عقل؛ عزت اور نسل کے صورت میں ان تمام امور سے ہے جن پر شریعت کے واضع احکام موجود ہیں۔

دیگر دنیاوی امور جن پر شریعت کے واضع احکام موجود نہیں ہیں، ان میں حفاظتی تدابیر کی بنیادی حیثیت مباح اعمال کی سے ہے کیونکہ دنیاوی امور میں شریعت کے مطابق ہر عمل جائز ہے جب تک قرآن اور حدیث سے اس کا ممنوع ہونا ثابت نہ ہو۔ مگر جیسے ہر مباح عمل اپنے حالات یا نیت کے باعث مطلوب، مستحب، مباح، مکروہ یا حرام قرار پا سکتا ہے، اس طرح دنیاوی امور میں اختیار کردہ حفاظتی تدابیر اپنے حالات یا نیت کے باعث مطلوب، مستحب، مباح، مکروہ یا حرام ہو سکتی ہے۔ مثلاً کھانا کھانا ایک مباح عمل ہے؛ مگر اپنی جان کے تحفظ کے لیے کھانا مطلوب؛ نیک اعمال کی ادائیگی کی نیت سے کھانا مستحب؛ اپنی بھوک مٹانے کی نیت سے مباح اور گناہوں کی لذت سے لطف اندوز ہونے کی نیت سے کھانا مکروہ یا حرام کے درجہ میں ہے۔

رخصت اور حفاظتی تدبیر اپنے میدان عمل میں فرق کے باعث، اکثر اوقات میں ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہیں۔ یعنی ایک عمل، جو حفاظتی تدبیر کے طور پر دنیاوی امور میں مکروہ یا حرام کی حیثیت رکھتا ہو وہی عمل ایک رخصت کی حیثیت سے مباح، مستحب یا مطلوب کا درجہ رکھتا ہو یا رخصت کے بجائے عین مطلوب ہو۔ اس کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل خطرات اور ان کے نتیجہ میں پہنچے والے نقصانات کے درجات کا ادراک لازمی ہے؛

- درپیش خطرہ "حقیقی"
- اس کا وجوب "یقینی"
- اس کے نتیجہ میں پہنچنے والا نقصان "یقینی"

جب کوئی درپیش خطرہ حقیقی نوعیت کا ہو اور اس کا وجوب یقینی ہو اور اس کے وجوب کے میں نتیجہ میں جان؛ مال؛ عقل؛ عزت اور نسل کو پہنچنے والا نقصان بھی یقینی ہو، تو حفاظتی تدبیر مطلوب کے درجہ میں ہے اور استطاعت کے باوجود اختیار نہ کرنے والا گناہ کا حامل ہو گا؛ مثلاً؛ سڑک پر گاڑی کو سامنے سے آتے ہوئے دیکھنے کے باوجود اس کے راستہ سے نہ ہٹ جانا خودکشی کے زمرہ میں آتا ہے۔

مگر دین کی سربلندی اور حفاظت کے لیے، درپیش خطرہ چاہے حقیقی ہو اور اس کا وجوب بھی یقینی اور اس کے نتیجہ میں پہنچنے والے نقصان بھی یقینی، ایسی صورت میں کسی رخصت پر عمل پیرا نہ ہونا نہ صرف مطلوب ہے بلکہ افضل ہے۔ مثلاً؛ سورۃ البروج میں اصحاب الاخدود کا واقعہ؛ احادیث میں یقینی نقصان کے اندیشے کے باوجود جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کی ادائیگی کو افضل جہاد قرار دینا؛ جبکہ وجوب حقیقی کی صورت میں رخصت پر عمل پیرا ہونا محض مباح ہے جیسے سورۃ النحل کی آیت نمبر ۱۰۶ میں قلبی ایمان کی موجودگی میں زبان سے کلمہ کفر کی ادائیگی کی رخصت۔ مگر کسی شرعی رخصت کے بغیر دین میں کسی بھی قسم کی نفی؛ اخفاء یا کمی کی ہر صورت ناجائز اور ممنوع ہے۔

اسی طرح شریعت نے گو دنیاوی امور میں مال کو اسراف یا ابذار کے ذریعے ضائع کرنے کی سختی سے ممانعت فرمائی ہے، مگر دین کو درپیش کسی حقیقی خطرہ کے سدباب کے لیے، اگر ایمان متحمل ہو سکے، تو رخصت کے طور پر نصف یا پورے مال کا استعمال نہ صرف مباح بلکہ مستحب ہے۔

- درپیش خطرہ "حقیقی"
- اس کا وجوب "یقینی"
- اس کے نتیجہ میں پہنچنے والا نقصان "غیر یقینی"

جب کوئی درپیش خطرہ حقیقی نوعیت کا ہو اور اس کا وجوب بھی یقینی ہو مگر اس کے نتیجہ میں جان؛ مال؛ عقل؛ عزت اور نسل کو پہنچنے والا نقصان غیر یقینی ہو، تو حفاظتی تدبیر مستحب کے درجہ میں ہے اور استطاعت کے باوجود اختیار نہ کرنے والا پر کوئی گناہ نہیں بلکہ اکثریتی حالات میں، حفاظتی تدبیر اختیار نہ کرنا، ایمان میں اضافہ کا باعث ہے؛ مثلاً؛ میدان جنگ ایک حقیقی خطرہ ہے اور ہر شریک جنگ پر اس کا وجوب بھی یقینی ہے مگر ہر شریک جنگ کا نقصان غیر یقینی ہے؛ ایسی صورت میں زرہ یا خود جیسے حفاظتی لباس کا استعمال سنت ہونے کے باعث مستحب ہے مگر لازم نہیں۔ اسی طرح اونٹ کو باندھ کر اللہ پر توکل کرنے کی حدیث میں، حقیقی دنیاوی امور اور جن کا وجوب بھی یقینی ہو، اپنی جان، مال، عقل، عزت اور نسل کو غیر یقینی نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے استطاعت بھر حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی سنت موجود ہے۔

- در پیش خطرہ "حقیقی"
- اس کا وجوب "غیر یقینی"
- اس کے نتیجہ میں پہنچنے والا نقصان "غیر یقینی"

جب کوئی در پیش خطرہ تو حقیقی نوعیت کا ہو مگر اس کا وجوب غیر یقینی ہو اور اس کے نتیجہ میں جان؛ مال؛ عقل؛ عزت اور نسل کو پہنچنے والا نقصان بھی غیر یقینی ہو، تو حفاظتی تدبیر مباح کے درجہ میں ہے اور استطاعت کے باوجود اختیار نہ کرنے والا افضل ہے، کیونکہ در حقیقت اس درجہ میں اکثر حفاظتی تدابیر ایمان میں کمی کے باعث اختیار کی جاتیں ہیں اور بیشتر اوقات دین کی نفی، اخفاء یا کمی کا باعث بنتیں ہیں۔

مثلاً؛ بیماری ایک حقیقی خطرہ ہے مگر اس سے ہر ایک کے متاثر ہونے کا خطرہ غیر یقینی ہے اور اس بیماری کے نتیجہ میں جان؛ مال؛ عقل؛ عزت یا نسل کو پہنچنے والا نقصان بھی مبہم ہے۔ عمومی صورت میں نقصان دہ اشیاء سے پرہیز اور صحت مندانہ اصول زندگی اپنانا تو اگرچہ دینی حکم ہے اور متاثر ہونے کی صورت میں استطاعت کے مطابق، بغیر مبالغہ کے، علاج کی سنت بھی موجود ہے؛ مگر حفاظتی تدابیر کے نام پر دینی یا دنیاوی، مطلوب اور مستحب معاملات میں، کسی بھی قسم کا غیر شرعی تغیر، ایمان میں کمی کا مظہر اور دین میں ناجائز اضافہ کے مترادف ہے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً كثیرا كثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

تقلید کی حقیقت

تقلید؛ امت کے ان معرکہ آرا مسائل میں سے ایک ہے جس کے باعث یہ امت [اہل سنت و الجماعہ] خیر القرون کے بعد سے ہی مقلدین اور غیر مقلدین کے گروہوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ آئمہ اکرام [امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ] کی تقلید کی صورت میں رسول ﷺ کی اتباع کی حمایت اور مخالفت کے وزنی دلائل کے باوجود ان دونوں گروہوں میں اس امت کے اکابرین کی موجودگی گو ہم جیسی عوام الناس کے لیے قابل اطمینان تو ہے؛ مگر قرآن و حدیث کے نص قطعی کی بنیاد پر مقلدین و غیر مقلدین عوام و خواص کا مکمل اتفاق ہے کہ قرآن و سنت سے بالا ہو کر صرف کسی عالم کی تقلید جامد قطعی حرام اور کچھ صورتوں میں کفر ہے۔

وہ تقلید جامد جو کفر ہے؛ اس سے مراد ہے کہ انسان باعث جہالت یا حب دنیا کے باعث کسی بھی عالم کی پیروی میں ضروریات دین[2] کو ساقط قرار دے دے یا اس میں تغیر کو جائز سمجھے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے باعث اللہ سبحان و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بنی اسرایل کی عوام کو کافر قرار دے دیا۔

- ✓ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ [سورة التوبة ؛ ٣١] انہوں نے **اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابن مریم** علیہ السلام کو اللہ کے سوا خدا بنالیا حالانکہ اُن کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔

---

[2] ضروریات دین سے مراد وہ تمام امور دین ہیں جن کا دین رسول ﷺ سے ہونا قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہے اور حد تواتر و شہرت عام تک پہنچ چکا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے "ضروریات دین کی حقیقت" کا مطالعہ فرمائیں۔

دین اسلام میں تمام عقائد، عبادات اور معاملات کے علم کے عموماً دو جز ہوتے ہیں؛ ورنہ زیادہ سے زیادہ تین جز ہوسکتے ہیں۔ پہلے جزو کا تعلق ضروریات دین سے ہوتا ہے جو اس دینی و دنیاوی امر کی شرعی حیثیت، خصوصیات، اہمیت اور قطعی حدود و قعود پر محیط ہوتا ہے جبکہ دوسرے اور تیسرے جزو کا تعلق اس دینی و دنیاوی امر کی جزئیات، ترجیحات اور ظنی حدود و قعود پر محیط ہوتا ہے۔ پہلا جزو کا تعلق چونکہ ضروریات دین سے ہے اسی لیے یہ جزو صرف قرآن و حدیث کے متفق الیہ دلائل پر محیط ہے اور دوسرے جز کا دائرہ مختلف فیہ قرآنی آیات اور احادیث رسول ﷺ، اجماع صحابہ ؓ اور آثار صحابہ ؓ کی بنیاد پر مجتہد عالم کی رائے پر محیط ہے جبکہ تیسرا جز دوسرے جز کی غیر موجودگی میں مجتہد عالم کے قیاس عادلہ پر محیط ہے۔

مثلاً فرض نماز؛ اس کی تعداد، اوقات، تعداد رکعات، ارکان، باجماعت نماز میں صف بندی کا تعلق جز اول یعنی ضروریات دین سے ہے جبکہ رفع الیدین، امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ، آمین بالجہر، نماز میں ہاتھ اٹھانے اور باندھنے کے مقام کا تعلق مختلف فیہ ہونے کے باعث اس علم کا تعلق جز دوم سے ہے اور سجدہ سہو کے مقامات اور طریقہ کار کا علم جزو دوم اور جز سوم پر محیط ہے۔

اسی پہلے جزو کے علم کا حصول رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق ہر مرد اور عورت پر فرض ہونے اور دین میں اس جزو کے علم سے اختیاری جہالت کا نواقض اسلام[3] میں سے ہونے کے باعث؛ ہر مسلمان حسب استطاعت دین کے بنیادی اساس یعنی قرآن و حدیث سے رجوع کرنے کا مکلف ہے۔ بعینہ ایک غیر مجتہد عالم پر تینوں جزو کے علم اور ان کی پہچان لازم ہے تاکہ وہ اپنے اقوال اور اعمال میں ظلم [چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹادینا] کا مرتکب ہوتے ہوئے تقلید جامد کا شکار نہ ہو جائے۔ ایک عام مسلمان، غیر مجتہد عالم اور مجتہد عالم میں فرق صرف اس علم کے تینوں اجزا میں قرآن اور حدیث سے استفادہ کرنے کی استطاعت میں ہے نہ کہ مکلف ہونے کی حیثیت میں۔ دینی و دنیاوی مسائل میں شرعی احکام کے حصول کا مطلوب طریق کار کل امت کے لیے ایک ہی ہے؛

- ✓ حضرت معاذ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو پوچھا کہ "تم کس طرح فیصلے کرو گے۔" انہوں نے عرض کیا "**اللہ کی کتاب** قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کروں گا"

[3] نواقض اسلام سے مراد وہ امور ہیں جو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے "نواقض اسلام کی حقیقت" کا مطالعہ فرمائیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا"اگر وہ اللہ کی کتاب میں نہ ہو" انہوں نے عرض کیا"**رسول اللہ ﷺ کی سنت** کے مطابق فیصلہ کروں گا۔" آپ ﷺ نے فرمایا"اگر سنت میں بھی نہ ہو" عرض کیا" اپنی رائے سے **اجتہاد** کروں گا۔" آپ ﷺ نے فرمایا تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے رسول ﷺ کے قاصد کو یہ توفیق بخشی۔ [جامع ترمذی ۔ جلد اول ۔ فیصلوں کا بیان ۔ حدیث ۱۳۵۱]

مندرجہ بالا حدیث کے مطابق ہر مسلمان مکلف ہے کہ دینی و دنیاوی احکام میں ضروریات دین کے جزو کے علم کے حصول کے لیے سب سے پہلے قرآن سے رجوع کرے پھر احادیث رسول ﷺ سے اور اگر اس پر پھر بھی مخفی رہے تو ایک عامی کسی عالم سے رجوع کرے؛ جو اس پہلے جزو کے علم کو صرف قرآن اور حدیث کے قطعی دلائل میں ہی سے بیان کرے، بر خلاف دوسرے جز کے علم کے جس میں ایک غیر مجتہد عالم اگر اپنے مکتب فکر کے دلائل کی بنیاد سے آگاہ ہے تو اس فتوی کو رسول اللہ ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کرتے ہوئے بیان کر سکتا ہے ورنہ دلائل سے لاعلمی کی بنیاد پر اپنے فتوی کو محض اپنے مکتب فکر سے منسوب کرتے ہوئے اپنے سمیت سائل پر تحقیق کا دروازہ کھلا رکھے اور تیسرے جز کی بنیاد پر فتوی کی نسبت تو قطعی طور اللہ یا اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جائز نہیں ہے اور ایک مجتہد عالم کے لیے اس تیسرے جز میں کسی اور عالم کے قیاس عادلہ سے استفادہ کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

علم کے اسی دوسرے اور تیسرے جز میں جہالت یا ظلم کے باعث رسول اللہ ﷺ سے فتاوی کی غلط نسبت ہی اس تقلید جامد کو جنم دیتی ہے جو مندرجہ ذیل حدیث کے باعث حرام ہے۔

- ✓ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا"جو کوئی **میری نسبت** وہ بات بیان کرے جو میں نے نہیں کہی، تو اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تلاش کرے"۔ [صحیح بخاری۔ جلد اول۔ علم کا بیان۔ حدیث ۱۱۲]

اس دوسرے اور تیسرے جز میں غیر مقلد بھی اکثریتی معاملات میں مقلد ہی ہوتے ہیں۔ اور اگر ہر مسلمان عوام وخواص؛ جہالت اور ظلم [چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دینا] سے بچتے ہوئے اور دین میں مقرر کردہ تکلیف کی ادائیگی کے بعد محض اللہ کی خوشنودی کے حصول کی کوشش میں مندرجہ بالا طریق کار اختیار کرے گا تو

عامی کا بوجھ ایک عالم کی طرف منتقل ہو جائے گا اور ایک غیر مجتہد عالم کا بوجھ مجتہد عالم کی طرف منتقل ہو جائے گا جو اپنی نیک نیتی کے باعث کم از کم ایک اجر کا مستحق رہے گا۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب حاکم کسی بات کا فیصلہ کرے اور اس میں اجتہاد سے کام لے اور صحیح ہو تو اس کے لئے دو اجر ہیں اور اگر حکم دے اور اس اجتہاد سے کام لے اور غلط ہو تو اس کو ایک ثواب ملے گا۔[صحیح بخاری ۔ جلد سوم ۔ کتاب اور سنت کو مضبوطی سے پکڑنے کا بیان ۔ حدیث ۲۲۵۲]

عوام کی جزاول سے جہالت اور خواص کے علم کے اجزا میں ظلم کے باعث ہی وہ تقلید جامد جنم لیتی ہے جس کے نتیجے میں امت میں فتنے ،فساد اور فرقے جنم لیتے ہیں۔اور اس تقلید جامد کا شکار صرف مقلدین نہیں ہوتے بلکہ یہ بیماری غیر مقلدین میں بھی اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔مثلاً ماضی قریب میں ہی پاکستان کی ایک مشہور غیر مقلد جماعت جن کے منبر جمہوریت کے کفر ہونے پر گواہ تھے ،ان کے اس کفر کو مباح میں تبدیل کرنے کو قولی اور عملی طور پر ماننا یا با مقلدین و غیر مقلدین کا جماعت کی نماز میں صف بندی جیسی ضروریات دین کو ساقط قرار دینے کے فتوی پر عمل کرنا بھی اسی کفریہ تقلید جامد کا نمونہ ہے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی آلہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

محاسبہ کی حقیقت

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "اپنے نفسوں کا **محاسبہ خود کر لو** قبل اس کے تمہارا محاسبہ کیا جائے، اور اس کے وزن سے قبل خود ہی وزن کر لو"۔

سوچنے کا مقام ہے کہ قرآن حکیم، انسانوں کو صرف دو گروہوں میں ہی کیوں تقسیم کرتا ہے، [مومن یا کافر، کامیاب یا ناکام، جنتی یا جہنمی، حزب اللہ یا حزب الشیطان] اور صرف انہی دونوں انتہاؤں کی خصوصیات انتہائی تفصیل کے ساتھ ہی کیوں بیان کرتا ہے۔ آخر صحیحین میں موجود، سکرات الموت کی تفصیلات کا ذکر کرتی ہوئی، ایک طویل حدیث صرف مومن اور کافر کی موت کو کیوں بیان کرتی ہے۔ قرآن میں "اعراف" کا ذکر تو موجود ہے، مگر ان عقائد یا اعمال کا ذکر مفقود ہے، جو کسی بھی فاسق، فاجر اور عملی منافق مسلمان کو کم از کم اس مقام کا ہی مصداق ٹھہرائے۔

آخر مجھ جیسا کلمہ گو مسلمان، دین کے بنیادی مواخذ یعنی قرآن اور سنت سے کیسے نظریاتی اور عملی استفادہ حاصل کرے، جو صرف انہی ہی دو انتہاؤں کو تفصیلاً بیان کرتے ہیں، یا ہم جیسے فاسق، فاجر اور عملی منافقت میں گرفتار مسلمان اسی زعم میں زندگی گزارتے رہیں کہ، وہ تمام اخروی نتائج جن کے مخاطب مومنین ہیں، ہم بھی کلمہ گو ہونے کی حیثیت سے اسی کے مصداق ہیں۔ چاہے قرآن کے واضح اعلان کے مطابق، اس کے احکامات میں تفریق کرنا، اس کے حرام کو حلال یا حلال کو حرام ٹھہرانا، اس کے ٹھہرائے ہوئے کبائر کو جائز قرار دینا وغیرہ، کفار ہی کی نمایاں نظریاتی اور عملی خصوصیات ہوں۔ "**محاسبہ**" انہی دونوں انتہاؤں پر غور و فکر اور اس کے نتیجے میں نظریاتی اور عملی استفادہ کا نام ہے۔ جو شخص اس دنیا میں قرآن اور حدیث میں بیان

کردہ ان دونوں انتہاؤں میں سے جس انتہا کے نظریاتی یا عملی طور پر قریب ہو گا، اخروی نتیجہ میں بھی ان کے حاملین کے انجام کے اتنا ہی قریب ہو گا۔

قرآن حکیم کے نزول کا بنیادی مقصد ہی ان صفات کا بیان ہے، جو انسانوں کے ان دو گروہوں میں حد فاصل ہیں اور انہی صفات کی بنیاد پر ان کے دنیاوی اور اخروی نتائج کا بیان۔ اور قرآن سے اس ہدایت کا براہ راست حصول محض علماء کے لیے مختص نہیں ہے، بلکہ ہر اس شخص کے لیے ممکن ہے جس کے پاس دیکھنے والی آنکھ، سننے والا کان اور سوچنے سمجھنے والا دل ہے ،کیونکہ اللہ تعالٰی نے **سورۃ النحل** میں فرمایا"اور خدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور اس نے تم کو **کان** اور **آنکھیں** اور **دل** بخشے تاکہ تم شکر کرو۔"اور اسی لیے اللہ تعالٰی **سورۃ القمر** میں فرماتا ہے "اور ہم نے قرآن کو **سمجھنے کے لئے آسان** کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟"۔

قرآن حکیم، تین نوعیت کے علوم پر مشتمل ہے؛(عقائد؛اعمال اور اخبار یعنی امثال؛قصص؛انذار اور بشارتیں) اور قرآن کی ہر آیت محاسبہ کی بنیاد بن سکتی ہے، مگر فقط بات سمجھانے کی نیت سے دو دو آیات پر مشتمل دو مجموعہ پیش خدمت ہیں، جن میں سے ہر مجموعہ کی پہلی آیت میں ایک گروہ کی منفی یا مثبت صفات کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں ان صفات کے حامل گروہ کے اخروی نتیجہ کا ذکر ہے۔ اب محاسبہ کرنے والا اپنا احتساب خود کرے کہ اس کا نفس کس گروہ کی صفات سے کتنی مناسبت رکھتا ہے، جو جتنا اس دنیا میں پہلی آیت میں موجود صفات کا حامل ہو گا، اتنا ہی دوسری آیت میں موجود اخروی نتیجہ کا حقدار۔

مجموعہ اول [سورۃ التوبۃ؛٦٧۔٦٨]

[**صفات**] منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس [یعنی ایک طرح کے] ہیں کہ، **برے کام کرنے کو کہتے اور نیک کاموں سے منع کرتے اور [خرچ کرنے سے] ہاتھ بند کئے رہتے ہیں۔ انہوں نے خدا کو بھلا دیا** تو خدا نے ان کو بھلا دیا۔ بے شک منافق نافرمان ہیں۔

[اخروی انجام] اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے **آتش جہنم کا وعدہ کیا ہے** جس میں ہمیشہ [جلتے] رہیں گے۔ وہی ان کے لائق ہے۔ اور خدا نے **ان پر لعنت کر دی** ہے۔ اور ان کے لیے **ہمیشہ کا عذاب [تیار] ہے**۔

ذاتی محاسبہ؛ کتنی ہی بار میں نے اہل و عیال اور دوست و احباب کو وہ دعوتیں دیں یا وہ رکاوٹیں پیدا کیں جن کا نتیجہ اللہ کی چھوٹی یا بڑی نافرمانی پر اختتام ہوتا تھا؛[مثلاً فلم یا ڈرامے دیکھنے؛ گانا سننے وغیرہ کی دعوت یا داڑھی رکھنے؛ اسبال ازار وغیرہ میں مذاق یا ناپسندیدگی کے ذریعے رکاوٹ ڈالنا]۔ میرے ان اعمال کی منافقین کی صفات سے کتنی مشابہت اور قربت ہے؛ کہیں یہی دنیاوی قربت، آخرت میں میری ان بدنصیبوں کے ساتھ، رفاقت کا باعث تو نہیں بن جائے گی؟

مجموعہ دوم [سورۃ التوبۃ: ۷۱۔۷۲]

[صفات] اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ **اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں**۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا رحم کرے گا۔ بے شک خدا غالب حکمت والا ہے۔

[اخروی انجام] خدا نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے **بہشتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں [وہ] ان میں ہمیشہ رہیں گے اور بہشت ہائے جاودانی میں نفیس مکانات کا [وعدہ کیا ہے] اور خدا کی رضامندی** تو سب سے بڑھ کر نعمت ہے یہی بڑی کامیابی ہے۔

ذاتی محاسبہ؛ میرے نفس کے لیے اس معاشرہ میں دین کی ادائیگی بھاری کیوں ہے؛ داڑھی رکھنے یا اسبال ازار وغیرہ میں مجھے کیوں عار محسوس ہوتا ہے؛ میں کیوں نجی محفلوں میں بھی دین کی بنیادی باتوں کی تبلیغ میں شرم محسوس کرتا ہوں یا اپنے سامنے دین کے شعائر کا مذاق اڑتے دیکھ کر بھی، اس سے لوگوں کو منع کرنے کی ہمت نہیں پاتا۔ مومنین کی ان صفات سے میری دوری کی کیا وجہ ہے؛ میرے ایمان میں کمزوری کا باعث میری کونسی نفسانی خواہشات ہیں؛ اور مومنین سے یہی دنیاوی دوری، کہیں میرے لیے آخرت میں اللہ تعالٰی کے وعدوں سے دوری کا سبب تو نہیں بن جائے گی؟

"محاسبہ" اس سوچ یا احساس کو پیدا کرنے کا ضامن ہے جو کسی بھی نظریاتی یا عملی تبدیلی کی بنیاد ثابت ہو سکے۔ محاسبہ کی عادت کو پختہ کرنے کے لیے لازم ہے کہ روزانہ قرآن حکیم کی دو یا چار آیات کا ترجمہ کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور ان میں بیان کردہ عقائد؛ اعمال یا اخبار پر مشتمل مثبت یا منفی صفات پر خلوص نیت کے ساتھ غور کیا جائے کہ میرے نفس کی مثبت صفات سے کتنی دوری اور منفی صفات سے کتنی قربت ہے۔

قرآن میں انسان کی کامیابی کے چار درجات کا بیان ہے؛ جن میں سے دو کا تعلق انسانی کوشش سے ہے اور یہی دونوں محاسبہ کا حاصل ہیں اور باقی دو کا تعلق ان کوششوں کا اللہ تعالٰی کے دربار میں قبولیت سے ہے۔

- پہلا درجہ **انابت الی اللہ** یعنی اللہ کی طرف اخلاص نیت سے رجوع کرنا؛
- دوسرا درجہ اسی انابت الی اللہ کی قبولیت کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے **ہدایت** کا حصول ہے؛
- تیسرا درجہ اس ہدایت کے حصول کے بعد انسان کا اس ہدایت پر **استقامت** کی کوشش سے ہے؛
- اور چوتھا درجہ اس استقامت کی قبولیت کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے **ربط قلوب** یعنی فتنوں میں شرح صدر کا نصیب ہونا۔

انابت الی اللہ کے نقطہ نظر سے، تمام انسانیت مندرجہ ذیل دو انتہاؤں کے بیچ میں ہے؛

نچلی ترین انتہا

- ✓ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَى فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا [سورة الکہف؛۵۷] "اور اس سے ظالم کون **جس کو اس کے پروردگار کے کلام سے سمجھایا گیا تو اس نے اس سے منہ پھیر لیا**۔ اور جو اعمال وہ آگے کر چکا اس کو بھول گیا۔ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔ اور کانوں میں ثقل [پیدا کر دیا ہے کہ سن نہ سکیں] اور **اگر تم ان کو رستے کی طرف بلاؤ تو کبھی رستے پر نہ آئیں گے**"۔

بلند ترین انتہا

✓ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ [سورۃ آل عمران؛۵۳]"اے پروردگار جو [کتاب] تو نے نازل فرمائی ہے ہم اس پر **ایمان لے آئے** اور [**تیرے**] **پیغمبر کے متبع ہو چکے** تو ہم کو ماننے والوں میں لکھ رکھ"۔

اکثر بد نصیب ایسے ہیں جو "**اس کو**" ہی نہیں مانتے؛

اور اکثر ایسے ہیں جو "**اس کی**" نہیں مانتے،

اور بہت قلیل وہ خوش نصیب جو نا صرف "**اس کو ہی**" مانتے ہیں

بلکہ "**صرف اس کی ہی**" مانتے ہیں۔

یہ تو ہمیں اپنے انفرادی شخصی محاسبہ سے ہی اندازہ ہو گا کہ ہمارا مزاج کس گروہ انسانی سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے کہ کیا اللہ کو ماننے کے باوجود ہمارے دل دین کی بات سمجھ سکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ کیا دین کی باتیں [خصوصاً قرآن حکیم] ہمارے کانوں پر بوجھ تو نہیں ہے؟ اور کیا دینداری کا راستہ ہماری آنکھوں کو بھاتا ہے یا نہیں؟۔ ہدایت فقط دینی علوم کے حصول کا نام نہیں بلکہ ہدایت وہ عملی علم ہے جس پر استقامت ہی مزید ہدایت کی بنیاد ہے۔

✓ وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۔۔۔۔۔ [سورۃ مریم؛۷۶]"اور جو لوگ ہدایت یاب ہیں خدا ان کو **زیادہ ہدایت دیتا ہے**۔۔۔۔"

اور محاسبہ اسی انابت الی اللہ اور استقامت کی صورت میں مزید ہدایت کے حصول کا واحد ذریعہ ہے؛

✓ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ [سورۃ العنکبوت؛ ۶۹]"اور جن لوگوں نے **ہمارے لئے کوشش کی** ہم ان کو ضرور اپنے رستے دکھادیں گے۔ اور خدا تو نیکو کاروں کے ساتھ ہے"۔

اور یاد رہے، کہ دین ہماری پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا نام نہیں ہے؛ محاسبہ کے نتیجہ میں، حق واضح ہونے کے باوجود، اختیاری طور پر اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔

✓ ــــــ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ [سورة البقرة ؛ ۸۵]"ــــــ[یہ] کیا [بات ہے کہ] تم کتابِ [خدا] کے **بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کئے دیتے ہو**، تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں اور جو کام تم کرتے ہو، خدا ان سے غافل نہیں"۔

محاسبہ کی حقیقی افادیت کے حصول کے لیے لازم ہے کہ، قرآن اور حدیث میں موجود اللہ سبحان وتعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور مغفرت کی بشارتوں کے مطالعہ کے وقت، ہمارے ذہنوں میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان کردہ زریں اصول موجود رہے؛ جس کے مطابق محض دو اشخاص کو ان بشارتوں سے مستفید ہونے کی اجازت ہے؛

- اول وہ شخص جو کثرت گناہوں سے مکمل طور پر مغلوب ہو جانے کے باعث اپنی مغفرت سے مایوس ہو۔
- دوم وہ شخص جو کثرت عبادات سے مکمل طور پر مغلوب ہو جانے کے باعث اپنی جان ہلاکت میں ڈال رہا ہو۔

ان دو کے علاوہ کسی شخص کے لیے جائز نہیں کے وہ ان بشارتوں کے بنیاد پر اپنی گناہوں والی زندگی کو جواز مہیا کرے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

اولاد [صدقہ جاریہ] کی حقیقت

آج بھی ایک شریف النفس انسان کی سب سے بڑی متاع اس کی اولاد ہے؛ جس کی پروش اور تربیت پر وہ اپنی پوری زندگی صرف کر دیتا ہے۔ اور یہی اس کے حق میں بہتر بھی ہے کیونکہ ایک نہ ایک دن وہ ان کی شفقت اور توجہ کا طلب گار ہو گا۔ مگر سوچنے کا مقام یہ ہے کہ آخر اس اولاد کی شفقت اور توجہ کی طلب مجھے کب ہے؟ کیا اس دنیا میں؟ تاکہ میرا بڑھاپا "اولڈ ایج ہاوس" میں بسر ہونے سے بچ سکے اور کم از کم دنیا والوں کی نظر میں "میں سکون سے اپنوں "میں مر سکوں یا۔۔۔۔

آخر قرآن "ازواج اور اولاد" کو انسان کا "دشمن" کیوں قرار دیتا ہے؟ اور آخر حدیث رسول ﷺ "**صدقہ جاریہ**" میں صرف صالح اولاد کو کیوں ہی شامل کرتی ہے؛ کیا جزوی صالح اولاد بھی اس حدیث کا مصداق ہے؟ یا بری اولاد کبھی کوئی نیک کام نہیں کرتی؟

آئیں مل کر سوچتے ہیں؛ میں بھی سوچتا ہوں اور آپ سب بھی سوچیں؟؟؟؟؟؟؟؟

ایک مختلف تناظر۔۔۔۔

میرے نزدیک پچھلے اٹھائے گئے سوالات کے صحیح جواب کے لیے ضروری ہے کہ ان سوالات کو ایک مختلف تناظر میں دیکھا جائے۔ چنانچہ اس بار اپنی اولاد کی دینی یا دنیاوی کوتاہیوں پر غور کرنے اور ہمارے لیے ان کے دلوں میں موجود محبت اور شفقت کے پیمانوں کو جانچنے کے بجائے، آج ہم خود کو، ان کی جگہ رکھ کر دیکھتے ہیں کہ کیا کہیں، ہم خود بحیثیت اولاد، اپنے والدین کے دشمن تو نہیں ہیں؟ اور کیا ہم ان کے لیے صدقہ جاریہ ہیں یا نہیں؟ اور آخر ہمارے والدین ہماری محبت اور شفقت میں کتنے حصہ دار ہیں؟

یقین رکھیں، کہ جتنی نیک نیتی سے ہم یہ تنقیہ نفس کریں گے، اتنے ہی فائدہ کی امید ہم اپنی اولاد سے کر سکیں گے، یا زیادہ موزوں یوں ہے، کہ اتنے ہی نقصان کی ان سے امید کر سکیں گے۔۔۔۔

والدین اور اولاد کے طبقات

ہر مسلمان گھرانہ کے والدین کو تین طرح کے طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؛

أ. کلی طور پر نیکی کا حکم اور برائی سے روکنے والے والدین۔

ب. جزوی طور پر نیکی کا حکم اور برائی سے روکنے والے والدین۔

ت. خواہشات نفسانی کو فرائض عبدیت پر فوقیت دینے والے والدین۔

اور اسی طرح اولاد کے بھی تین طبقات وجود میں آتے ہیں؛

أ. صالح اولاد۔

ب. جزوی صالح اولاد۔

ت. خواہشات نفسانی کو فرائض عبدیت پر فوقیت دینے والی اولاد۔

یاد رہے کہ، والدین کے طبقات کا، اولاد کے طبقات کے ساتھ کوئی لازمی ربط نہیں ہے اور نہ ہی اولاد کے طبقات کا، والدین کے طبقات کے ساتھ کوئی خصوصی تعلق؛ آخر حضرت نوح علیہ السلام کے گھر میں بھی کافر اولاد تھی اور اسی طرح آزر کے گھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ میرے ذاتی تجزیہ کے مطابق، ہماری عوام کی اکثریت [بشمول میرا] کا تعلق طبقہ دوم کے والدین اور طبقہ دوم کی اولاد سے ہونے کے باعث، میرا البقیہ مضمون صرف اسی مجموعہ افراد کو مخاطب کر رہا ہے۔

والدین کا طبقہ دوم

یہ وہ والدین ہیں جو اپنی ذاتی زندگی میں دین کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوئے، اس پر جزوی طور پر عمل پیرا بھی ہیں اور جزوی طور پر اس کا احساس اپنی اولاد میں وقتاً فوقتاً اجاگر بھی کرتے رہتے ہیں اور اپنی اولاد کو کسی بھی نیک عمل کا حکم یا کسی برے فعل سے روکنے سے، ان کا مقصد فقط ان کے دین کا تحفظ ہوتا ہے۔

یہ اپنی اولاد کے دنیاوی مستقبل کے بارے میں بھی اتنے ہی فکرمند ہیں، جتنا ان کے دینی مستقبل کے بارے میں۔ مگر دین کے معاملے میں ان کا رویہ انتخابی [selective] نوعیت کے ہونے کے باعث، وہ اپنی اولاد

کو نیکیوں کی تلقین اور گناہوں سے اجتناب کی تاکید بھی اسی انتخاب کردہ دین، یعنی [selection] کے تابع رکھ کر کرتے ہیں۔

اولاد کا طبقہ دوم

جزوی صالح اولاد [یعنی میں] کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دین میں اپنے سے نیچے والوں کو دیکھ کر، اپنی دینی زندگی پر مطمئن رہتا ہے۔ اور دنیا میں کامیابی کا حصول ہی اس کا بنیادی نصب العین ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر اس نیکی پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے، جو اس کے بنیادی نصب العین کے حصول میں رکاوٹ نہ بنتی ہو. مثلاً انفرادی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ۔ اور اسی طرح اس کے نزدیک ہر اس برائی پر عمل کرنا بھی آسان ہوتا ہے، جو اس کے بنیادی نصب العین کے حصول کو آسان بناتی ہو. مثلاً سودی لین دین، کفار کی اطاعت کرنا، حرام کاروبار یا آمدنی کے ذرائع اپنانا وغیرہ۔

مزید وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی نیکی اور برائی کے متعلق انتخابی [selective] نقطہ نظر رکھتا ہے۔

طبقہ دوم کے والدین کی طبقہ دوم کی اولاد

یہ وہ مجموعہ افراد ہے جس سے میرا اور میرے والدین کا تعلق ہے اور اپنے نتائج کی سنگینی کے اعتبار سے طبقہ سوم کے والدین اور اولاد کے مجموعے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ طبقہ اپنی نفسانی خواہشات کو بغیر کسی شرعی عذر کے اللہ کے احکامات پر ترجیح دیتا ہے، تو میں بھی نیت کے اعتبار سے انہی کے ساتھ ہوں۔ کیونکہ جہاں بھی میرا کوئی دنیاوی مفاد کسی دینی ضرورت سے ٹکراتا ہے، تو میں یا تو اپنی [اختیاری] لاعلمی کو ہی اپنا شرعی عذر بنالیتا ہوں یا [بے دلیل اور نفس پرستانہ] تاویل بھی میرے لیے قابل قبول ہو جاتی ہے یا [خود فریبی کی بنیاد پر] ہر حال میں اپنی بخشش کے متعلق سب سے خطرناک تاویل "یعنی اللہ تعالٰی غفور و رحیم ہے"، میرے لیے اس دنیاوی مفاد کے حصول کو آسان کر دیتا ہے۔

مزید براں، اگر میرے والدین کے انتخابی [selective] اسلام کی گھریلو تبلیغ، میرے زمانہ کی ضروریات کے مطابق نہیں ہوتی تو میں انہی کے انتخاب [selection] کے اصول کو اپناتے ہوئے، پہلے سے ہی منتخب شدہ [selected] اسلام میں مزید انتخاب [selection] کے دروازے کھول لیتا ہوں، اس بات سے

بے پرواہ ہو کر کہ ہر گزرتی نسل کے ساتھ اس انتخاب [selection] کے نتیجہ میں دین میں کمی ہی واقع ہوتی ہے اضافہ نہیں۔۔۔۔۔۔

کیا میں واقعی اپنے والدین کا دشمن ہوں؟

یہ دشمنی جو انتہائی پوشیدہ ہے اور اس کا ظہور صرف قیامت والے دن اس بوجھ کی صورت میں ہو گا، جس دن ہر شخص اپنے اعمال سوء کی بد بختی کو تقسیم کرنے کے لیے کسی مہربان کی تلاش میں مارا مارا پھر تا ہو گا۔ میرے ناقص علم کے مطابق، اس دشمنی کی مندرجہ ذیل جہتیں ہیں؛

اَ. ہر وہ عمل جو میں نے اپنے والدین کے سامنے کیا، جس کا دین میں گناہ ہونا ثابت تھا، مگر میرے والدین نے مجھے اس سے نہیں روکا، تو یہی ہماری دشمنی کی بنیاد ہے۔

ب. ہر وہ عمل جو انہوں نے میرے سامنے کیا، جو دین میں گناہ شمار ہوتا تھا اور آج اسی بنیاد پر وہ عمل میری زندگی میں بھی شامل ہے، تو میں اپنے والدین کا دشمن ہوں۔

ت. ہر وہ عمل جو فرض یا واجب کے درجہ میں تھا، مگر میرے والدین نے کبھی اس کی ادائیگی کے لیے مجھے استطاعت برابر مجبور نہیں کیا، تو میں اپنے والدین کا دشمن ہوں۔

ث. میری ہر وہ خواہش، جس کی تکمیل میں میرے والدین نے اللہ کے ذکر سے کوتاہی کی، تو میں اپنے والدین کا دشمن ہوں۔

ج. اور آخر میں، اگر مندرجہ بالا دشمنی کے باوجود میرے والدین کی محبت اور شفقت میرے لیے برقرار رہی اور انہوں نے میرے گناہوں سے برأت کا اظہار نہیں کیا، تو پھر میں اپنے والدین کا دشمن ہوں۔

اور یہ دشمنی نسل در نسل چلنے والی دشمنی ہے اور اس کا بوجھ ہر نسل کو اپنے مقدور بھر اٹھانا پڑے گا، یہاں تک کہ کوئی اپنے عمل کی تبدیلی سے اس دشمنی کو صدقہ جاریہ میں بدل دینے پر تیار ہو جائے۔

میں اپنے والدین کے لیے صدقہ جاریہ بنناچاہتاہوں۔۔۔۔

الحمدللہ، ثم الحمدللہ، کہ ہم ابھی زندہ ہیں اور اللہ کی رحمت اور بخشش کے حصول کے راستے کھلے ہیں، فقط ہمیں اپنی فکر اور اس کے تابع اعمال کی درستگی کی فکر کرنی چاہیے۔

والدین کے حوالے سے ہر کوئی مندرجہ ذیل تین صورتوں کا شکار ہے۔

أ. دونوں والدین حیات۔

ب. کوئی ایک اللہ تعالیٰ کی جوار رحمت میں۔

ت. دونوں اللہ تعالیٰ کی جوار رحمت میں۔

تینوں صورتوں میں ہمارے کم از کم کرنے والے کام یہ ہیں؛

أ. اللہ سے سچے دل سے اپنے تمام گناہوں سے عمومی توبہ اور اپنے والدین کے لیے سچے دل سے عمومی استغفار۔

ب. ان تمام گناہوں سے عملی توبہ جن کی کڑیاں والدین کے اعمال سے جڑتی ہیں اور اگر والدین حیات ہیں تو ان کو تبلیغ کی کوشش۔

ت. ان تمام فرائض اور واجبات کی ادائیگی کی کوشش جو والدین کی نرمی کے باعث ہم پر واجب الادا ہیں۔

ث. اپنے والدین کے لیے صدقہ و خیرات اور کم از کم روزانہ دو رکعت نماز، ان کی اس اللہ کے ذکر میں کوتاہی کے پیش نظر جو انہوں نے ہماری ہی خواہشات کے حصول میں کی، خصوصاً اگر والدین حیات نہیں ہیں۔

ج. ان تمام نیکیوں پر استقامت کی کوشش جن کی کڑیاں والدین کی نصیحت سے ملتی ہیں، تاکہ وہ ہماری ان نیکیوں میں ہمارے شریک بن سکیں۔

اولاد[صدقہ جاریہ] کی حقیقت کا خلاصہ

مختصراً، جو ہمارا رویہ ہمارے والدین کے ساتھ ہو گا کم و بیش اسی قسم کے رویہ کی ہمیں اپنی اولاد سے بھی امید ہونی چاہیے. کیونکہ یہ دنیا اور آخرت دونوں ہی مکافات عمل کے اصول کے تابع ہیں۔ خوش نصیب وہ ہیں جو معاملہ کی سنگینی کا بر وقت احساس کر کے اس کے تدارک کی کوشش میں مصروف ہو جائیں۔

سب سے اہم ترین کام، جو اس ضمن میں ہم سب پر لازم ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اس انتخاب[selection] والے اسلام کی روایت کو توڑنے کی کوشش کریں۔ جو حرام ہے، اس کو اپنی اولاد کے سامنے حلال بنا کر پیش نہ کریں؛ جو کفر ہے، اس کو اسلام بنا کر نہ پیش کریں۔ ہم بھی اس عمل کو گناہ اور کفر کے احساس کے ساتھ اپنائیں اور اپنی اولاد کو بھی ان اعمال کو گناہ اور کفر کے طور پر اپنانے دیں، نہ کہ دین میں جائز یا رخصت کے طور پر[مثلاً میوزک، نامحرم کے ساتھ تعلقات، سودی لین دین یا سودی اداروں میں کام کرنا، کفار کے ساتھ تعلقات، جنس مخالف کے اطوار اختیار کرنا، غیر ملکی شہریت اختیار کرنا، وغیرہ]، کہ شاید یہ گناہ اور کفر کا احساس ہی زندگی کے کسی موڑ پر، ہماری یا ان کی انفرادی توبہ کا باعث بن سکے۔

[عموماً ہم سب کے لیے اور] خصوصاً میرے وہ بھائی اور بہنیں، جو کفار کے ممالک میں رہائش پذیر ہیں، ان کے لیے تو انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی زندگیوں میں شامل گناہوں اور کفریہ افکار و اعمال سے ان کو آگاہ بھی کرتے جائیں اور ان سے برأت کا اظہار بھی، ورنہ یہ دین میں انتخاب[selection] کا سلسلہ اگر کسی دن ان کی نسل میں سے کسی کے ایمان کو صلب کرنے کا باعث بن گیا، تو وہ اپنی اولاد کی **اس دشمنی کا بوجھ کیسے اٹھائیں گے**۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہ و صحبہ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

عقیدہ توحید کی حقیقت

کیا کلمہ توحید "لا الہ الا اللہ" کی زبان سے ادائیگی ہی نجات کے لیے کافی ہے؟

ایک طویل حدیث سے اقتباس۔۔۔۔۔

- "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان، کیا واقعی آپ ﷺ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنی جوتیاں دے کر اس لئے بھیجا تھا کہ جو آدمی **صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ "لا الہ الا اللہ" کہتا ہوا ملے اس کو یہ جنت کی خوشخبری دے دیں؟** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں! عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ایسا نہ کیجئے، مجھے ڈر ہے کہ **لوگ کہیں اسی خوشخبری پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں**[اور عمل کرنا ہی چھوڑ دیں] اس لئے آپ ﷺ انہیں [زیادہ سے زیادہ] عمل میں لگا رہنے دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا [اگر تمہارا یہی مشورہ ہے] تو پھر لوگوں کو عمل میں لگا رہنے دو۔ [مشکوۃ شریف۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۳۵]

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ جو آدمی توحید پر قائم رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ایسی خطائیں معاف کر دیتا ہے جو اسے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتیں۔ وہ اعمال جو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتے ہیں ان کے ہوتے ہوئے فقط کلمہ توحید کی زبان سے ادائیگی کا کچھ فائدہ نہیں۔ یوں کلمہ توحید "لا الہ الا اللہ" جنت میں داخلے اور جہنم سے نجات کا سبب تو ہے تاہم **سبب اسی وقت فائدہ دیتا ہے جب اس کی شرائط پوری کی جائیں** اور جو باتیں اس کے منافی ہیں ان سے کلی اجتناب کیا جائے۔

- "اور حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ [وہب بن منبہ تابعی ہیں کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ ۱۱۴ھ میں آپ کی وفات ہوئی] سے مروی ہے کہ کسی نے ان سے سوال کیا، کیا "لا الہ الا اللہ" جنت کی کنجی نہیں ہے؟

وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا" بے شک، **لیکن کنجی میں دندانے بھی ضروری ہیں** پس اگر تم ایسی کنجی لے کر آئے جس میں دندانے موجود ہیں تو [یقیناً] اس سے جنت کے دروازے کھل جائیں گے ورنہ تمہارے جنت کے دروازے نہیں کھلیں گے۔" [بخاری] [مشکوۃ شریف۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۳۹]

دین اسلام کا دین توحید ہونے سے کیا مراد ہے؟

✓ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ [سورۃ الانبیاء؛۲۵] "اور جو پیغمبر، ہم نے تم سے پہلے بھیجے، ان کی طرف **یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں** تو میری ہی عبادت کرو"

دین اسلام کی اصل جڑ یا بنیاد صرف عقیدہ توحید ہے اور باقی تمام عقائد اسی ایک عقیدہ کی فروعات ہیں اور یہی وہ عقیدہ ہے جس نے ایک مسلمان کی تمام زندگی کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ اگرچہ ہر مسلمان کم از کم قولی طور پر اسی توحید کا علم بردار ہے [یعنی اعمال میں تفاوت کے باوجود تمام مسلمان ایک ہی کلمہ یعنی "لا الہ الا اللہ" کے علم بردار ہیں] مگر یہ عقیدہ توحید فقط ایک کلمہ کی شکل میں کسی جامد قول کا نام نہیں ہے بلکہ ایک مسلمان کی زندگی کے تمام عقائد، اقوال اور اعمال کا واحد اور بنیادی محرک ہے۔

عقیدہ توحید کے دو درجات ہیں؛ "**مطلوب**" اور "**مقصود**"۔ توحید مطلوب سے مراد توحید کا وہ درجہ ہے جو نظریاتی اور عملی شرک کے متضاد کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور توحید مقصود سے مراد توحید کا وہ درجہ ہے جو اللہ کی محبت میں شرک کے متضاد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ عقیدہ توحید کے ان دونوں درجات کی باہم حیثیت لازم و ملزوم کی سی ہے اور آخر کیوں نہ ہو، مطلوب کے بغیر مقصود کا تصور ممکن ہی نہیں۔

توحید مطلوب سے کیا مراد ہے؟

✓ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ **يُشْرَكَ بِهِ** وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَ۔۔۔۔ [سورۃ النساء؛۴۸] "خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ **کسی کو اس کا شریک بنایا جائے** اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے۔۔۔۔"

اس توحید کا مخاطب ہر کلمہ گو مسلمان ہے اور شرک کے متضاد ہونے کے باعث، یہ توحید جہنم سے نجات کے لیے جزولازم کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے تین اجزاء بیان کیے جاتے ہیں؛توحید اسماءوصفات؛توحید ربوبیت اور توحید الوہیت

أ. **توحید اسماءوصفات؛** خالق اور مخلوق کی صفات میں مندرجہ ذیل پانچ بنیادی امتیازات ہیں؛

أ. اللہ سبحان وتعالٰی کی صفات **ذاتی** ہیں جبکہ مخلوق کی صفات عطائی۔

ب. اللہ سبحان وتعالٰی کی صفات **قدیم** ہیں جبکہ مخلوق کی صفات حادث۔

ت. اللہ سبحان وتعالٰی کی صفات **لا محدود** ہیں جبکہ مخلوق کی صفات محدود۔

ث. اللہ سبحان وتعالٰی کی کل صفات کا **ظہور دائمی اور کل وقتی** [یعنی اللہ سبحان وتعالٰی کی صفات میں کوئی روک یا تعطل نہیں اور کل کائنات میں کل صفات ہمہ وقت جاری وساری ہیں] ہے جبکہ مخلوق کی صفات کا ظہور نہ صرف جزوقتی ہے بلکہ موافق حالات کے تابع ہونے کے ساتھ ساتھ جزوی ہے۔

ج. اللہ سبحان وتعالٰی کی صفات اس کے **ارادہ اور قدرت کے تابع** ہیں جبکہ مخلوق کا ارادہ اور قدرت اس کی صفات کے تابع۔

پہلے تین امتیازات پر عمومی اتفاق ہے اور ان میں شرک انتہائی شاذ ہے۔اور آخری دو امتیازات جن کی بنیاد پر ہی کل مخلوقات کا وجود اور دوام ہے، کیونکہ وہی واحد ذات ہے جو [الْحَيُّ الْقَيُّومُ ؛ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ] کی صفات سے متصف ہے؛ انہی دونوں میں عمومی جہالت اس توحید میں شرک کا باعث ہے۔اس شرک کا تعلق اللہ کی صفات کے نفاذ اور اجراء میں ہے، یا یوں کہیں کہ یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالٰی نے اپنے سوا دوسری ہستیوں کو بھی نفع ونقصان پہنچانے کا کچھ اختیار دے کر ان کو مالک بنا دیا ہے۔اور اس درجہ میں بالخصوص ہر "یا محمد ﷺ"، "یا علی رضی اللہ عنہ"، "یا داتا" "یا غوث" وغیرہ پکارنے والے مسلمان کو قرآن کی روشنی میں اپنے

نفس کے محاسبہ کی ضرورت ہے کہ آخر اس پکار کے پیچھے کون سا عقیدہ کار فرما ہے اور بالعموم ہر اس مسلمان کو اپنے نفس کے محاسبہ کی ضرورت ہے جس کی امیدیں صرف ظاہری اسباب پر ٹھہری ہوئیں ہیں۔

ب. **توحید ربوبیت؛** اللہ کی ذات میں شرک سے [الحمد للہ] آخری درجہ کا مسلمان بھی پاک ہے۔ حتّٰی کہ ماضی یا حال کی جو قومیں اس شرک میں مبتلا ہیں وہ بھی اس شرک کی حقیقت بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بھی قرار دینے کے باوجود ان کو اللہ کی مخلوق اور علیحدہ وجود ٹھہراتے تھے اور اسی طرح عیسائی حضرات تا حال عقیدہ تثلیث کی حقیقت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

ت. **توحید الوہیت؛** مندرجہ بالا توحید مطلوب کے دونوں اجزاء کا تعلق نظریاتی شرک سے ہے اور ان میں موجود شرک کی عملی شکل کا تعلق اسی توحید الوہیت کی نفی سے ہے اور ہماری عبادت و عبادات میں موجود نظریاتی شرک کی ظاہری شکل ہے۔ جن بھائیوں اور بہنوں نے ذرا سی بھی توجہ سے "عبادت اور عبادات کی حقیقت" اور "طاغوت کی حقیقت" والے مضامین کا مطالعہ فرمایا ہے، ان کے لیے اس شرک کی آگہی آسان ہے اور شرک کی اس قسم سے بچاؤ، مستقل نوعیت کے اور اخلاص والے محاسبہ کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔

توحید مقصود سے کیا مراد ہے؟

✓ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا **أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ** ــــــ[سورۃ البقرۃ؛ ١٦٥] اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر خدا کو شریک (خدا) بناتے اور ان سے خدا کی سی محبت کرتے ہیں۔ لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو **خدا ہی کے سب سے زیادہ دوست دار ہیں**ــــــ"

اس توحید کے مخاطب مومنین اور محسنین ہیں۔ اور اس توحید مقصود کا مطلوب و مقصود اور چوٹی، وہ محبت ہے جس کا صرف اور صرف اللہ ہی حقیقی معنوں میں حقدار ہے۔

محبت ایک فطری رد عمل ہے جو کسی بھی محسن کے احسان کا منطقی نتیجہ ہے۔ جیسے جیسے محسن کے احسانات اور اس کی بے لوث ہونے کے احساس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اسی حساب سے محسن کی محبت دل پر قبضہ کرتی جاتی ہے۔ اس محبت میں مزید اضافہ کا سبب اپنی کم حیثیتی اور محسن کے احسانات کا بدلہ نہ دینے کی سکت کا احساس ہے۔ اور آخر اللہ سبحان و تعالیٰ سے بڑا حقیقی محسن کون ہو سکتا ہے؟؟؟؟؟

- ✓ وَءَاتَىٰكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِن تَعُدُّوا۟ نِعْمَتَ ٱللَّهِ لَا تُحْصُوهَآ ۗ إِنَّ ٱلْإِنسَٰنَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ [سورة الابراهیم؛ ۳۴] اور جو چیز تم نے مانگی تم کو ہر چیز دی اور **اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگر (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لاسکتے** (مگر) یہ سچ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف بڑا ہی ناشکرا ہے۔

اللہ سبحان و تعالیٰ کی محبت دونوں قسموں کی محبتوں، یعنی "**فطری**" [مثلاً نفسی، خونی رشتہ دار وغیرہ] اور "**اختیاری**" [مثلاً دنیاوی آسائشیں، وطن، ادارے وغیرہ] پر حاوی ہے۔ جب بھی کسی فطری محبت کو یا اختیاری محبت کو اللہ کے ساتھ محبت پر ترجیح دی جاتی ہے یا اللہ کے دشمنوں [یعنی کفار] سے کوئی محبت والا تعلق رکھا جاتا ہے، تو یہ عقیدہ توحید ناقص ہو جاتا ہے اور عذاب کے وجوب کا سبب بنتا ہے۔

کیا ہر پیدائشی مسلمان مؤحد نہیں ہوتا ہے؟

ایک مشہور و معروف حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ہر بچہ **فطرت اسلام ہی پر پیدا ہوتا ہے** بعد میں ماں باپ اُس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں" [بخاری و مسلم بحوالہ مشکاۃ صفحہ ۲۱] تو اس سے **ایک بات تو ثابت ہوئی کہ مسلمان پیدا ہونا تو کوئی کمال نہیں اصل اہمیت اسلام کی حالت میں موت کو ہے**۔ اکثر لوگ لا الہ الا اللہ زبان سے تو کہتے ہیں مگر اس کے معنی و مفہوم سے ناواقف ہیں اور ایک مسلمان کے گھر مسلمان کی حیثیت سے پیدائش کو اپنی اخروی نجات کے لیے کافی سمجھتے ہیں جبکہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ جیسے نماز؛ روزہ؛ زکوٰۃ اور حج جیسے اعمال بھی کچھ ظاہری و باطنی ارکین کا مجموعہ ہیں اور جن کی ادائیگی کے بغیر یہ اعمال قابل قبول نہیں ہوں گے؛ وہاں انتہائی حیرانگی کا مظہر ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت شہادتین سے متعلق ارکین سے قطعی طور پر نابلد ہے؛ جبکہ **شہادتین کی غیر موجودگی میں تو کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں ہے**۔

مزید توحید کے قولی اقرار ہی کو جنت کا ضامن قرار دینے والوں کے ابطال کے لیے مندرجہ ذیل حدیث ہی کافی ہو گی؛

- ✓ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" **عقلمند و بہادر شخص وہ ہے**، جو اپنے نفس کو جھکا دے اور فرمان الٰہی کا مطیع و فرمانبردار بنادے اور اس اجر و ثواب کے لئے اچھے عمل کرے جو موت کے بعد پائے گا۔ نیز **احمق و نادان اور بزدل شخص وہ ہے**، جو اپنے نفس کو خواہشات کے تابع بنادے اور اللہ تعالیٰ سے اس بات کا متمنی اور آرزو مند ہو کہ وہ اس سے راضی ہو، اس کو بخش دے اور اس کو جنت میں داخل کرے۔ [مشکوۃ شریف۔ جلد چہارم۔ دکھلاوے اور ریاکاری کا بیان۔ حدیث ۱۲۱۵]

عقیدہ توحید چھ [۶] ظاہری و باطنی ارکان کا مجموعہ ہے اور چاہے توحید مطلوب ہو یا مقصود، دونوں درجات کے ارکان یکساں ہیں کیونکہ یہ دونوں درجات ایک ہی صراط المستقیم کی دو منزلیں ہیں اور انہی ارکان کے ذریعے عقیدہ توحید، دین اسلام کے تمام عقائد صحیحہ، اقوال ثابت اور اعمال صالح پر محیط ہے اور ان تمام عقائد، اقوال اور اعمال کی قبولیت کا دار و مدار، ان میں موجود عقیدہ توحید کے ان ارکان کی صحت پر ہے۔

علم [نقل کی بنیاد پر نہ کہ عقل کی بنیاد پر]؛

- ✓ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے؛ "جو اس حال میں مر گیا کہ وہ اس **بات کا علم** رکھتا تھا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے تو یہ آدمی جنت میں داخل ہو گا"۔ [صحیح مسلم۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۱۳]

قرآن انسان کی دو صفات کا ذکر، اس کی آخرت میں جوابدہی کے اسباب کے طور پر بیان کرتا ہے۔ **جہالت** اور **ظلم**۔ ظلم سے مراد "کسی بھی چیز کو اس کی [مقصد تخلیق] سے ہٹ کر استعمال کرنا" ہے اور جہالت کی وجہ سے انسان چیزوں کے "مقصد تخلیق" میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے کے باعث بالعموم اسی ظلم کا ارتکاب کرتا ہے اور اسی لیے قرآن کے مطابق سب سے بڑا ظلم "**شرک**" ہے کیونکہ انسان کی اپنی تخلیق کا مقصد ہی اللہ کی عبادت ہے۔

- ✓ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ [سورة الذاریات؛۵۶] "اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ **میری عبادت کریں**"

اس ظلم عظیم کی واحد وجہ اللہ کی ذات اور اس کے اسماء وصفات سے جہالت ہے۔اللہ کی ذات کا ادراک تو کسی بھی انسان کے لیے ناممکن ہے، مگر اللہ کی ذات کا اثبات اس کی فطرت میں موجود ہے اور اس کی معرفت کے حصول کا واحد ذریعہ اس کے اسماء وصفات کا علم ہے اور جس طرح اللہ کے اسماء وصفات کی وسعت لا محدود ہے اسی طرح ان سے متعلق علم بھی لا محدود ہے۔

- ✓ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ ۔۔۔۔۔[سورۃ محمد؛۱۹] "پس **جان رکھو** کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔۔۔۔"

اس رکن کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کا علم رکھتا ہو اور اس معرفت کے بعد وہ علوم بھی اسی عقیدہ توحید کو خالص کرنے کے لیے لازم ہیں، جن کا تعلق اس کی رضامندی کے حصول سے ہے، جن کو ہم شرعی علوم کہتے ہیں۔یاد رہے کہ، اللہ تعالیٰ کی معرفت کے علم کا واحد ماخذ قرآن اور [صحیح] حدیث کی صورت میں نقلی دلیل ہے نہ کہ عقلی دلیل جبکہ شرعی علوم کے ماخذ قرآن اور [صحیح اور حسن] حدیث کے نقلی دلائل کے علاوہ، انہی نقلی دلائل کی بنیاد پر اجتہاد اور قیاس عادلہ کی صورت میں عقلی دلائل بھی ہیں۔

یقین[علم کی بنیاد پر]؛

- ✓ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ بلاشبہ میں اللہ کا رسول ﷺ ہوں۔[اور یاد رکھو] ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ان دو گواہیوں کے ساتھ کہ جن میں سے اس کو **کوئی شک وشبہ نہ ہو**، اللہ تعالیٰ سے جا کر ملے اور پھر اس کو جنت میں جانے سے روکا جائے"۔[صحیح مسلم][مشکوۃ شریف۔ جلد پنجم۔ معجزوں کا بیان۔ حدیث ۵۰۰]

"علم" فقط ایک معلومات کا مجموعہ قرار ہو گا جب تک اس معلومات پر یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہو گی۔ علم کی طرح یقین بھی کوئی جامد رکن نہیں ہے کہ جس کا حصول محض زبانی اقرار کے ساتھ منسلک ہو؛ بلکہ یہ وہ دلی کیفیت ہے جو علم کو عمل کی صورت میں ڈھالنے کا واحد اور انتہائی مؤثر ذریعہ ہے۔

اللہ کی ذات اور اسماء وصفات پر یقین ہی تو ہم سب کو دین پر ہر حال میں ثابت قدم رہنے کی طاقت مہیا کرتا ہے۔ یہ یقین جتنا پختہ ہو گا اتنا ہی عمل میں حاصل کردہ علم نظر آئے گا اور جس کا عمل اس کے حافظہ میں موجود علم سے مطابقت نہ کھاتا ہو، اتنا ہی اسے اس رکن کی ادائیگی کے متعلق فکر مند ہونا چاہیے اور جتنا اس یقین میں اضافہ ہو گا اتنا ہی انسان کے تقویٰ میں اضافہ ہو گا اور اتنا ہی باقی ارکان کی ادائیگی آسان ہوتی جائے گی۔

یعنی اللہ کے "العزیز [یعنی سب پر غالب]" ہونے کا علم بھی ہو اور یقین ہونے کا دعویدار بھی ہو لیکن کفار سے ڈرتا ہو یا اسی طرح قول سے اللہ کے "الرزاق" ہونے کا دعویدار تو ہو مگر دنیا کمانے کے کسی ناجائز موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے؛ تو اس کے عقیدہ توحید کا یہ رکن ناقص ہے اور عذاب کے وجوب کا سبب ہے۔ اور اس رکن کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کا دل سے یقین ہو۔

قبول [ہر ضرورت دین کو]؛

- ✓ ۔۔۔۔۔ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ [سورة البقرة ؛۸۵]" ۔۔۔۔۔ [یہ] کیا [بات ہے کہ] تم کتابِ [خدا] کے **بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کئے دیتے ہو**، تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں اور جو کام تم کرتے ہو، خدا ان سے غافل نہیں"۔

ہر وہ عقیدہ یا عمل جو قرآن اور صحیح حدیث کے نقلی دلائل کی وجہ "من جانب الی اللہ" ثابت ہو تو اس کو "ضرورت دین" کہتے ہیں اور ان میں سے ایمان مفصل کے تابع عقائد کو تفصیلات کے ساتھ اور باقی ماندہ عقائد و اعمال کو اجمالی طور پر دلی اور قولی طور پر قبول کرنا لازم ہے اور یہی اس رکن کا کم از کم درجہ ہے۔

عقیدہ توحید کا یہ تیسرا رکن اپنے اندر ہر اس عقیدہ، نظریہ یا عمل کے ردّ کو بھی لازم ٹھہراتا ہے جو قبول شدہ "ضرورت دین" کے مخالف ہو، کیونکہ کوئی صحیح العقل شخص دو متضاد عقیدے، نظریے یا عملوں کو بیک وقت قبول نہیں کر سکتا۔ مثلاً غیر ملکی شہریت کے حصول کیلئے اللہ کی اطاعت کے مقابلے میں ملکی قوانین کی بالادستی کو قبول کرنا یا اللہ کی حاکمیت کے اقرار کے مقابلے میں عوام کی حاکمیت کا اقرار کو قبول کرنا یا امت کے نظریہ کے مدمقابل وطنیت کا نظریہ کو قبول کرنا وغیرہ۔

اور اسی طرح جو عقیدہ یا عمل قرآن اور صحیح حدیث سے ثابت ہو اور اہل سنت والجماعت کے مطابق "ضروریات دین" میں شامل ہو تو کوئی عصر حاضر کی مجبوری اُس کو ساقط قرار نہیں دے سکتی۔ مثلاً اقدامی یا دفاعی جہاد کو ساقط قرار دینا یا لواطت بازی؛ میوزک؛ نامحرم سے تعلقات وغیرہ کو کبیرہ گناہ نہ سمجھنا وغیرہ۔

"ضروریات دین" کے انکار یا "ضروریات دین" سے مخالف عقائد، نظریات یا اعمال کو قبول کرنا یا "ضروریات دین" کو ساقط سمجھنے سے عقیدہ توحید کا یہ تیسرا رکن ناقص ہو جاتا ہے اور عذاب کے وجوب کا سبب بنتا ہے۔

اطاعت [وہبی استطاعت کے مطابق نہ کہ مرضی کے مطابق]:

- ✓ وَأَنِيبُوا إِلَى رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ ۔۔۔۔۔ [الزمر؛۵۴] "اور پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور **مطیع بن جاؤ** اسکے۔۔۔۔۔"۔

اس دنیا کی تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہیں اور اس کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے اور ہر انسان پر اس کی "وہبی استطاعت" کے مطابق اس رکن کی ادائیگی فرض ہے۔ "وہبی استطاعت" سے

مراد اس کی وہ ذہنی اور جسمانی صلاحیت ہے، جن کو وہ اپنے پختہ ارادہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی نیت سے استعمال کرنے کی استطاعت رکھتا ہے اور وہ اسی حد تک مکلف ہے۔

- ✓ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا۔۔۔۔۔[سورۃ البقرۃ؛۲۸۶] "خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔۔۔۔"

دنیاوی امور ہوں یا دینوی امور اس پختہ ارادہ کا [وہبی استطاعت کے باوجود] تکمیل تک پہنچنا اللہ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مگر دنیاوی امور کے برعکس، بالعموم دینوی امور میں ہم اللہ کی توفیق کو اپنی کوششوں پر مقدم ٹھہراتے ہیں، جیسا کہ نعوذباللہ دنیاوی امور میں تو ہمیں اس کی توفیق کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مثلاً موسم کی سختیاں ہمیں دنیاوی امور کی ادائیگی سے تو روکنے سے قاصر ہوں مگر دینی امور میں ہمارے نزدیک ان کی حیثیت رخصتوں کی سی ہو یا دنیاوی امور کے لیے تو ہجرت کی تکالیف ہماری استطاعت میں ہو مگر دینی امور کی ادائیگی کے لیے ہم اس کے ہم پلہ تکلیف اٹھانے پر تیار نہ ہوں۔ تو اگر اللہ کی اطاعت کو مخلوق کی اطاعت کے تابع کر دیا یا کم از کم دنیاوی امور کے برابر دینی امور میں اپنی وہبی استطاعت کو آزمائے بغیر اللہ کی اطاعت نہ کی تو ہمارے عقیدہ توحید کا یہ رکن ناقص ہے اور عذاب کے وجوب کا سبب ہے۔

صدق [یعنی اعتقادی منافق نہ ہو]؛

- ✓ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جس نے **سچے دل سے** لا الہ الا اللہ کہ دیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا" [سند احمد۔ جلد ششم۔ حدیث ۲۰۳۰]

اس رکن کا براہ راست تعلق باطن میں رکن نمبر تین یعنی "**قبول**" سے ہے اور ارکان نمبر تین اور چار صرف اسی صورت میں قابل قبول ہیں جبکہ وہ اپنے باطن میں صدق یعنی سچائی پر مبنی ہیں۔ اگر انسان باطن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کا منکر ہو مگر ظاہری طور پر "**قبول**" اور "**اطاعت**" کے ارکان کی ادائیگی کا مظاہرہ کرتا ہو، تو ایسے انسان کے عقیدہ توحید کا یہ رکن صرف ناقص ہی نہیں بلکہ عدم موجود ہونے کے باعث دائمی عذاب کے وجوب کا سبب ہے۔

اس رکن کے مخاطب محض وہ اعتقادی منافق نہیں ہیں جو ہر دور میں محض اسلام کو نقصان پہنچانے کی غرض سے اسلام کا لبادہ اوڑھے رکھتے ہیں بلکہ عصر حاضر میں اس کے مخاطب وہ نسل بھی ہے جو الحادی فلسفوں اور نظریات سے متاثر ہو کر محض خاندانی اور معاشرتی دباؤ کے تحت ظاہری طور پر "قبول" اور "اطاعت" کے ارکان کی ادائیگی کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے مگر باطن میں ان سے کوسوں دور اور جس کی تعداد مسلمان معاشروں میں فی الحال کم مگر مغربی معاشروں میں دن بدن ہر نئی نسل کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔

اخلاص [یعنی عملی منافق نہ ہو]؛

- ✓ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ [سورة البينه:۵] "انہیں صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت کریں اس کے لئے **دین کو خالص کرتے** ہوئے یک طرف ہو کر"۔

عقیدہ توحید کا رکن نمبر چار یعنی "**اطاعت**" اسلام کا ظاہر ہے، تو "**اخلاص**" اس کا باطن ہے، کیونکہ ہر نیک عمل کی قبولیت کی دو ہی شرائط ہیں "باطن میں نیت کا اخلاص" اور "ظاہر میں اس عمل کا قرآن اور حدیث کے مطابق ہونا"۔ اخلاص وہ صفت ہے جو قلیل عمل کے بھی ساتھ ہو تو اس کو کفایت کر جائے اور آخرت میں یہ قلیل عمل اس کثیر عمل سے کہیں زیادہ وزنی ہو گا جو بظاہر بڑا مگر اخلاص سے محروم ہو گا۔

اخلاص میں کمی، نیک عمل کے ثواب اور درجات میں کمی کا باعث بنتا ہے، یہاں تک کہ کچھ صورتوں میں عمل کے ضائع ہونے کے ساتھ ساتھ عقیدہ توحید کے اس رکن کو ناقص بھی کر دیتا ہے اور عذاب کے وجوب کا سبب بنتا ہے۔

عقیدہ توحید کی حقیقت کا خلاصہ کلام

گو توحید مطلوب کا کامل حصول اس دنیا میں ممکن ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شرک سے بری قرار دیا، مگر کسی انسان [بشمول انبیاء علیہم السلام] کے بس میں نہیں ہے کہ وہ توحید مقصود کا کامل طور پر حامل ہو سکے؛ کیونکہ عقیدہ توحید کا اول رکن ہی لا محدود علم پر مبنی ہے، جو لا محدود یقین کا متقاضی ہے اور یہی لا محدود یقین، لا محدود قبولیت، اطاعت، اخلاص اور بالآخر توحید مقصود یعنی کامل محبت کی بنیاد ہے اور چونکہ یہ تمام

ارکان، دین کے تمام عقائد، اقوال اور افعال پر محیط ہیں؛ اسی لیے رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا مفہوم کہ "کوئی شخص جنت میں اپنے اعمال کی بنیاد پر داخل نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کو ڈھانپ لے" کھل کر واضح ہو جاتا ہے۔ اس لیے جنت میں داخلے کے امکان سے زیادہ جہنم میں داخلے کے خطرے کو حقیقی سمجھتے ہوئے؛ انسان کو فقط چند نیک اعمال پر بھروسا کرنے کے بجائے ہمہ وقت اپنی کوتاہیوں سے توبہ استغفار اور مقدور برابر دین میں محنت کے ساتھ اللہ کی رحمت کا طلب گار بننا چاہیے کیونکہ اللہ کی رحمت بھی انہیں پر متوجہ ہوتی ہے جو اس کی رحمت کے طلب گار ہوتے ہیں، نہ کہ ان لوگوں پر جو اپنی زندگی اپنے اصولوں پر بسر کر کے اپنے آپ کو اس کی رحمت سے ماورا سمجھتے ہیں۔

میرے عزیز بھائیوں اور بہنوں؛ قرآن کے مطابق ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم سے بچائے، نہ کہ ان کی دنیاوی خواہشات کے حصول میں اپنی زندگی کھپا دے اور فقط یہی سبق اپنی اگلی نسل کو منتقل کر دے؛ حدیث کے مطابق تو، مسلمان کے لیے اس دنیا کی حیثیت ایک قید خانہ کی سی ہے؛ تو جب تک یہ عقیدہ توحید ہی اس پر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ واضح نہیں ہو گا اور وہ اس کو اپنے اہل و عیال میں منتقل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا تو آخر باقی دین کی اہمیت وہ کیسے [بشمول اپنے] ان کے دل میں اجاگر کر سکے گا؛ جب کہ باقی تمام عقائد اور اعمال اسی عقیدہ توحید کو خالص کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہیں نہ کہ اپنی ذات میں خود کوئی جدا مقصد۔ یاد رہے کہ؛ جنت پاک روحوں کا مسکن ہے اور کوئی انسان اپنے عقائد، اقوال یا اعمال میں موجود، گناہ کبیرہ یا کفر مجازی کی صورت میں شرک کی لعنت سے مکمل پاکی حاصل کیے بغیر، جنت کا مستحق قرار نہیں پائے گا اور اس پاکی کے حصول کے متعدد طریقہ قرآن و سنت میں واضح ہیں مثلاً گناہوں سے سچی توبہ اور استغفار، نیک اعمال کا ارتکاب، دنیاوی مصائب و آلام، موت کی سختی، قبر کی سختی، روز محشر کے پچاس ہزار سال کے دن کی ہولناکیاں اور اگر یہ بھی کفایت نہ کیا تو [نعوذ باللہ من ذالك] جہنم کا وقتی عذاب۔ اس پاکی کے حصول کے بعد ہی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت خصوصی سے شفاعت یا بغیر شفاعت کے جنت کا داخلہ عطا فرمائیں گے۔

اس عقیدہ توحید کی بنیاد پر دنیااور آخرت میں دو ہی گروہ وجود میں آتے ہیں "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" اور ان ارکان کی کسی نہ کسی درجہ میں ادائیگی ہی ہمیں روز قیامت "حزب اللہ" کا رکن قرار دلوائے گی، نہ کہ فقط اس دنیامیں قولی طور پر کلمہ طیبہ کی ادائیگی۔ جو ان ارکان کی ادائیگی میں جتنا کامیاب ہو گا اتنا ہی اس کے لیے جہنم سے نجات آسان ہو گی اور جو جتنا دور اتنی ہی مدت اس کو جہنم میں پاکیزگی حاصل کرنے میں لگے گی۔

لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله محمد رسول الله

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی اٰلہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً كثیرا كثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

عقیدہ رسالت کی حقیقت

توحید باری تعالٰی پر ایمان، گو ایمانیات میں اولیت رکھتا ہے، مگر دنیاوی لحاظ سے اعمال کی درستگی کے پیمانہ کے باعث، عقیدہ رسالت اور عقیدہ آخرت کی اہمیت مُسَلّمہ ہے۔ اور ان دونوں میں سے عقیدہ رسالت اس وجہ سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ اس عقیدہ کے بگاڑ کا اثر سب سے پہلے عقیدہ آخرت پر پڑتا ہے اور انسان آخرت کے متعلق اپنی خود ساختہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عقیدہ رسالت کی اہمیت کا احساس اس بات سے بھی واضح ہے، کہ عقیدہ توحید بھی وہی اللہ کے سامنے معتبر ہے، جس پر اس کے رسول ﷺ کی مہر ہو۔ رسالت کی تصدیق اور اس پر ایمان لائے بغیر کوئی انسان غیب پر ایمان لانے کا دعوی نہیں کر سکتا کیونکہ رسول ہی اللہ کا وہ بندہ ہے جو **ایمانیات، عبادات اور معاملات کے تمام مسائل کو فلسفیانہ بحث سے نکال کر وحی کی روشنی میں روز روشن کی طرح بیان کرتا ہے۔**

اسی اہمیت کے پیش نظر یہ عقیدہ ہمیشہ اسلام دشمن عناصر کا تختہ مشق بنا رہا؛ منافقین ہوں؛ مستشرقین ہوں یا مسلمان ہونے کے زعم میں منکر حدیث ہوں؛ سب نے اپنا پہلا وار عقیدہ رسالت پر کیا ہے؛ کیونکہ ہر فتنہ پرور شخص اس بات کا بھرپور ادراک رکھتا ہے کہ اگر اس عقیدہ کو امت کی نظر میں دھندلا دیا جائے تو باقی دونوں عقائد جن کا تعلق ویسے ہی غیب سے ہے، ہر قسم کی تاویلات کے لیے کھل جاتا ہے، جس کی آڑ میں وہ اصل مقصد یعنی عملی اسلام کی جڑ کاٹنا ایک آسان فعل رہ جاتا ہے۔

آج کے جدید یا ماضی کے منکر حدیث، امت سے حدیث کی صحت پر کلام کرتے ہوئے، کل احادیث یا حدیث کے ایک بڑے مجموعے کو محض ایک قابل ردّ ظنی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اپنی بے دلیل قرآن فہمی اور اپنی عقل کو عقل سلیم کا تمغہ دیتے ہوئے، احادیث کے کل مجموعے پر اس کو فوقیت دیتے ہوئے، امت سے بھی اسی حق کے دعویدار ہیں کہ امت اپنی اسلامی تاریخ کے تمام سلف و خلف کے علمائے حق کو،

جن کی تمام زندگیاں قرآن اور احادیث کے سائے میں گزریں، چھوڑ کر ان کے پیش کردہ اسلام کو ابدی حقیقت مانتے ہوئے ان کی پیروی کرے۔

کیا کلمہ رسالت "محمد رسول الله" کی زبان سے ادائیگی ہی قیامت کے روز مجھے رسول پاک ﷺ کی شفاعت کا حقدار بنادے گی؟

محمد مصطفیٰ ﷺ کے امتی ہونے کی حیثیت سے ہم شفاعت کلی کے دعویدار تو ضرور ہیں مگر کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے جب اس دنیا میں بھی قابل قبول نہیں ہوتا تو آخرت میں اس کا کیا وزن ہو گا۔ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا؛

- ✓ "میں حوض پر تمہارا میزبان ہوں گا جو اس حوض پر آئے گا وہ پئے گا اور جو ایک بار پی لے وہ کبھی پیاسا نہیں رہے گا اور میرے حوض پر کچھ ایسے لوگ میرے پاس آئیں گے جن کو میں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے پھر **میرے ﷺ اور ان کے درمیان رکاوٹ حائل کر دی جائے گی**۔ آپ ﷺ فرمائیں گے یہ میرے پیروکار ہیں؛ تو کہا جائے گا آپ ﷺ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ ﷺ کے بعد کیا کیا ہے؛ میں کہوں گا جن لوگوں نے میرے بعد دین میں تبدیلی کی **ان سے دوری ہو دوری ہو**"۔ [صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب فی الحوض، ح ۶۵۸۳، ۶۵۸۴]

عقیدہ رسالت کے ارکان اور ان کے قلبی اور عملی تقاضے کیا ہیں؟

علماء نے عقیدہ رسالت کی صحت کو مندرجہ ذیل ارکان کا مرہون منت قرار دیا ہے؛

أ. آپ ﷺ پر ایمان؛

ب. آپ ﷺ سے محبت؛

ت. آپ ﷺ کی اطاعت واتباع؛

أ. **آپ ﷺ پر ایمان؛** آپ ﷺ پر ایمان لانا مندرجہ ذیل تمام قلبی اور عملی تقاضوں پر محیط ہے؛

- **تصدیق؛** کہ آپ ﷺ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے سچے رسول اور اس کے بندے ہیں؛ اور دین حق کے ساتھ مبعوث کیے گے؛ لہذا آپ ﷺ نے جو چیزیں ہمیں بتلائی ہیں اور جن چیزوں کی خبر دی ہے ہم اس کی تصدیق کریں۔
- **خاتم النبیین؛** کہ آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور آپ ﷺ کی رسالت قیامت تک کے لیے انسانوں اور جنوں کے لیے ہے۔
- **معصوم عن الخطا؛** کہ اللہ نے آپ ﷺ کو نبوت سے پہلے اور بعد میں ہر طرح کے گناہ اور جرم سے محفوظ رکھا۔
- **حق تبلیغ؛** کہ آپ ﷺ نے اللہ کے پیغام کو امت تک پہنچانے کا فریضہ کامل طریقے سے ادا کیا اور حق تبلیغ ادا کر دیا؛ اور اب اس دین میں کسی بھی قسم کے اضافے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- **برحق معجزات؛** کہ اللہ نے آپ ﷺ کو سچے اور برحق معجزات عطا فرمائے؛

ب. **آپ ﷺ سے محبت؛** آپ ﷺ سے محبت کا دعوی مندرجہ ذیل تمام قلبی اور عملی تقاضوں پر محیط ہے؛

- **تمام محبتوں پر فوقیت؛** کہ آپ ﷺ سے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبت کی جائے حتٰی کہ اپنی جان سے بھی زیادہ؛ اور جہاں کوئی چیز اللہ کے رسول ﷺ کی محبت میں رکاوٹ بنے وہاں آپ ﷺ کی محبت پر اس چیز کو قربان کر دیا جائے۔
- **دیدار کا شوق؛** آپ ﷺ کے دیدار کی خواہش کی جائے؛ کیونکہ آپ ﷺ نے خود اپنے دیدار کی خواہش کو اپنی محبت کی ایک علامت قرار دیا؛ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

✓ "مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے میری امت کے وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے اور **ان کی یہ خواہش ہو گی کہ میرا دیدار کر لیں** خواہ اس کے لیے انہیں اپنے اہل و عیال اور مال و

دولت کی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑے"۔ [صحیح مسلم، کتاب الجنۃ؛ باب فیمن یود رؤیۃ النبی ص باھلہ و مالہ؛ ح ۲۸۳۲]

- **ادب واحترام؛** کہ اپنے قول و فعل سے کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جو آپ کے احترام کے منافی ہو۔ ایک انسان دنیا میں اپنے دوستوں؛ عزیزوں؛ بزرگوں اور والدین وغیرہ کو جتنا احترام دے سکتا ہے؛ اللہ کا رسول ﷺ اس سے بھی کہیں زیادہ احترام کے لائق ہیں۔ اسی احترام کا تقاضا ہے جب بھی آپ ﷺ کا ذکر ہو تو نہایت ادب و احترام سے آپ ﷺ کا نام لیا جائے؛ آپ ﷺ کا نام لیتے یا سنتے وقت آپ ﷺ پر درود و سلام پڑھا جائے؛ آپ ﷺ کی احادیث سنائی جائیں تو انہیں توجہ سے سنا جائے؛ آپ ﷺ کے فرمودات واحکام اگر نفس پر ناگوار بھی ہو تب بھی ان سے اعراض نہ کیا جائے۔
- **درود و سلام؛** کہ جہاں اور جب بھی آپ ﷺ کا ذکر مبارک ہو آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجے؛ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

✓ "وہ شخص ذلیل ہو جس کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ **مجھ پر درود نہ بھیجے**"۔ [ترمذی، کتاب الدعوات، باب رغم النف رجل ذکرت عندہ، ح ۳۵۴۵؛ مستدرک حاکم؛ ۱/۵۴۹]

- **سنت کی نصرت و محافظت؛** آپ ﷺ سے اظہار محبت کا طریقہ اور تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کی سنت کی نصرت و محافظت کی جائے؛ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

✓ "جس نے **میری سنت کو زندہ کیا** اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گا"۔ [ترمذی، کتاب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنتۃ و اجتناب البدعۃ، ح ۲۶۷۸]

- **اہل بیت رضی اللہ عنہم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت؛** کہ کسی بھی غلو سے پاک بلا تفریق آپ ﷺ کے اہل بیت رضی اللہ عنہم بشمول ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے باقی صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت، دوہری فضیلت کی وجہ سے عقیدت و محبت رکھی جائے؛ اور تمام جانثار اور وفادار اصحاب محمد ﷺ سے بھی

دلی محبت رکھی جائے کیونکہ ان سے محبت آپ ﷺ سے محبت کالازمی جز ہے اور ان سے بغض یاعداوت رسول اللہ ﷺ کی تعظیم وتکریم کے منافی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

✓ "تم [مسلمانوں] میں سے **سب سے بہتر لوگ وہ ہیں** جو میرے زمانے میں ہیں؛ پھر وہ ہیں جو ان کے بعد کے زمانے میں آئیں گے پھر وہ ہیں جو ان کے بھی بعد کے زمانے میں آئیں گے"۔ [صحیح بخاری، کتاب الشھادات، باب لا یشھد علی، ح۲۶۵۱؛ مسلم کتاب فضائل الصحابۃ، ۲۵۳۳]

✓ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا "میرے پیچھے میرے صحابہ کو نشان طعن مت بنانا، جو ان سے محبت کرتا ہے وہ **میری محبت کی وجہ** سے ان سے محبت کرتا ہے، اور جو ان سے نفرت کرتا ہے دراصل وہ مجھ سے نفرت کی وجہ سے ان کے ساتھ نفرت کرتا ہے جو انہیں ایذاء پہنچاتا ہے وہ مجھے ایذاء پہنچاتا ہے، اور جو مجھے ایذاء پہنچاتا ہے وہ اللہ کو ایذاء دیتا ہے، اور جو اللہ کو ایذاء دیتا ہے اللہ اسے عنقریب ہی پکڑ لیتا ہے"۔ [مسند احمد۔ جلد ششم۔ حدیث ۲۶۰۶]

- **دشمنوں سے نفرت؛** کہ آپ ﷺ سے محبت میں یہ بھی شامل ہے کہ جو لوگ آپ ﷺ یا آپ ﷺ کے دین یا آپ ﷺ کے اہل بیت رضی اللہ عنہم یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے حسد و کینہ اور بغض و عداوت رکھتے ہیں ہم کو بھی ان کے ساتھ نفرت اور بغض و عداوت ہی رکھنی چاہیے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا؛

✓ "اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرنے والوں سے **محبت رکھتے ہوئے ہرگز نہیں پائیں گے**، خواہ وہ [مخالفین] ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے قبیلے کے عزیز ہی کیوں نہ ہوں"۔ [سورۃ المجادلۃ ؛ ۲۲]

ت. **آپ ﷺ کی اطاعت واتباع؛** کلمہ رسالت کی تیسری شرط وہ عملی تقاضا ہے جو پہلی دو شرطوں کا منطقی اور عملی نتیجہ ہے۔ اور اس شرط کے دلائل قرآن اور احادیث میں بکثرت موجود ہیں جہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے مترادف قرار دیتا ہے اور قولی

اقرار کی حد تک اس شرط میں امت کی اکثریت کا کوئی اختلاف موجود نہیں۔ اس اتباع کا ایک پہلو جو اکثریت کی نظر سے اوجھل رہتا ہے، اس کا ذکر قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں موجود ہے؛ جہاں اللہ تعالیٰ زندگی کے ہر معاملے میں اپنے رسول ﷺ کے اسوۃ کو ہر مؤمن مسلمان کے لیے واحد معیار قرار دے رہا ہے۔

- ✓ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا [سورۃ الاحزاب؛ ۲۱] "تم کو **پیغمبر خدا کی پیروی (کرنی) بہتر ہے** (یعنی) اس شخص کو جسے خدا (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ خدا کا ذکر کثرت سے کرتا ہو"۔

ہر انسان اپنی زندگی کے معاملات میں کسی نہ کسی کی سنت یا طریق زندگی پر عمل کر رہا ہوتا ہے؛ چاہے وہ طریق زندگی اس کے والدین کے ہوں؛ دوست احباب کے ہوں؛ معاشرہ کے ہوں یا ان غیر مذہبی مسلمان یا کافر شخصیات کے طریق زندگی جن سے وہ ذہنی طور پر متاثر ہو، وغیرہ۔ جبکہ اللہ کا مطالبہ ہے کہ اس کے رسول ﷺ کا طریق زندگی ہی ہر مسلمان کا نصب العین ہونا چاہیے۔

کیا تمام دینی اور دنیاوی معاملات میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت شدہ سنتوں کی پیروی لازم ہے؟

سنت رسول کی اصل اہمیت، "مطلوب عقیدہ توحید" کی چوٹی یعنی "توحید اسماء وصفات" کی حقیقت میں پنہا ہے۔ خالق اور مخلوق کی صفات میں مندرجہ ذیل پانچ بنیادی امتیازات ہیں؛

ح. اللہ سبحان و تعالیٰ کی صفات **ذاتی** ہیں جبکہ مخلوق کی صفات عطائی۔

خ. اللہ سبحان و تعالیٰ کی صفات **قدیم** ہیں جبکہ مخلوق کی صفات حادث۔

د. اللہ سبحان و تعالیٰ کی صفات **لا محدود** ہیں جبکہ مخلوق کی صفات محدود۔

ذ. اللہ سبحان و تعالیٰ کی کل صفات کا **ظہور دائمی اور کل وقتی** [یعنی اللہ سبحان و تعالیٰ کی صفات میں کوئی روک یا تعطل نہیں اور کل کائنات میں کل صفات ہمہ وقت جاری و ساری ہیں] ہے جبکہ مخلوق کی

صفات کا ظہور نہ صرف جز وقتی ہے بلکہ موافق حالات کے تابع ہونے کے ساتھ ساتھ جزوی ہے۔

ر۔ اللہ سبحان و تعالٰی کی صفات اس کے **ارادہ اور قدرت کے تابع** ہیں جبکہ مخلوق کا ارادہ اور قدرت اس کی صفات کے تابع۔

انسان کی دنیا اور آخرت کی کامیابی صرف ان قلبی و ظاہری اعمال میں پنہاں ہے جو اللہ سبحان و تعالٰی کی ناراضگی والی صفات سے اس کو اللہ کی رضامندی والی صفات کی پناہ عطا فرماتے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

- ✓ [ایک طویل حدیث سے اقتباس]"۔۔۔۔۔اے اللہ میں تیرے سامنے اپنی حاجت پیش کر رہا ہوں اگرچہ **میری عقل کم اور میرا عمل ضعیف** ہے۔ میں تیری رحمت کا محتاج ہوں۔ اے امور کو درست کرنے والے، اے سینوں کو شفاء عطا کرنے والے میں تجھ ہی سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے دوزخ کے عذاب سے اسی طرح بچا جس طرح تو سمندروں کو آپس میں ملنے سے بچاتا ہے اور ہلاک کرنے والی دعا، قبر کے فتنے سے بھی اسی طرح بچا۔ اے اللہ **جو بھلائی میری عقل میں نہ آئے میری نیت اور سوال بھی اس وقت تک نہ پہنچا ہو** لیکن تو نے اس کا اپنی کسی مخلوق سے وعدہ کیا ہو یا اپنے کسی بندے کو دینے والا ہو تو میں بھی تجھ سے اس بھلائی کو طلب کرتا ہوں اور۔۔۔۔۔اے اللہ یہ دعا ہے اب قبول کرنا تیرا کام ہے اور یہ کوشش ہے بھروسہ تو تجھ ہی پر ہے۔۔۔۔۔"[جامع ترمذی۔ جلد دوم۔ دعاؤں کا بیان۔ حدیث ۱۳۷۲]

مندرجہ بالا دعا سے رسول اللہ ﷺ کی اللہ سبحان و تعالٰی سے متعلق اس عظیم معرفت کا احساس ہوتا ہے، جس کا اساس یہ ہے کہ انسانی عقل اپنے کسی ایک عمل سے بھی منسلک اللہ سبحان و تعالٰی کے کائنات میں ہمہ وقت جاری و ساری صفات کے ادراک سے مکمل طور پر نہ صرف قاصر ہے، بلکہ رفع حاجت جیسے انفرادی معاملہ سے لے کر دین کی چوٹی یعنی جہاد فی سبیل اللہ جیسے اجتماعی معاملہ تک، صرف اس ہدایت کا محتاج ہے جو اس عمل کے تمام ظاہری، باطنی عوامل کے ساتھ ساتھ اس عمل کے احسن نتیجہ پر محیط ہو۔

مزید برآں چونکہ ہر ظاہری قول یا عمل کسی نہ کسی عقیدہ کے **اثبات**؛ **تشہیر** یا اس عقیدہ پر **ایمان میں اضافہ کا باعث** ہوتا ہے، اسی لیے امت محمدیہ پر احسان خصوصی فرماتے ہوئے اللہ تعالٰی نے ان تمام انفرادی، باہمی اور اجتماعی اعمال کو جو اس کی رضا کو لازم، اس کی ناراضگی سے اس کی رحمت کی پناہ عطا فرماتے ہوئے، عقائد کی درستگی اور احسن نتیجہ کے ضامن ہیں، اپنے حبیب محمد مصطفٰی ﷺ کی سنت کی صورت میں جمع فرما کر اس پر [سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۲۱] کے ذریعے اپنی قبولیت کی مہر لگادی۔

زندگی کے ہر معاملے کو آپ ﷺ کی اسوۃ؛ سنت یا طریق زندگی کو [ثواب اور عذاب کے لحاظ سے] پانچ طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؛ فرض؛ مستحب؛ مباح؛ مکروہ اور حرام۔

فرض اور حرام معاملات کے دائرہ میں تو اللہ کے رسول ﷺ کی کلی اطاعت فرض ہے اور یہی وہ اطاعت ہے جو دین میں کم از کم معیار کے طور پر مطلوب ہے اور ان معاملات میں شرعی رخصتوں کا دائرہ انتہائی تنگ ہے۔ **مستحب اور مکروہ معاملات** میں گو شرعی رخصتوں کا دائرہ امت پر رحمت خصوصی کے نتیجے میں فرض اور حرام کے مقابلے میں وسیع تو ہے مگر آج امت کی اکثریت ان کو اختیاری [Optional] درجہ میں گردانتے ہیں۔ بغیر کسی شرعی عذر کے مستحب اور مکروہ معاملات میں رسول پاک ﷺ کی اتباع نہ کرنا ایک بہت بڑی گمراہی ہے اور اللہ تعالٰی کی رحمتوں اور برکتوں والی صفات کے جاری و ساری فیض سے دوری کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ، قرآن کی مندرجہ بالا آیت کی صریحاً مخالفت کے سبب باعث گناہ بھی قرار پاسکتا ہے۔

مثلاً نماز وقت پر ادا کرنا فرض ہے اور اس سے رخصت صرف نیند یا ذہنی معذوری ہے؛ اس کے برعکس جماعت کی نماز [نسبتاً] وسیع شرعی رخصتوں کے ساتھ، رسول اللہ ﷺ کی مستقل سنت کی صورت میں قرآن کے حکم "اقام الصلوۃ" کی ادائیگی کے لیے فرض یا کم از کم واجب کے درجہ میں ہے؛ مگر عوام کی اکثریت اس عمل کو محض ایک مستحب عمل کے درجہ میں رکھتے ہوئے، اختیاری [Optional] قرار دیتی ہے؛ جو دہرے گناہ کا باعث بنتا ہے؛ [یعنی ایک فرض یا واجب سے کوتاہی اور دوم رسول اللہ ﷺ کی سنت کو اختیاری [Optional] قرار دینا]۔ حتّٰی کہ **مباح معاملات** میں بھی اگر نیت آپ ﷺ کی اتباع کی ہے تو اس کا ثواب ضرور مسلمان کے

نامہ اعمال میں درج ہوگا اور دوسری طرف ان مباح معاملات میں بھی حَتّٰی الْاِمکان کفار کی اتباع کی نیت ہر گز شامل نہ ہو کیونکہ سنن ترمذی میں ایک روایت ہے، جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ؛

- ✓ "جو شخص ملت اسلامیہ کے علاوہ کسی اور امت کے ساتھ مشابہت اختیار کرے تو وہ **ہم میں سے نہیں**، ارشاد فرمایا کہ تم یہود اور نصاری کے ساتھ **مشابہت اختیار نہ کرو**"۔ [سنن الترمذي، کتاب الاستیذان، رقم الحدیث: ۲۶۹۵]

کیا بدعت حسنہ پر عمل رسول اللہ ﷺ کی اطاعت واتباع کے زمرہ میں آتا ہے؟

بدعت حسنہ کی اصطلاح شریعت میں تو مفقود ہے؛ بلکہ شریعت میں ہر قسم کی بدعت کا تذکرہ ہمیشہ مذموم طور پر پیش کیا گیا؛ بغیر حسنہ یا سیئہ کے اضافے کے۔ مثلاً رسول کریم ﷺ کے مندرجہ ذیل اقوال ہر قسم کی بدعت کی مذمت میں قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں؛

- ✓ "۔۔۔۔۔۔ میں کہوں گا جن لوگوں نے میرے بعد دین میں تبدیلی کی ان سے دوری ہو دوری ہو"؛ [صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب فی الحوض، ح ۶۵۸۳، ۶۵۸۴]
- ✓ "۔۔۔۔۔۔ ہر بدعت گمراہی ہے"؛ [صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلاة و الخطبة، ح ۸۶۷]
- ✓ "لوگو! بدعات سے بچو"؛ [السنة لابن ابی عاصم، تحقیق البانی، ح ۳۴]
- ✓ "اللہ تعالیٰ اس وقت تک بدعتی کی توبہ قبول نہیں کرتا جب تک کہ وہ بدعت نہ چھوڑے"؛ [صحیح الترغیب والترهیب، ح ۵۴]
- ✓ "تین آدمی اللہ کے ہاں سب سے مغضوب ہیں۔۔۔۔۔۔ [۲] اسلام میں جاہلیت کا طریقہ تلاش کرنے والا۔۔۔۔۔۔"؛ [صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب من طلب دم امرءی بغیر حق، ح ۶۸۸۲]
- ✓ "۔۔۔۔۔۔ جس نے کوئی بدعت جاری کی اور پھر اس پر لوگوں نے عمل کیا تو بدعت جاری کرنے والے پر ان تمام لوگوں کا گناہ بھی ہوگا جو اس بدعت پر عمل کریں گے۔۔۔۔۔۔"؛ [ابن ماجه، المقدمة، باب من احیا سنة، ح ۲۰۹؛ ترمذی مثله، ح ۲۶۷۷]

- "۔۔۔۔۔۔یاد رکھو! ہر عمل کے ساتھ انسان کو شروع میں جذباتی تعلق اور شدید محبت ہوتی ہے بعد میں اس کی محبت میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے؛ اگر یہ ٹھہراؤ بدعت پر ہو تو انسان گمراہ ہو گیا اور اگر یہ میری سنت پر ہو تو انسان ہدایت پا گیا"؛ [احمد، ۲/۱۶۵-۵/۴۰۹؛ السنة لابن ابی عاصم، ۲۸/۱؛ ابن حبان، ۳۴۹/۲؛ مجمع الزوائد، ۱۹۳/۲]
- "۔۔۔۔۔۔ان سے بدعت کے مقابلے میں سنت اٹھالی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔"؛ [مسند احمد، ج۴ ص۱۰۵؛ فتح الباری، ج۱۳ ص۲۶۷؛ فیض القدیر، ج۵ ص۴۱۳، ۴۱۲]

بدعت کی پہچان کا سب سے آسان اصول مندرجہ ذیل ہے؛

"ہر وہ **عمل جو ثواب کی نیت** سے کیا جائے اور اس **عمل کا جواز** رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں موجود ہو مگر اس پر **عمل کا ثبوت** سنت یا احادیث میں موجود نہ ہو"۔

مزید بر آں چونکہ ہر بدعت اپنے شرعی جواز سے محروم ہونے کی وجہ سے کسی یقینی ثواب کی بشارت سے بھی محروم ہے اسی لیے جس بدعت کی **تشہیر، ترغیب اور دعوت** دی جاتی ہو؛ جو کہ صرف یقینی ثواب کی حامل سنت کا خاصہ ہے؛ وہ قطعی طور پر ایک کھلی گمراہی ہے، بر خلاف انفرادی نوعیت کی بدعات کے، جو قرآن و سنت کے مخالف نہیں ہیں اور اللہ سبحان و تعالٰی کے ساتھ ذاتی تعلق میں اضافہ پر مبنی ہیں؛ ان کے حسنہ و سیئہ ہونے پر مختلف آراء موجود ہیں۔

چند مثالوں سے اس اصول کی مزید وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے؛

- کیا قرآن کی **تدوین مصحف** کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعد بدعت ہے؟ بلا شبہ قرآن کی تدوین کا عمل ثواب کی نیت کا متقاضی ہے مگر چونکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں وحی کی آمد کی امید کی وجہ سے اس کا جواز نہیں تھا اس لیے رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد اس عمل کو بدعت قرار نہیں دیا جاسکتا۔
- کیا نئی **ایجادات کا استعمال** بدعت ہے؟ ایجادات کا استعمال دنیا میں اپنی خواہشات یا ضروریات کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے اور ان کے استعمال میں ثواب کی نیت مفقود ہوتی ہے اس لیے اس عمل کو بدعت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

- کیا **عید میلاد النبی ﷺ کا تہوار** منانا بدعت ہے؟ عید میلاد النبی ﷺ کا تہوار کا عمل ثواب کی نیت کا متقاضی ہے؛ اور اس کا جواز حب رسول ﷺ ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی موجود تھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے زیادہ مستحق تھے؛ مگر سنت یا احادیث اس تہوار کے تذکرہ سے خالی ہے، جس وجہ سے اس عمل کا بدعت ہونا واضح ہے۔ مزید بر آں اس بدعت کی حکومتی سطح پر بھی **تشہیر، ترغیب اور دعوت** دی جاتی ہے؛ جو کہ قطعی طور پر ایک کھلی گمراہی ہے۔
- کیا **تبلیغی اجتماع** سنت پر مبنی ہے؟ حج کے بعد تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماع کا شمار امت مسلمہ کے سب سے بڑے اجتماعات میں ہوتا ہے؛ مگر یہ کثرت تعداد اس کے جواز کی دلیل نہیں ہو سکتی اور عید میلاد النبی ﷺ کی طرح یہ اجتماع بھی اپنے جواز کے لیے قرآن وحدیث کے دلائل کا محتاج ہے۔ تبلیغی اجتماع کے مقاصد اللہ پر یقین؛ اعمال کی ترغیب اور نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچانے کا ذریعہ بیان کیے جاتے ہیں۔ ان تمام مقاصد کا جواز رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی زندگی میں موجود تھا اور دین اسلام میں انہی مقاصد کے حصول کے لیے امت میں جمعہ؛ عیدین؛ حج اور اقدامی جہاد کے اجتماعات کی سنت موجود ہونے کے باوجود اس مخصوص اجتماعی عمل کے ذکر سے سنت رسول ﷺ و آثار صحابہ رضی اللہ عنہم خالی ہیں۔ خصوصاً اس بدعت کے نامعلوم اجر وثواب کے ذریعے اس کی **تشہیر، ترغیب اور دعوت** دی جاتی ہے؛ جو کہ قطعی طور پر ایک کھلی گمراہی ہے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

عبادت اور عبادات کی حقیقت

وَمَا خَلَقْتُ ٱلْجِنَّ وَٱلْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ [سورۃ الذاریات؛۵۶]

اور میں نے جن اور انسان کو بنایا ہے تو صرف اپنی بندگی کے لیے

اللہ تعالٰی نے قرآن حکیم میں انتہائی واضح اور واشگاف الفاظ میں جن اور انسان کی تخلیق کا واحد مقصد اپنی عبادت قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس مقصد کا اثبات ہر اس شخص کے شعور میں موجود ہے جس کی فطرت گناہوں سے مسخ نہیں ہو چکی، مگر اکثریت کے نزدیک اس مقصد تخلیق کا عملی مظہر محض کچھ عبادات [یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج] کی ادائیگی کے مترادف ہے؛ اور عمومی ردعمل کے طور پر ان عبادات کی ادائیگی کے بعد ایک عام مسلمان اپنے آپ کو دینی ذمہ داریوں سے بری ذمہ سمجھتا ہے۔ چونکہ اکثریت کے نزدیک ان عبادات کی حیثیت محض اللہ کے ایک نافذ شدہ حکم کی تکمیل کی سی ہے، نہ کہ اپنی کسی ذاتی ضرورت کی تکمیل کا احساس، اسی لیے ان عبادات کی روح، ان کی اصل حقیقت، ان عبادات کے حسن اور اپنی ذات پر ان عبادات کے دیرپا اثرات سے عمومی طور پر محروم رہتے ہیں۔

اللہ سبحان و تعالٰی کی کبریائی اور پاکی اس بات سے انتہائی بعید ہے کہ وہ ہماری کسی عبادت کا محتاج ہو اور جس ہستی کا قانون اس کائنات کے ذرہ ذرہ پر بلا شرکت غیر نافذ ہو، اس سے یہ عامی خیال رکھنا کہ عام بادشاہوں کی طرح اپنے غلاموں پر ان عبادات [یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج] کی تنفیذ سے [نعوذ باللہ من ذالك] اس کی انانیت کی تسکین ہوتی ہو، اس کی شان کے انتہائی منافی ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ سبحان تعالٰی نے انسان کو اس مقصد تخلیق یعنی "اپنی ہمہ وقت عبادت" کے حصول کا مکلف تو ضرور ٹھہرایا، مگر چونکہ اس مقصد تخلیق کے حصول کے ذرائع کے ادراک، ان کی ہیئت کے تعین

اور اعمال میں تفاوت کا لحاظ کرنے سے انسان روحانی و عقلی طور پر قاصر تھا، اسی لیے اللہ سبحان تعالیٰ نے زندگی کے ہر معاملے میں اپنے رسول ﷺ کے اسوۃ کو ہر مؤمن مسلمان کے لیے واحد معیار قرار دے دیا۔

رسول اللہ ﷺ کی سنت مطہرہ کو اپنانے کے لیے انسانی فطرت میں تین صفات کی حیثیت لازم وملزوم کی سی ہے؛ **طہارت**؛ **تزکیہ نفس** اور **ایمان کی بنیاد پر اطاعت کاملہ**، اور انہی تین لوازم خصوصی کے حصول کے لیے اللہ سبحان و تعالیٰ نے اپنی خصوصی رحمت کے سبب چند فی نفسہ عظیم عبادات [یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج] کو اپنے آپ سے منصوب کرتے ہوئے، انفرادی سطح پر ہر مسلمان پر فرض کی حیثیت سے نافذ کیا۔ یعنی "احسان در احسان" [سبحان اللہ و بحمدہ کثیرا]

أ. **طہارت؛** شیطان ظاہری اور باطنی نجاست کا پیروکار اور داعی ہے، جبکہ نماز ظاہری اور باطنی طہارت کے حصول کا سب سے بہترین اور اکسیر ذریعہ ہے۔ ظاہر میں یہ انسان کو جسمانی اور ماحولیاتی پاکی اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے اور باطن میں اس کو فاحشہ اور منکر کی نجاست اختیار کرنے سے روکنے کا سبب ہے؛

ان ظاہری اور باطنی اثرات [یعنی فواحش اور منکرات سے طہارت] کا حصول ہی اس عبادت یعنی "نماز" کا اصل اور مطلوب جوہر ہے؛ ان ظاہری اور باطنی اثرات پر مشتمل دنیاوی فوائد سے محروم "نماز" محض ایک ایسے فرض کی ادائیگی ہے جس کے اخروی فوائد پر کوئی دلیل قرآن وحدیث میں موجود نہیں۔

ب. **تزکیہ نفس؛** اس دنیا میں شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار انسان کی ضروریات، خواہشات اور شہوات کو مزین کرکے اللہ کی نافرمانی پر مجبور کرنا ہے اور چونکہ انسان کی ضروریات، خواہشات اور شہوات کا تعلق جان ومال دونوں سے ہے، اسی لیے روزہ اور زکوٰۃ کے ذریعے تزکیہ نفس فرض کیا گیا۔

اگر "زکوٰۃ" کی ادائیگی کے ذریعے زکوۃ دہندہ کے دل سے مال کی محبت کم نہیں ہو سکی اور دین کی عزت، تشہیر اور غلبہ کے لیے اپنے مال کے استعمال کی راہ ہموار نہ ہوئی، تو اس "زکوۃ" کی حیثیت محض دنیا میں بخیل کے مال میں سے وصول کنندہ کے حق کا حصول ہے اور اپنے اخروی فوائد کے لیے یہ "زکوۃ" اسی طرح دلیل کی محتاج ہے، جیسے کہ وہ "روزہ" جو روزہ دار کو اس تقویٰ کے وصف سے مزین نہ کر سکے جس کے نتیجہ میں وہ روزہ دار

گناہوں سے بچنے کی کوشش اور دین میں مستقل آگے بڑھنے کی کوشش میں جسمانی تکالیف برداشت کرنے کے قابل ہوسکے۔

ت. **ایمان کی بنیاد پر اطاعت کاملہ؛** معتبر ایمان کی بنیاد یقین ہے نہ کہ مشاہدات اور عقلی دلائل، جبکہ شیطان کا آخری ہتھیار اللہ کے احکامات کے مقابلے میں عقل کا بے جا استعمال ہے، جس کی بیخ کنی کرنے کے لیے حج فرض کیا گیا۔ حج کے ارکان پر ایک گہری نظر ڈالیں [وقوف منٰی، وقوف عرفات، وقوف مزدلفہ، رمی، طواف، سعی]، کُل کا کُل حج محض ایک ایسی کامل اطاعت کا مظہر ہے، جو کسی عقلی دلیل کی تابع نہیں اور اس کامل اطاعت کا مطمع نظر محض ایمان کی بنیاد پر اپنے رب کی خوشنودی کا حصول ہے۔

اگر فرض کردہ عبادات سے ان تینوں لوازمات کا حصول سست روی کا شکار ہو، تو ہر فرض عبادت کے ساتھ نفلی عبادات کا اضافہ انتہائی سود مند ہے؛ جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے واضح ہے؛

✓ ۔۔۔۔اور میرا بندہ میری **فرض** کی ہوئی چیزوں کے ذریعہ **میرا قرب** حاصل کرتا ہے اور میرا بندہ ہمیشہ **نوافل** کے ذریعے مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں **اس سے محبت** کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔۔۔۔ [**صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ دل کو نرم کرنے والی باتوں کا بیان۔ حدیث ۱۴۴۹**]

خصوصاً ان اوقات اور ایام میں جن کو قرآن اور حدیث میں نفلی عبادات کے لیے افضل قرار دیا گیا ہے۔ ان اوقات اور ایام کی افضلیت کا سبب محض اجر و ثواب سے منسلک نہیں ہے؛ بلکہ ان بابرکت اوقات اور ایام کی اصل فضلیت کا سبب اللہ کی اس محبت کثیر کے حصول کو ممکن کرنا ہے جس کے باعث انسان مہینوں کی ریاضت کا نتیجہ کم وقت میں اپنے نفس میں پا سکتا ہے۔

مثلاً سنت مؤکدہ، تہجد، اشراق، چاشت، اوابین، تحیت المسجد، تحیت الوضو اور بالخصوص لیلتہ القدر کی نفلی نمازیں "طہارت" کے حصول کے لیے؛ شعبان و شوال، ایام ابیض، پیر اور جمعرات، یوم عاشورہ اور عرفہ کے

نفلی روزے "تقوی کی شکل میں تزکیہ نفس" کے حصول کے لیے؛ رمضان، ذوالحج کے پہلے دس دن، پوشیدہ مواقع اور حالت ایثار میں نفلی صدقہ و خیرات اور بے غرض تحفے تحائف "مال سے محبت میں کمی کی شکل میں تزکیہ نفس" کے حصول کے لیے؛ رمضان اور رجب میں نفلی عمرے "ایمان کی بنیاد پر اطاعت کاملہ" کے حصول کے لیے۔

اب جب اِن تینوں لوازم کو جمع کر لیں یعنی **طہارت**، **تزکیہ نفس** اور **ایمان کی بنیاد پر اطاعت کاملہ**، تو دین میں فرضوں، سنتوں، مستحبات، مکروہات اور محرمات کی بحث فقط "**امر**" و "**نہی**" کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کے نتیجہ میں محض کسی مستحب عمل سے کوتاہی یا کسی مکروہ فعل کا ارتکاب ہی نفس لوامہ کی ملامت کا سبب بن جاتا ہے۔

ان عبادات [یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج] کا جوہر، اس "**ہمہ وقت عبادت**" کی بنیاد ہے جو ہم سے اس دنیا میں مطلوب ہے اور جس کے ہم مکلف ہیں۔ وہ "**ہمہ وقت عبادت**" جس میں جہاد بھی ہے، ہجرت بھی ہے، دینی علوم کا حصول بھی ہے، بلاخوف و خطر کُل دین کی اشاعت و تبلیغ بھی ہے اور سب سے اوپر انفرادی، باہمی اور اجتماعی طور پر نفاذ دین بھی ہے۔ اور جب تک ہم ان عبادات کو ہی کل دین سمجھتے رہیں گے، ہم اصل "عبادت" کے ثمرات سے انفرادی طور پر بھی محروم رہیں گے اور اجتماعی طور پر بھی۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی اٰلہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

تقدیر کی حقیقت

کیا عصر حاضر میں عقیدہ تقدیر کی کوئی خصوصی اہمیت ہے؟

یہ دنیا دار الامتحان ہے اور اللہ سبحان و تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ "کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی **آزمائش** نہیں کی جائے گی"[سورة العنکبوت؛ ۲]۔

جدید الحادی اور مادّیّت پرست افکار کی غلامی سے پہلے، ہماری اکثریت کے لیے عقیدہ تقدیر اس یقین اور اطمینان کی بنیاد تھا، جو کسی بھی دنیاوی **آزمائش** پر ایک مسلمان سے قرآن و حدیث میں مطلوب مندرجہ ذیل رویہ کا ضامن تھا؛

- آزمائش سے پہلے؛ اللہ پر توکل اور اس کی رحمت کی امید اور اس کی آزمائش سے عافیت کا سوال۔
- آزمائش کے دوران؛ صبر اور اللہ سے اس آزمائش پر اجر کی امید۔
- آزمائش کے بعد؛ اللہ تعالیٰ کا شکر اور اس کے حضور عاجزانہ رویہ میں اضافہ۔

جب کہ اس کے برعکس، عصر حاضر میں ہماری اکثریت کے عقیدہ تقدیر پر ایمان کی کمزوری اور الحادی اور مادّیّت پرست افکار پر مبنی جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے "ظنّی علم" پر ایمان ہونے کے باعث، کسی بھی دنیاوی **آزمائش** میں مندرجہ ذیل رویہ ہے؛

- آزمائش سے پہلے؛ جائز و ناجائز حفاظتی تدابیر کی بھرمار؛ دین کے بجائے دنیا کی حفاظت کی کوشش؛ ایمان جانے سے زیادہ جان جانے کا خوف۔

- آزمائش کے دوران؛ اللہ کے ساتھ شکوہ شکایت؛ اپنے اوپر لعن طعن؛ "کاش" اور "اگر" والی ذہنیت کا استعمال۔
- آزمائش کے بعد؛ اپنی حفاظتی تدابیر کے اختیار پر شکر اور دینی معاملات میں آزمائش سے پہلے والے عملی رویے۔

"ایمان" علم کا نہیں بلکہ عمل کا نام ہے۔ جیسے کرونا وائرس کے خوف نے ہماری خواتین کی اکثریت کو وہ "نقاب" جو قرآن اور حدیث اپنے "یقینی علم" کی بنیاد پر نہ کرواسکا، وہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے "ظنّی علم" نے ان کے لیے عمل کی کیفیت اختیار کرلی اور اسی کو ایمان کہتے ہیں۔

تقدیر کیا ہے؟

تقدیر کا تعلق ہمارے ایمانیات کے بنیادی عقائد میں سے ہے اور اس کا خصوصی تعلق ان مباحث سے ہے، جن پر ایمان لانا تو لازم مگر باہمی بحث سے سختی سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس کا انکار کرنے والے کو رسول اللہ ﷺ نے امت کا مجوسی قرار دیا اور اس کی نماز جنازہ کی ادائیگی تک کو ممنوع قرار دیا۔

تقدیر کا تعلق اپنی اصل میں اللہ کی صفت "علم" سے ہے، جو قدیم، نا قابل تبدیل و تغیر اور ہر قسم کی غلطی و نسیان سے پاک ہے۔ [سبحان الله عما يصفون] اور اسی لیے تقدیر کو نہ ماننا، اللہ سبحان و تعالیٰ کی صفت "علم" کی نفی ہے [نعوذ بالله من ذالك]۔

اگر تقدیر اللہ کا علم ہے اور نا قابل تغیر ہے، تو انسان کا اس تقدیر میں کیا مقام ہے؟

اس سوال کے اصل جواب سے پہلے ہمیں تقدیر کے ان چار درجات کو سمجھنا ہو گا جو قرآن اور حدیث سے ثابت ہیں؛

اَ. درجہ اول؛ ازل میں اللہ سبحان و تعالیٰ کا ارادہ اور فیصلہ کہ اس تفصیل اور ترتیب کے مطابق جو میرے علم میں ہے، میں عالم کو پیدا کروں گا اور اس میں یہ یہ واقعات پیش آئیں گے۔

ب. درجہ دوم؛ تقدیر کے درجہ اول کی پہلی ظاہری شکل میں اللہ تعالٰی نے اس کائنات کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے تقدیر لکھ دی جب کہ صرف عرش اور پانی موجود تھا۔

ت. درجہ سوم؛ ماں کے پیٹ میں جب فرشتہ انسان کی مدت حیات، اعمال، رزق اور شقاوت یا سعادت لکھتا ہے۔

ث. درجہ چہارم؛ پھر انسان جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالٰی ہی کے اذن سے وہ اس کو کرتا ہے۔

- تقدیر کا پہلا درجہ اللہ کے علم پر مبنی ہے، جو اس کی مخلوق کی کل جزئیات پر محیط ہے، حتٰی کہ کسی مخلوق کے ذہن میں پیدا ہونے والا خیال بھی اس درجہ کی تقدیر سے باہر نہیں ہے، مگر یہ درجہ اللہ تعالٰی کی ذاتی صفت "علم" پر مبنی ہونے کے باعث اس کی ہر قسم کی مخلوق سے مخفی ہے۔
- تقدیر کے دوسرے درجہ کا تعلق اللہ کے اس جزوی علم سے ہے جو اپنی ظاہری شکل میں اس نے لوح محفوظ میں رقم کر دیا اور یہی وہ جزوی علم ہے جو ملاء اعلٰی پر ظاہر ہے اور کل فرشتے اسی تقدیر کے نفاذ پر مامور ہیں۔ گویا یہ درجہ اول کی عملی شکل ہے اور اس تقدیر کا تعلق عمومی نوعیت کی فطرت خارجیہ [مثلاً آغاز تخلیق، زمینی و آسمانی آفات و مصائب کا نزول، قوموں کے عروج و زوال یا ارتفاقی[4] حالات وغیرہ] سے ہے۔

جس کی دلیل اللہ تعالٰی اور فرشتوں کا [سورۃ البقرۃ؛ ۳۰] وہ مکالمہ ہے جس میں جب اللہ تعالٰی نے اس زمین پر انسان کو خلافت دینے کا ارادہ ظاہر کیا، تو فرشتوں نے اسی تقدیر کے ظاہری علم کی بنیاد پر اللہ تعالٰی کے سامنے انسانوں کے عمومی مخاصمانہ رویّوں کا ذکر کیا، تو اللہ تعالٰی نے تقدیر کے پہلے درجہ یعنی اپنے علم کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں جانتا ہوں اور تم نہیں جانتے۔ اس درجہ کی تقدیر میں بھی تبدیلی و تغیر ناممکن ہے اور یہی وہ درجہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ میری سنت نہ تبدیل ہوتی ہے اور نہ اس میں تغیر آتا ہے۔

---

[4] ارتفاقات؛ باہم رفاقت کے لوازم، کسی قوم کے تمدن و تہذیبی امور و معاملات

- **تیسرے درجہ کی تقدیر** جس کا تعلق انسان کے ساتھ انفرادی سطح پر ہے، اس کا تعلق اس علم سے ہے جو اس امر پر مامور مخصوص فرشتے درجہ دوم کی تقدیر یعنی اس مخصوص انسان کا احاطہ کرنے والے عمومی نوعیت کی فطرت خارجیہ اور اس کی ممکنہ ذہنی و جسمانی صلاحیتوں سے اخذ کرتے ہیں۔ یہی تقدیر عالم دنیا میں ظاہر ہونے سے پہلے عالم مثال[5] میں ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور اسی عالم مثال میں اللہ تعالیٰ کے "یَمۡحُوا" اور "یُثۡبِتُ" کے قانون کے نفاذ ہونے کے باعث قابل تغیر ہے اور اس تغیر کی بنیاد انسان کے وہ باطنی یا روحانی فیصلے ہیں جو دوسری اور تیسری تقدیر کے علمی درجہ سے ماوراہیں۔

مثلاً جیسا کہ احادیث میں واضح ہے کہ صدقہ رزق میں اضافہ کا باعث ہے، صلح رحمی اور نیک اعمال عمر میں اضافہ کا باعث ہیں، حتّٰی کہ **سعادت اور شقاوت** بھی، اگر اس درجہ کی تقدیر میں قطعی اور ناقابل تغیر ہوتے، تو بنی اسرائیل کے سو [۱۰۰] اشخاص کے قاتل کی موت پر، عذاب اور رحمت کے فرشتے باہم جھگڑا نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ زمین کو سکڑنے کا حکم بھی صادر نہ فرماتے۔

- **چوتھے درجہ کی تقدیر** کا تعلق بھی انسان کے ساتھ انفرادی سطح پر ہے اور یہ **درجہ سوم کی تقدیر کی عملی شکل** ہے، انسان کے نیک یا بد مصمم ارادہ اور فیصلہ کا خارج میں ظاہر ہونا اور پایہ تکمیل تک پہنچنا یا خارج میں اس پر مصائب و آلام یا نعمتوں اور آسائشوں کا ظاہری نزول وغیرہ، اسی درجہ کی تقدیر کا خاصہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ تقدیر کا درجہ اول اللہ کے **علم** پر مبنی ہے اور درجہ سوم فرشتوں کے **استنباط شدہ علم** پر مبنی ہے۔ اس بنیاد پر انسان عمومی و اجتماعی طور پر درجہ دوم کی تقدیر کا اور انفرادی طور پر درجہ چہارم کی تقدیر کا اسیر ہے۔

---

[5] وہ عالم جس میں انسان کے بعض اعمال اور وہ حقائق جن کی کوئی مادی صورت نہیں اور جن کو خالص عقل سے دریافت کیا جاتا ہے، مناسب صورتوں اور مختلف مادی شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہ وہ عالم ہیں کہ جو واقعات اس عالم مادی میں ظہور میں آنے والے ہوتے ہیں وہ اس ظہور سے بیشتر اس عالم میں موجود ہوتے ہیں؛ اسی لیے بعض ملائکہ اور بعض اہل کشف کو قبل از وقوع ان واقعات کا علم ہو جاتا ہے۔

تقدیر میں انسان کی خود مختاری کس نوعیت کی ہے؟

انسان کی کل زندگی تین دائروں پر محیط ہے، شخصی یا انفرادی، باہمی اور اجتماعی۔

گو تقدیر کا عملی تعلق ان تینوں دائروں سے ہے، مگر علمی سطح پر اس کے اصل مخاطب انفرادی اور اجتماعی دائرے ہیں۔ اجتماعی دائروں کے فیصلے درجہ دوم کی تقدیر کے تابع ہیں اور **ناقابل تبدیل اور تغیر** ہیں۔ انسان کے شخصی دائرہ پر جتنا زیادہ اجتماعی دائرہ کا اثر ہو گا اتنا ہی وہ بے اختیار اور درجہ دوم کی تقدیر کے تابع ہو گا۔ اس کے بر خلاف جو شخص اپنی انفرادیت کا علمبر دار ہو گا، وہ اتنا ہی اپنے ارادوں اور اعمال میں خود مختار ہو گا۔

> مثلاً، ایک امت پر عذاب کا فیصلہ درجہ دوم کی تقدیر کے تابع ہے مگر انفرادی سطح پر اس کا اجرا صرف ان اشخاص پر ہو گا جن کی شخصیت ان اجتماعی عوامل کے ہم رنگ ہو گی جو باعث عذاب ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے کفار کی مشابہت سے منع فرمایا۔ اسی طرح ایک شخص جو اپنے معمول کے عمومی حالات میں، ایک صالح معاشرہ میں، اپنے ظاہری نیک اعمال کے باعث، بظاہر جنت سے صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہو گا مگر جب تقدیر میں درج شدہ کوئی انفرادی فتنہ اس کو در پیش ہوا تو کسی باطنی بیماری [مثلاً شک، نفاق، بدعقائد، ماسوا اللہ کی محبت وغیرہ] کے باعث وہ ایمان سے خارج ہو کر جہنم رسید ہو گیا۔

انسان ظاہر میں جتنا فطرت خارجیہ کے عوامل کے سامنے بے اختیار ہے اتنا ہی باطنی طور پر ان خارجی عوامل میں صحیح یا غلط فیصلہ کرنے میں خود مختار ہے، مگر اس صحیح یا غلط فیصلہ کا خارج میں عملی شکل اختیار کرنا بھی اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

تو کیا میں صرف باطنی فیصلوں کا مکلف ہوں، ظاہری اعمال کا نہیں؟

ہر ظاہری عمل کا آغاز محض ایک خیال سے شروع ہوتا ہے جو انسان کے مصمم ارادہ میں تبدیل ہو کر، اس عمل کی نیت قرار پاتا ہے اور جس طرح حدیث کے مطابق کسی خواب کے تین ہی محرک ہوتے ہیں؛ اسی طرح ہر خیال جو کسی ظاہری عمل کی صورت میں منتجہ ہوتا ہے اس کے بھی تین ہی محرکات ہیں؛ یعنی اللہ سبحان وتعالیٰ کی طرف سے یا شیطان مردود کی طرف سے یا "ھوی" [<۱>میلان، محبت، عشق، (خیر وشر دونوں میں) <۲>خواہش نفس <۳>خواہش مند طبیعت] کے باعث۔

ہر نیک خیال اپنے آغاز میں اللہ سبحان و تعالٰی کی طرف سے خیر کی ایک پکار ہے؛ ۔۔۔۔۔اور خدا اپنی مہربانی سے بہشت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے۔ اور اپنے **حکم لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے** تاکہ نصیحت حاصل کریں۔ [سورة البقرة ؛ ۲۲۱]

اور ہم کسی نیکی کی نیت ہی نہیں کر سکتے یہاں تک اللہ سبحان و تعالٰی ہمارے نفس میں اس کا خیال پیدا فرما کر ہماری توجہ اس کی طرف مرکوز فرمائیں؛ انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں کتنے ہی نیکی کے مواقع سے گزرتا ہے مگر بے توجہی کے باعث ان اعمال کی ادائیگی سے محروم رہتا ہے۔ اور تم **کچھ بھی نہیں چاہ سکتے** مگر جو خدا کو منظور ہو۔ بے شک خدا جاننے والا حکمت والا ہے [سورة الانسان ؛ ۳۰]

اور اسی طرح ہر بد خیال آغاز میں شیطان مردود کی دعوت کا نتیجہ ہے؛ جب (حساب کتاب کا) کام فیصلہ ہو چکے گا تو شیطان کہے گا (جو) وعدہ خدا نے تم سے کیا تھا (وہ تو) سچا (تھا) اور (جو) وعدہ میں نے تم سے کیا تھا وہ جھوٹا تھا۔ اور میرا تم پر کسی طرح کا زور نہیں تھا۔ **ہاں میں نے تم کو (گمراہی اور باطل کی طرف) بلایا تو تم نے (جلدی سے اور بے دلیل) میرا کہا مان لیا**۔ تو (آج) مجھے ملامت نہ کرو۔ اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔۔۔۔۔[سورة ابراهيم ؛ ۲۲]

ان خیالات کی بنیاد پر قائم ہونے والے ہر مصمم فیصلہ کے نتیجہ میں ہمارے نفس کو نیکی یا بدی کے ساتھ ایک خاص انسیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی انسیت اس اہم ترین تیسرے محرک یعنی "ھوی" کا باعث ہے، جو مزید ارادوں یا فیصلوں کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اگر انسان کی "ھوی" نیکی کی خوگر ہو جائے، تو نہ صرف نفس کے لیے نیک اعمال کی ادائیگی آسان ہو جاتی ہے بلکہ اپنے انفرادی، باہمی اور اجتماعی دینی و دنیاوی معاملات میں نیکی کی پہچان بھی۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ "تو جس نے دیا اور پرہیزگاری کی اور نیک بات کو سچ جانا اس کو ہم **آسان راستے** کی توفیق دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا اسے **سختی** میں پہنچائیں گے"۔ [سورة الليل ؛ ۵] اور بعینہ جس انسان کے نفس کو بدی سے انسیت ہو جائے تو اس کی "ھوی" ہی اس کے لیے امام کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ "کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے **خواہش نفس** کو معبود بنا رکھا ہے تو کیا تم اس پر نگہبان ہو سکتے ہو۔" [سورة الفرقان ؛ ۴۳]

ہر نیک اور بد خیال اپنی ظاہری شکل میں، اعمال کی صورت میں، عالم مثال میں موجود ہے، مگر عالم مثال سے عالم دنیامیں اعمال کا منتقل ہونا اللہ کے اذن کے بغیر ممکن نہیں ہے، اسی لیے اگر تقدیر میں اس ظاہری عمل کا وقوع پذیر ہونا مقدر ہے تو وہ واقع ہو جائے گا ورنہ نہیں؛ مگر دونوں صورتوں میں فاعل کے لیے جزا یا سزا ثابت ہو جائے گی۔

تقدیر، کسی ایسے جامد راستے کا نام نہیں کہ جو انسان کو پیدائش سے لے کر ناک کی سیدھ میں قبر تک پہنچا دے، بلکہ قرآن حکیم کے مطابق انسانی زندگی تین مختلف راستوں کا مجموعہ ہے اور ہر راستہ عالم مثال میں اپنے منطقی انجام سے منسلک نیک یا بد اعمال پر مشتمل ہے۔ اسی لیے ہر مسلمان دن میں کم از کم سترہ بار اللہ تعالیٰ سے "الصراط المستقیم" کی دعا اور دو گمراہ راستوں سے پناہ طلب کرتا ہے۔ ہمارے شعوری فیصلے کی نتیجے میں اور تقدیر کے موافق، ہمارے منتخب شدہ راستے سے منسلک نیک یا بد اعمال کا عالم مثال سے عالم دنیا میں ظہور شروع ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ معراج کی رات جب رسول اللہ ﷺ نے شراب کے پیالے کو چھوڑ کر دودھ کا پیالہ منتخب فرمایا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اسی لیے فرمایا کہ اگر آپ شراب [کا پیالہ] لے لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی [سنن نسائی ۔ جلد سوم ۔ کتاب الاشربۃ ۔ حدیث ۱۹۶۷]۔ اور اس فرمان کی بنیاد علم غیب نہیں، بلکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سامنے درجہ دوم کی تقدیر اپنے تمام تر ممکنہ عمومی راستوں اور ان کے منطقی نتائج کے ساتھ واضح تھی۔

کیا میری حفاظتی تدابیر، تقدیر پر اثر انداز ہو سکتیں ہیں؟

رسول اللہ ﷺ کے مطابق، ہماری ہر وہ تدبیر جو عملی شکل میں وقوع پذیر ہوتی ہے وہ تقدیر کا ہی حصہ ہوتی ہے؛

- ✓ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ یہ **مرقیہ** جن سے ہم دم کرتے ہیں اور یہ **دوائیں** جن سے ہم علاج کرتے ہیں اور یہ **بچاؤ کی چیزیں** جن سے ہم ضرب سے بچتے ہیں کیا یہ **اللہ کی تقدیر کو ٹال سکتی** ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ بھی تقدیر الٰہی میں سے ہے"۔ [جامع ترمذی ۔ جلد اول ۔ طب کا بیان ۔ حدیث ۲۱۴۰]

ایمان کا بلند ترین درجہ حفاظتی تدابیر سے بالاتر ہو کر محض اللہ سبحان و تعالیٰ پر خالص توکل اور اپنی تقدیر پر کلی رضامندی ہے؛ مگر یہ درجہ اللہ تعالیٰ کا "ربط قلوب" کی صورت میں انعام یافتہ اصحاب کا خاصہ ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بی بی ہاجرہ علیہا السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو لق ودق صحرا میں تن تنہا چھوڑ دینا یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریائے نیل کے حوالے کر دینا، یا اصحاب کہف اور اصحاب الاخدود کی استقامت وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ ہمارا خالق ومالک ہے اور ہمارے نفس کے اندر چھپے ہوئے خیالات کو بھی جانتا ہے، اسی لیے یہ درجہ ہر مومن مسلمان سے مطلوب نہیں ہے اور اسی لیے ہر وہ حفاظتی تدبیر جو انسان اپنے کسی نقصان کے حقیقی اندیشہ کے رفع کے لیے یا کسی حقیقی اور جائز نفع کے حصول کے لیے اختیار کرے، وہ اللہ پر توکل اور اپنی تقدیر پر کلی رضامندی کے منافی نہیں ہے، بلکہ عام مسلمانوں سے انہی جائز تدابیر کا حصول مطلوب ہے، کیونکہ یہ ان ہی کے ایمان کی حفاظت کا باعث بنتیں ہیں اور ایک عام مسلمان اس شک کی کیفیت سے اپنے آپ کو بری کر لیتا ہے، جو اس تدبیر کے اختیار نہ کرنے کے باعث، اس کی ایمان میں کمی کا باعث بنتی۔

ہر وہ تدبیر یا مصلحت، جو **کسی حقیقی نہیں بلکہ غیبی امر کے خوف کا نتیجہ** میں اختیار کی جائے اور اس سے دین کے کسی بھی مسلّمہ عقیدہ کی **نفی** ثابت ہو رہی ہو تو وہ ناجائز ہے اور اگر عقیدہ کے **اخفا** یا اس پر **ایمان میں کمی** کا باعث بنے تو اس کی اجازت کسی نقلی دلیل کی محتاج ہے ورنہ اس کا مقاصد شریعت [یعنی بالترتیب دین؛ انسانی جان؛ نسل؛ عزت؛ عقل اور مال] کے تابع ہونا لازم ہے۔

ناجائز تدابیر اور مصلحتوں کا اختیار کرنا کسی بھی مؤمن کی شان کے منافی ہے کیونکہ قرآن حکیم میں دنیا اور آخرت کے حوالے سے مومن کی شان ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ ان پر نہ خوف کی کیفیت ہو گی [جو انہیں ناجائز تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کرے گی] اور نہ [ہی جائز تدابیر کے اختیار کرنے کے بعد تقدیر کے کسی فیصلے پر] غم کی کیفیت طاری ہو گی۔

- ✓ "جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ [اس پر] قائم رہے تو ان کو نہ کچھ **خوف** ہو گا اور نہ وہ **غمناک** ہوں گے" [سورة الحقاف؛ ۱۳]۔

عصر حاضر میں اس کی بہترین مثال "کروناوائرس" سے بچاؤ کی تدابیر ہیں؛ان تدابیر میں سے جائز تدابیر فقط وہ ہیں جن کا احادیث میں ذکر ہے یعنی، حقیقی ظاہری مریض سے فاصلہ رکھنا، حقیقی ظاہری مریض سے میل جول سے ممانعت یا جس گاوں، قصبے یا شہر میں حقیقی ظاہری وبا پھوٹ پڑے اس جگہ سے خروج یا دخول کی ممانعت۔ ان تدابیر کا اختیار کرنا بھی محض اپنے ایمان کو شک کی کیفیت سے محفوظ رکھنے کے لیے ہے، ورنہ اصل حقیقت تو اب بھی وہی ہے، جو کم وبیش ترپن[۵۳] احادیث میں بیان شدہ ہے کہ کوئی بیماری متعدی نہیں ہوتی۔

دین میں حفاظتی تدابیر کے مقام کے لیے "رخصت اور حفاظتی تدبیر کی حقیقت" کے مضمون کا مطالعہ فرمائیں۔

دعا کیسے تقدیر بدل سکتی ہے؟

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ صرف دعا ہی تقدیر کو بدل سکتی ہے۔ گویہ ہتھیار سب کے لیے عام ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مظلوم کافر کی دعا بھی اللہ کے ہاں مقبول ہے، مگر مومن کے لیے یہ خاص الخاص ہتھیار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا کو عبادت کا مغز قرار دیاہے اور قرآن حکیم نے تو دعا کو عین عبادت ٹھہرایاہے۔ آخر دعا میں وہ کیا خاص بات ہے جس نے اس کی اہمیت اتنی بڑھادی ہے اور آخر وہ کون سی تقدیر بدل سکتی ہے۔

اللہ سبحان وتعالیٰ شر کا خالق نہیں ہے، اس کائنات میں مروجّہ تمام شرور کی بنیاد صرف اللہ سبحان وتعالیٰ سے علمی یا عملی دوری ہے، اسی لیے شر کی تمام اقسام کی نسبت اس کی مخلوق کی طرف ہے۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے، اسی لیے فطرت خارجیہ کے ہر امر کی حیثیت فتنہ کی سی ہے، جو انسان کے لیے تقدیر میں رقم ہے۔ چاہے اس فتنہ میں دنیاوی نعمتوں کا پہلو واضح ہو یا دنیاوی زحمتوں کا، مگر دونوں صورتوں میں کم یا زیادہ اس شر کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ [خصوصاً دنیاوی نعمتوں میں اس شر کا پہلو ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے]

دعا کی قبولیت کے تین مدارج تو عرف عام ہیں یعنی، بعینہ دعا قبول ہو جائے یا کوئی آنے والی مصیبت ٹل جائے یا اس دعا کو آخرت کے لیے ذخیرہ کرلیا جائے۔ مگر میرے نزدیک دعا کی اصل اہمیت، اس کا عین عبادت اور عبادت کا مغز قرار ہونے کا سب سے اہم سبب ہمارے لیے مقدر کردہ فتنوں اور آزمائشوں میں موجود شر

سے حفاظت ہے۔اس کی دلیل بلا مبالغہ وہ سینکڑوں دعائیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے زندگی کے ہر چھوٹے بڑے پہلو کے متعلق منقول ہیں۔

اسی لیے میرے نزدیک عرف عام کے تین مدارج کے علاوہ دعا کے تین اور مدارج بھی ہیں؛

- **دعا**؛ہمارے لیے مقدر کردہ فتنوں اور آزمائشوں میں موجود شر سے ہماری حفاظت کرتی ہے۔
- **دعا**؛وہ حصار مہیا کرتی ہے، جس کہ سائے میں ہم ان مصیبتوں سے بھی محفوظ رہتے ہیں جو اجتماعی بداعمالیوں کی وجہ سے قوموں کا مقدر ہو جاتی ہیں۔
- **دعا**؛ہمارے باطنی فیصلہ اور ارادہ کی راہ میں، درجہ سوم کی تقدیر میں موجود فطرت خارجیہ کی مشکلات کو دور کرکے، اس فیصلہ اور ارادہ کی عملی شکل کا عالم دنیا میں ظہور آسان بناتی ہے۔

مگر یاد رہے کہ چونکہ دعا بذات خود ایک عبادت بلکہ عبادات کا مغز ہے اسی لیے اس کے ثمرات کے حصول کی بنیاد وہی تین عناصر ہیں جن کا ذکر عبادت اور عبادات کی حقیقت والے مضمون میں کیا گیا ہے؛یعنی **طہارت**؛**تزکیہ نفس** اور **ایمان کی بنیاد پر اطاعت کاملہ**۔اسی لیے ظاہری و باطنی ناپاکی، کسب حرام یا شک والا ایمان موانع قبولیت میں سے ہیں۔ کفار کی دعاؤں کی قبولیت کا تعلق اللہ کے تکوینی امور سے ہے نہ کہ اس کی تشریعی امور سے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی آلہٖ و صحبہٖ و بارك وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

ضروریات دین کی حقیقت

آج کے دور میں جہاں گمراہی چہار سوء پھیل گئی ہے؛علمائے حق یا تو حق کی پاداش میں خاموش کر دیے گئے یا انہوں نے بھی عافیت والا رستہ اپنا لیا اور اپنے آپ کو مدرسوں تک محدود کر لیا ہے اور آج عوام سے ان کا رابطہ فقط ایک پوچھے گئے سوال اور ان کی طرف سے جوابی فتوی کی صورت میں ہے۔ایک عالم جو اپنے آپ کو منبر رسول ﷺ کا وارث قرار دیتا ہے، وہ بھی آج ضروریات دین کے کتنے ہی مسائل پر خاموشی اختیار کرنے کو فروعی معاملات پر اعتدال پسندی کے مترادف گردانتا ہے، جبکہ رسول ﷺ کی سنت تو ان معاملات میں یہ رہی کہ وہ ہر اس مقام پر خود تشریف لے گئے، جہاں عوام کی کثرت ہوتی تھی اور ان معاملات کو کھل کر بیان کیا، جو جہنم کو واجب کرتے تھے؛ چاہے اس کے نتیجہ میں کوئی ایک شخص بھی ایمان نہ لائے۔

آج منبر سے ضروریات دین کو بھی اختلافی امور کی فہرست میں شامل کرتے ہوئے ان سے کنارہ کشی کی پالیسی کے سبب معاشرہ میں ہر باطل عقیدہ؛ قول اور عمل فروغ پا رہا ہے۔

"ضروریات دین" کسے کہتے ہیں؟

چونکہ ایمان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی صداقت پر یقین قلبی کے باعث، ان سے منسوب "خبر، امر یا نہی" کو کسی مشاہدہ یا عقلی دلیل کے بغیر، قبول کرنے کا نام ہے، تو ضروریات دین سے مراد وہ **تمام امور دین** ہیں جن کا دین رسول ﷺ سے ہونا **قطعی اور یقینی** طور پر ثابت ہے اور حد تواتر و شہرت عام تک پہنچ چکا ہے، یعنی "عوام" بھی ان کو ایمان کا جز اور دین رسول اللہ ﷺ جانتے اور مانتے ہیں۔

مندرجہ بالا تعریف میں "عوام" سے مراد معاشرہ کے وہ افراد مراد ہیں، جو کم سے کم اس دینی علم کے حامل ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم" [بحوالہ ابن ماجہ اور بیہقی] "علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے"۔

لہذا ضروریات دین اس "مجموعہ عقائد و اعمال" کا نام ہے جن کا دین ہونا یقینی اور بارگاہ رسالت ﷺ سے ان کا ثبوت قطعی ہے۔ لہذا ایسے تمام امور کا دین ہونا یقینی اور داخل ایمان ہے اور ان پر ایمان لانا فرض ہے۔

ضروریات دین کا تعلق دین کے تینوں شعبوں یعنی ایمانیات؛ عبادات اور معاملات سے ہے؛ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر ضرورت دین پر عمل کرنا بھی ضروری اور فرض ہے؛ اس لیے کہ ضروریات دین میں بہت سے امور شرعاً مستحب اور مباح بھی ہوتے ہیں مگر ان کے مستحب اور مباح ہونے پر ایمان لانا یقیناً فرض اور داخل ایمان ہے اور بطور عناد ان کا انکار کفر ہے۔

کیا کسی واحد ضرورت دین کا منکر کافر ہے؟

اخروی نجات کی لیے لازم ایمان چونکہ عمل قلب ہے اور **دین کے ہر ہر حکم پر عمل کرنے کا پختہ قصد اور التزام** [کسی کام کو اپنے ذمّہ لینا] **ایمان کے لئے لازم ہے** جیسا کہ ایمان مجمل میں بیان کیا گیا ہے ["۔۔۔۔ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِه، اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ" ۔۔۔ اور میں نے اس کے **تمام احکام قبول کیے** اور اس کا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کی]۔ یہ قصد و ارادہ بھی تمام احکام دین پر محیط ایک بسیط [خالص، غیر مرکب] حقیقت ہے؛ اس میں بھی کسی کمی بیشی یا تجزیہ [ہر ایک جز کو الگ الگ کرنا، تقسیم کرنا] کا کوئی امکان نہیں۔ لہذا جو شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار کرتا ہے وہ کافر ہے اور ان لوگوں میں سے ہے جو "کتاب اللہ کے کسی حکم کو مانتے ہیں اور کسی حکم کا انکار کرتے ہیں"۔

یہی وہ نکتہ ہے جس پر آغاز عہد خلافت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہوا؛ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ہر اس شخص سے جنگ کرنے کا اعلان کر دیا جو نماز اور زکوۃ میں تفریق کرتا ہے؛ یعنی نماز کو مانتا ہے مگر زکوٰۃ کو نہیں مانتا یا اس طریقہ ادائیگی میں نہیں مانتا جو رسول اللہ ﷺ سے

ثابت ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مقصد یہی تھا کہ جو شخص پورے دین یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ تمام سنتوں کو ضروریات دین کی حیثیت سے ماننے کے لئے تیار نہیں وہ مومن نہیں؛ کافر اور مباح دم یعنی واجب القتل ہے۔

یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دین کا فہم تھا اور ان کے نزدیک سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بحیثیت ضرورت دین اہمیت اور مقام، جس کے بالمقابل عصر حاضر میں ہمارا دینی فہم ہے کہ سنت تو ایک طرف فرائض سے عملی انکار اور کبائر کا علی اعلان ارتکاب بھی ہمیں مسلمانی کے درجہ سے نہیں گرا سکتا۔ بہر کیف ضروریات دین کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں، باقی مثالیں آپ خود قیاس کر سکتے ہیں؛

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کا اعتقاد فرض ہے؛ اور اس سے انکار یعنی اس کو نہ ماننا یا نہ جاننا کفر ہے۔
- پنج گانہ نماز پڑھنا فرض ہے؛ اس کے فرض ہونے کا اعتقاد بھی فرض ہے؛ اور نماز سیکھنا بھی فرض ہے۔ اور نماز سے انکار یعنی اس کو نہ ماننا یا نہ جاننا کفر ہے۔
- اقدامی اور دفاعی جہاد فی سبیل اللہ فرض ہے؛ اس کے فرض ہونے کا اعتقاد بھی فرض ہے اور جہاد سے انکار یعنی اس کو نہ ماننا یا نہ جاننا کفر ہے اور اس کی ادائیگی کی نیت نہ رکھنا نفاق ہے۔
- باجماعت نماز پڑھنا؛ جن اہل علم کے نزدیک یہ ضرورت دین فرض کے درجہ میں ہے تو بغیر کسی شرعی عذری کے اس کو ترک کرنا گناہ کبیرہ ہے؛ اور باجماعت نماز کا انکار یعنی اس کو نہ ماننا یا نہ جاننا کفر ہے اور بمطابق حنفیہ چونکہ یہ ضرورت دین واجب ہے؛ اس لیے بغیر کسی شرعی عذر یا باعث جہالت کے اس کو ترک کرنا گناہ کبیرہ ہے؛ مگر صرف اس کا انکار یعنی اس کو نہ ماننا کفر ہے۔
- مسواک کرنا سنت ہے؛ مگر اس کے سنت ہونے کا اعتقاد فرض ہے اور اس کی سنت ہونے کا انکار کفر ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنا اور علم حاصل کرنا سنت ہے اور اس کے علم سے ناواقف رہنا حرمان ثواب

[ثواب سے انکار] کا باعث ہے اور اس پر عمل نہ کرنا رسول ﷺ کے عتاب یا [ترک سنت کے] عذاب کا موجب ہے۔

- اسی طرح سودی لین دین محرمات میں سے ہے؛ اس کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہوئے اس میں ملوث ہونا حرام ہے؛ مگر اس لین دین کو جائز سمجھنا کفر ہے۔

کیا کوئی مسلمان کافر قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس مسئلہ پر [بحوالہ اِکفارُ المُلحدین تصنیف مولانا انور شاہ کاشمیری] اہل سنت کے مستند ترین علمائے حق کی آرا کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے؛

- امت مسلمہ کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ ضروریات دین یعنی وہ مجمع علیہ عقائد و احکام جن کا دین رسول ﷺ ہونا قطعی اور یقینی ہے ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے اور منکر قطعاً کافر ہے، اگرچہ وہ قبلہ سے منحرف نہ بھی ہو اور خود کو مسلمان بھی کہتا ہو۔
- کفر صریح یعنی کفریہ عقائد و اقوال و اعمال کا ارتکاب قطعاً کفر اور ان کا مرتکب یقیناً کافر ہے اگرچہ وہ خود کو مسلمان سمجھتا رہے اور صوم و صلوٰۃ وغیرہ عبادات اور احکام شریعہ کا پابند ہو۔
- متکلمین [وہ علماء جو مذہبی امور کو عقلی دلائل کے ساتھ ثابت کرنے کے ماہر ہوں] کی اصطلاح میں "اہل قبلہ" سے مراد وہ مؤمن کامل ہے جو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے پورے دین پر ایمان رکھتا ہو؛ کفریہ عقائد و اعمال کا ارتکاب کرنے والے ضروریات دین کا انکار کرنے والے انسان کو "اہل قبلہ" میں سے ماننا یا کہنا یا تو ناواقفیت پر مبنی ہے یا فریب اور دھوکا ہے۔
- "اہل قبلہ" کی اصطلاح حضرت انس رضی اللہ عنہ کی جس روایت سے ماخوذ ہے، اس کا تعلق امیر یا حاکم سے ہے نہ کہ عام مسلمانوں سے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امیر یا حاکم جب تک "شعائر دین" کا احترام کرتا رہے اس کی اطاعت واجب اور اس کے خلاف بغاوت ممنوع ہے لیکن اگر وہ بھی "کفر صریح" کا ارتکاب کرے تو اسلام سے خارج اور اس کے خلاف بغاوت جائز ہے۔

- "لا نکفر اہل قبلۃ" یا "اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں" یہ ائمہ اہل سنت میں سے ہر گز کسی کا قول نہیں بلکہ جاہلوں؛ زندیقوں اور ملحدوں کا گھڑا ہوا مقولہ ہے۔
- ائمہ کا مقولہ "لا نکفر احدا بذنب" ہے اور "ذنب" سے مراد گناہ اور معصیت ہے اس لیے کہ ائمہ سے یہ مقولہ "خوارج" اور "معتزلہ" کی تردید کے ذیل میں منقول ہے جو کسی بھی گناہ کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے ہر مؤمن مسلمان کو کافر اور اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں؛ اس مقولہ کو کسی کفر صریح کا ارتکاب کرنے والے یا ضرورت دین کا انکار کرنے والے مسلمان کے حق میں استعمال کرنا کھلا ہوا فریب اور دھوکہ ہے یا خالص ناواقفیت اور لاعلمی۔
- ضروریات دین میں کوئی ایسی تاویل بھی کفر ہے جس سے اس کی وہ صورت باقی نہ رہے جو تواتر سے ثابت ہے جو اب تک ہر زمانہ کے خاص و عام مسلمان سمجھتے سمجھاتے چلے آئے ہیں اور جس پر امت کا تعامل [دائمی عمل] رہا ہے۔
- علماء احناف کے نزدیک تو کسی بھی "قطعی"؛ "یقینی"؛ "حکم شرعی" یا "عقیدہ" کا انکار کفر ہے اگرچہ وہ ضروریات دین کے تحت نہ بھی آتا ہو۔

اس مسئلہ تکفیر کی مزید تفصیل کے لیے "کفر کی حقیقت" کے مضمون کا مطالعہ فرمائیں۔

ضروریات دین کا تعلق نقلی دلائل سے ہے یا عقلی دلائل سے؟

ضروریات دین کا تعلق چونکہ مسئلہ تکفیر سے ہے اسی لیے ان کا ماخذ صرف قرآن و حدیث کے وہ نقلی دلائل ہیں جن کے معنی صریح ہیں اور محکم ہیں؛ سلف و خلف کے علمائے حق کا چند ضروریات دین کے وجہ کفر ہونے پر اختلاف کی وجہ بھی محض عوام میں ان کی عدم شہرت کی وجہ سے ہے نہ کہ نقلی دلائل کے اختلاف کی بنیاد پر۔ نقلی دلائل سے مراد دین میں وہ علم ہے جو رسول اللہ ﷺ سے قرآن و حدیث کی صورت میں منقول ہے اور عقل سے مراد وہ انسانی وصف ہے جس کے صحیح استعمال سے ان نقلی دلائل کی تحقیق اور تصدیق کی جاتی ہے؛ عقل کی اس تصدیق کے بعد اس کو نقل پر ترجیح دینا، ناقص [یعنی عقل] کو تام [پورا، کامل، تمام، کُل] [یعنی نقل] پر ترجیح دینا قرار پائے گا؛ جس کا باطل ہونا واضح ہے۔ اور عقل کا نقص یہ ہے کہ وہ اس نقل کی تحقیق اور

تصدیق کے قابل نہ ہو؛ تو اس صورت میں ایک ناقص [یعنی عقل] کو دین کا معیار قرار دینا ایک بے معنی مطالبہ ہے؛ عقل کا دین میں واحد استعمال نقلی دلائل کے ظاہری تفاوت یا غیر موجودگی کی صورت میں اجتہاد اور قیاس [ایک شرعی حکم سے دوسرے حکم کا استخراج] کے ذریعے زندگی کے مسائل کا شرعی حل استنباط [نتیجہ اخذ کرنا] کرنا ہے۔

اس کتاب میں موجود تحریر شدہ تمام مضامین کا تعلق ان ضروریات دین سے ہے جن کی حیثیت غیر اختلافی ہے اور سلف وخلف کے علمائے حق کا ان پر اتفاق ہے۔

لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله محمد رسول الله

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

ایمان کی حقیقت

- ✓ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہر بچہ **فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے** اس کے بعد اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں" [صحیح بخاری۔ جلد دوم۔ تفاسیر کا بیان۔ حدیث ۱۹۸۰]

مسلمان پیدا ہونا کسی بھی انسان کا شعوری فیصلہ نہیں ہے بلکہ اس فطرت اسلامی میں تو سب انسان برابر ہے تو فقط اس صفت کی بنیاد پر کسی بھی مسلمان کا جہنم سے ابدی نجات اور جنت پر پیدائشی حق کا دعوی نہایت کمزور اور دلیل کا محتاج ہے۔ جبکہ سورۃ العصر کے مطابق **تمام انسان [بشمول پیدائشی مسلمان]** خسارہ میں ہیں، بجز ان افراد کے جو بتدریج شعوری ایمان لا کر، نیک اعمال کر کے، حق کی تلقین اور اس کے نتیجہ میں صبر کا مظاہرہ کر کے اس خسارہ کو نفع میں بدل دیں۔

آخرت کے دائمی خسارہ سے نجات کے حصول کا پہلا جزو ایمان ہے اور قرآن اور احادیث میں تو نجات والے ایمان کا کم از کم معیار **یقین والا** اور **وزن میں رائی کے دانے کے برابر** ہونا قرار دیا گیا ہے۔ اس ایمان کے حصول کا منطقی طریقہ صرف اور صرف علم کا حصول اور پھر اس علم کی روشنی میں ہر قسم کے شرک سے پاک صرف اللہ کی بندگی کا ایک شعوری فیصلہ ؛جیسا کہ قرآن میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا" کہدو یہ ہے میرا رستہ۔ **بلاتا ہوں میں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر**۔ میں بھی اور وہ جس نے میری اتباع کی۔۔۔۔" [سورۃ الیوسف؛۱۰۸]

ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

"**ایمان**" کسی مادی یا غیر مادی ہستی کی صداقت پر یقین قلبی کے باعث، اس سے منسوب "**خبر**، **امر** یا **نہی**" کو کسی مشاہدہ یا عقلی دلیل کے بغیر، قبول کرنے کا نام ہے۔

جیسے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا بغیر مشاہدہ یا عقلی دلیل کے محض کفار کی گواہی پر رسول اللہ ﷺ کے اسراء اور معراج کے سفر ایمان لانا۔ جس "خبر، امر یا نہی" کی بنیاد مشاہدہ یا عقلی دلیل ہو، وہ ایمان کے زمرہ سے خارج ہے اور اسی طرح کسی "خبر، امر یا نہی" پر بعد از ایمان، مشاہدہ یا عقلی دلیل کی بنیاد پر نفی بھی، ایمان کی نفی میں شامل ہے۔

ایمان لانے کے بعد مشاہدہ یا عقلی دلائل کے ذریعے، اس میں اضافہ کی نیت سے تحقیق کرنا برحق اور جائز ہے؛
جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالٰی سے ایمان میں اضافہ کی نیت سے بعث بعد الموت کے مشاہدہ کی درخواست

ایمان کی مندرجہ بالا تعریف کی روشنی میں شرعی ایمان کی کل حقیقت ان تین باتوں میں بیان کی جاسکتی ہے؛

أ. ان تمام عقائد و احکام کی تصدیق کرنا اور ان کو دل سے ماننا جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔

ب. آپ ﷺ کے لائے ہوئے تمام احکام شریعت کی پابندی اپنے ذمہ لینا اور قبول کرنا۔

ت. آپ ﷺ کے دین کے علاوہ باقی تمام مذاہب و ادیان سے بے تعلقی کا اعلان کرنا۔

کیا میرا عمل ایمان میں شامل ہے؟

اخروی نجات کی لیے لازم کم از کم ایمان صرف وہ عمل قلب ہے جس کا تعلق تصدیق سے ہے اور اس دنیا میں اس قلبی ایمان کی کوئی ظاہری شکل نہیں ہے؛ اور ظاہری ایمان [یعنی اسلام] کی رو سے **عمل ظاہری** کے دو جز ہوتے ہیں؛ ایک قلب میں اس کی نیت [---إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ ---؛ صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ امارت اور خلافت کا بیان۔ حدیث ۴۳۰] اور دوسرا اس کی ظاہری شکل؛؛؛ قلب کے حوالے سے عمل کی نیت بھی چونکہ ایمان میں شامل ہے، تو پس **دین کے ہر ہر حکم پر عمل کرنے کا پختہ قصد اور التزام** [لازم قرار دے لینا] **اخروی نجات والے کم ترین قلبی ایمان کے لئے لازم ہے**، جیسا کہ ایمان مجمل میں بیان کیا گیا ہے ["-----وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِه، اِقْرَارٌ م بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِيْقٌ م بِالْقَلْبِ" ----اور میں نے **اس کے تمام احکام قبول کیے** اور اس کا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کی]۔ اور ظاہر میں اس عمل کا قرآن اور سنت کے مطابق ہونا لازم ہے۔

اس دنیا میں دین کا مطالبہ اسلام ہے، جو اس ظاہری ایمان کے مترادف ہے جس کا تعلق مامورات اور منہیات سے ہے، اور اس دنیا میں اسلام اور کفر کا فتویٰ بھی اسی ظاہری ایمان کے مظہر ظاہری اعمال کی بنیاد پر لگے گا اور اس کی نیت کا معاملہ قلبی ایمان کی شکل میں آخرت کے لیے موخر رہے گا۔ اس نقطہ کی واضح مثال جنازہ کی دعا ہے جس میں ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ [اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَه مِنَّا فَاَحْیِه عَلَی الْاِسْلَامِ] "تو ہم میں سے جس کو زندہ رکھ اس کو **اسلام پر** زندہ رکھ" [وَمَنْ تَوَفَّیْتَه مِنَّا فَتَوَفَّه عَلَى الإِيْمَانِ] "اور جس کو فوت کر اس کو **ایمان کی** حالت پر فوت کر"۔ مزید رسول کریم ﷺ کا فرمان "۔۔۔۔۔ اعمال کا دارومدار **خاتمہ پر** ہے" [صحیح بخاری ۔ جلد سوم ۔ دل کو نرم کرنے والی باتوں کا بیان ۔ حدیث ۱۴۴۰] معاملہ کی سنگینی اور اعمال صالحہ کی اہمیت کو مزید واضح کر دیتا ہے۔

کون سا ایمان نجات کے لیے ضروری ہے؟

نجات والے کم ترین قلبی ایمان کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ جو عقائد اس ایمان کی بنیاد ہیں؛ **ان عقائد پر ہم کو کامل اطمینان ہو بغیر کسی شک کے**؛ آج کے اس پر خطر دور میں ان بنیادی عقائد کو بھی الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کے ذریعے مشتبہات میں شامل کر دیا ہے جو اس سے پہلے ہم جیسی عوام الناس کے ایمان کی بنیاد تھے؛ جس کے نتیجے میں نہ صرف ہم اپنے عقائد کی کمزوری میں مبتلا ہو گئے، بلکہ علم کی کمی کے باعث اور معاشرہ میں مغرب سے درآمد شدہ مذہبی رواداری [religious tolerance] کے صدقے ہم ہر قسم کے عقیدہ کو مساوی حق سمجھنے لگے ہیں۔ **یہ مذہبی رواداری بذات خود ہمارے اپنے ایمان پر شک کے مترادف ہے۔**

- ✓ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں؛ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا ۔۔۔۔۔ [سورۃ الحجرات؛ ۱۵] " مومن تو وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر **شک میں نہ پڑے**۔۔۔۔۔"

یہاں یقین والے ایمان سے مطلب وہ ایمان ہے، جس کی بنیاد ان عقائد و احکام کی تصدیق اور ان احکام شریعت کی قبولیت ہے جن کا ماخذ قرآن اور صحیح احادیث ہیں، نہ کہ وہ ایمان جس کے ماخذ کی صحت پر ہر دور کے علمائے حق نے کلام کیا۔

امام ابن تیمیہ ؒ بیان فرماتے ہیں؛

"عامة الناس جو کفر سے اسلام میں داخل ہوئے ہوں یا اسلام پر پیدا ہوئے ہوں اور شریعت کی پیروی لازم سمجھتے ہوں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے والوں میں سے ہوں تو وہ مسلمان ہیں۔ **ان کا ایمان ابھی ایمان مجمل ہے جبکہ حقیقی ایمان کا ان کے دلوں تک پہنچنا آہستہ آہستہ ہوتا ہے** بشرطیہ کہ اللہ کی توفیق سے ان کے لیے یہ ممکن ہو، ورنہ بہت سے لوگ تو اس یقین کے درجہ تک اور {اس ایمان کی خاطر} جہاد کرنے تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ اگر انہیں {ایمان کے سلسلے میں} شک ڈالا جائے تو وہ شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اگر ان سے {ایمان کی خاطر} جہاد کا مطالبہ کیا جائے تو وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتے حالانکہ وہ کافر یا منافق نہیں ہوتے، تاہم ان کے دلوں میں علم، معرفت اور یقین اس درجہ کا نہیں ہوتا جو ان کے شک کو دور کر سکے اور نہ ہی انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے اس درجہ کی محبت حاصل ہوئی ہوتی ہے کہ جس کے لیے وہ اپنے اہل اور مال کی قربانی دے سکیں۔ اگر تو ایسے لوگ موت تک کسی آزمائش سے بچے رہ جائیں تو جنت کے مستحق قرار پاتے ہیں اور اگر ان کے آزمائش کسی ایسے بندے کے ساتھ ہو جائے جو ان میں شکوک وشبہات پیدا کرے اور اللہ کی طرف سے ان شبہات کے ازالہ کے لیے اللہ کا فضل بھی ان پر نہ ہو تو یہ شک کرنے والے بن جاتے ہیں اور نفاق کی ایک قسم کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔"

کتنا ایمان نجات کے لیے کافی ہے؟

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا اور اس کے دل میں [وَزْنُ شَعِيرَةٍ] **جَو برابر** بھی (ایمان) ہے تو وہ (ایک نہ ایک دن) دوزخ سے ضرور نکلے گا اور دوزخ سے وہ شخص (بھی) ضرور نکلے گا جس نے کلمہ پڑھا اور اس کے دل میں [وَزْنُ بُرَّةٍ] **گیہوں کے دانہ برابر** خیر ہے اور دوزخ سے وہ (بھی) نکلے گا جس نے کلمہ پڑھا اور اس کے دل میں اک [وَزْنُ ذَرَّةٍ] **ذرہ برابر بھی خیر** ہے۔ ابو عبد اللہ نے کہا کہ ابان نے بروایت قتادہ، انس، نبی ﷺ سے بجائے خیر کے ایمان کا لفظ روایت کیا ہے"۔ [صحيح البخاري: كِتَابُ الإِيمَانِ؛ حديث نمبر ۴۳]

یہ حدیث اوراس قبیل کی متعدد احادیث اللہ تعالیٰ کی لا محدود رحمت اور مغفرت کا بیان کرتیں ہیں؛اس رحمت اور مغفرت کا جس کا کامل ظہور قیامت کے قائم ہونے کے بعد ہو گا۔اور اس کے مستحق بھی صرف وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے زبان سے کلمہ ادا کیا اور **دل میں اس روز وزن کیے جانے کے قابل ایمان** کو جگہ دی۔

کیا اس دنیا میں وزن کیے جانے والے ایمان کو جانچنے کا کوئی پیمانہ ہے؟

یہ ایک اہم سوال ہے کہ کیا وہ مخفی ایمان جو روز محشر وزن کیے جانے کے قابل ہو گا؛کیا اس دنیا میں بھی اس کو جانچنے کا کوئی پیمانہ ہے یا ہر مسلمان اس بے دلیل مفروضے پر اپنی روزمرہ زندگی سے مطمئن رہے کہ چونکہ وہ کلمہ گو مسلمان ہے تو اس کا لازمی نتیجہ دل میں ایمان کی موجودگی ہے۔

اخروی نجات کی لیے لازم ایمان چونکہ کسی اور انسانی جذبہ [خوشی؛غمی؛محبت؛نفرت؛حسد وغیرہ] کی طرح عمل قلب ہے اور دوسرے جذبوں کی طرح اس کے اظہار کا طریقہ بھی ان اعمال سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی شکل میں ہے جن کا تعلق ان جذبات سے ہوتا ہے۔مثلاً ہر شخص کی غمی یا خوشی کے جذبہ کا اثر لازماً اس کے قلب پر منفی یا مثبت طور پر پڑے گا؛بعینہ ایمان کے جذبہ کا بھی انسان کے قلب سے یہی رشتہ ہے اور اس کی بہترین دلیل رسول کریم ﷺ کی مندرجہ ذیل حدیث ہے کہ؛

- ✓ "تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے اس پر لازم ہے کہ اس برائی کو اپنے ہاتھ سے مٹائے اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے روکے اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو **اپنے دل سے اس برائی کو مٹائے**۔(یعنی بوقت استطاعت مٹانے کا عزم رکھے)اور یہ ایمان کا سب سے [أضعف الإيمان] کمزور درجہ ہے"۔ [مشکوۃ شریف۔جلد چہارم۔توکل اور صبر کا بیان۔حدیث ۱۰۶۲]

یہ حدیث اس دنیا میں ہر کلمہ گو مسلمان کے لیے نجات والے ایمان کو جانچنے کا پیمانہ ہے کہ دل میں اخروی نجات کی لیے لازم ایمان کی موجودگی،کم از کم برائی کے احساس اور دل میں اس کو مٹانے کی نیت کے مترادف ہے؛نہ کہ کلمہ کی زبان سے ادائیگی کے بعد اس برائی سے لطف اندوز ہونے میں؛مثلاً موسیقی کو

روح کی غذا قرار دے کر اس سے لطف اندوز ہونا؛ مخلوط تقریبات کا انعقاد اور ان سے لطف اندوز ہونا؛ ٹخنوں سے نیچے کپڑوں کو لٹکانا؛ وغیرہ۔

کیا اس دنیا میں کسی معین شخص کو جنتی یا جہنمی قرار دیا جا سکتا ہے؟

اہلسنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ کسی معین شخص پر جہنمی یا جنتی ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اِلّا یہ کہ جس کے سلسلے میں رسول اکرم ﷺ نے گواہی دی ہو، لیکن ہم نیکو کار سے اچھی امید رکھیں گے، اور بدکار کے سلسلے میں ڈریں گے، اور انجام کار تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ مگر قرآن اور حدیث کے واضح دلائل کی بنیاد پر متفق الیہ عقیدہ ہے کہ وہ کفر جو ایمان کی ضد ہے؛ اس پر جس کی موت ہو جائے وہ جہنمی ہے۔

اس دنیا میں ہم انتہائی آسانی سے اپنے پسندیدہ دینی اشخاص کو ولی اللہ یا اپنے نقطہ نظر سے متفق اور اس کے راستے میں جان دینے والوں کو اللہ کے راستے میں شہید [شہید فی سبیل اللہ] قرار دینے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے اگرچہ ان دونوں معاملات میں دو فریق ملوث ہیں؛

فریق اول؛ اللہ سبحان و تعالیٰ؛

فریق دوم؛ وہ معین شخص جس کے متعلق "ولی اللہ" یا "شہید فی سبیل اللہ" کا دعوی کیا جاتا ہے؛

اور جیسے ہر دعوی گواہی کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح یہ دعوی بھی **فریق اول** یا **فریق دوم** کی طرف سے گواہی کا مطالبہ کرتا ہے۔ نبی یا رسول کی غیر موجودگی میں آج کوئی شخص بھی وحی کا دعوی نہیں کر سکتا، تو **فریق اول** کی طرف سے تو اس نسبت کی گواہی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اگر **فریق دوم** "شہادت فی سبیل اللہ" کا تو نہیں مگر "ولی اللہ" ہونے کا مدعی ہو تو جس **فریق اول** کا ولی ہونے کا وہ دعویدار ہے، اس کی طرف سے معین اثبات کے بغیر اس دعوی کا کوئی وزن نہیں۔ اور ان دونوں فریقوں کے بعد کسی اور شخص کا ایک معین **فریق دوم** کے متعلق اس طرح کا دعوٰی تو سرے سے قابل استدلال ہی نہیں ہے۔

قرآن اور حدیث بھی صرف اولیاء اللہ اور شہداء فی سبیل اللہ کے اوصاف کو بیان کرتے ہیں اور ان اوصاف میں اولین وصف تقویٰ ہے جو کہ ایمان کی طرح عمل قلب ہے اور اس دنیا میں اس کا اندازہ کرنا نا ممکن ہے؛

اس لیے ان القابات کا معین اشخاص پر اطلاق، **بغیر علم کے اللہ کی ذات کے ساتھ کچھ منسوب کرنے کے زمرہ میں آتا ہے** جو انتہائی نازک معاملہ ہے۔ اس دنیا میں تو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے حسن ظن ہی رکھ سکتا ہے مگر معین طور اللہ کا ولی یا اس کی موت کو اللہ کے راستے میں شہادت قرار نہیں دے سکتا۔

اسی تقویٰ اور ایمان کی طرح وہ کفر یا نفاق جس سے ایمان کی نفی ہوتی ہے اور ہمیشگی کی جہنم واجب ہوتی ہے، اس کا تعلق بھی قلب سے ہے اور اس دنیا میں کسی بھی فتوی کی دائرہ اختیار سے باہر ہے اور ان اسباب میں سے ایک ہے جس کی وجہ سے رسول کریم ﷺ نے اپنے دور میں علم وحی کی موجودگی کے باوجود اعتقادی منافقین کو کافر قرار نہیں دیا۔

اس کے برعکس ظاہری طور پر دو قوتیں جن سے اسلام کو بحیثیت مجموعی اور ہر مسلمان کے ایمان کو انفرادی خطرہ لاحق رہا، وہ مسلمان معاشروں میں ظاہری کفر اور ظاہری نفاق ہے؛ اور ان دونوں کے متعلق بھی ہم اتنے محتاط ہیں کہ ہر قسم کا ظاہری کفر یا ظاہری نفاق دیکھنے اور سننے کے باوجود ہم اس میں سے اس پوشیدہ ایمان کو نکال لیتے ہیں جو متعدد احادیث میں جہنم سے نجات کی شرط کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

مزید تفصیل کے لیے مضمون "کفر کی حقیقت" کا مطالعہ فرمائیں

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

طاغوت کی حقیقت

کیا دین میں عبادت سے مراد ظاہری عبادات کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟

اس سوال کے تفصیلی جواب کے لیے " عبادت اور عبادات کی حقیقت" کا مطالعہ لازمی ہے، فی الحال موضوع کی مناسبت سے مختصراً۔۔۔

اللہ سبحان و تعالٰی نے جن و انس کی پیدائش کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ؛

- ✓ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ [سورة الذاریات؛ ۵۶]۔ "اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ **میری عبادت کریں**"۔

بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں، کہ عبادت اس سے آگے کچھ نہیں کہ **چند اسلامی شعائر کے مجموعہ** پر عمل پیرا ہو جائیں، جن کا حکم اللہ تعالٰی نے ہمیں دے رکھا ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ۔ اگر معاملہ ایسا ہی ہے تو پھر اللہ تعالٰی کا یہ فرمان کس طرح ثابت ہو گا؟

- ✓ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ [سورة الانعام ؛ ۱۶۲] "کہہ دیجیے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت **سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے**"۔

اور جب عبادت کا مکمل اور جامع مفہوم ذہنوں میں واضح ہو جائے، تو قرآن کی مندرجہ ذیل آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے ؛

- ✓ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ [سورة یس؛ ۶۰]۔ "اے آدم کی اولاد ہم نے تم سے کہہ نہیں دیا تھا کہ **شیطان کو نہ پوجنا** وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"

ہر کوئی مسلمان جانتا ہے، کہ دنیا میں کوئی شیطان کے لیے نماز؛روزہ؛زکوٰۃ یا حج ادا نہیں کرتا بلکہ زندگی کے دیگر معاملات میں شیطان کی اطاعت ہی، شیطان کی عبادت ہے۔

کیا طاغوت کا انکار ضروریات دین میں شامل ہے؟

طاغوت کا انکار دین اسلام کی بنیاد اور ضروریات دین میں اولین حیثیت رکھتا ہے۔ایمان کے وہ مسائل، جن کا تعلق طاغوت سے ہے، دین کے اہم ترین مسائل ہیں، کیونکہ وہی ایمان اور کفر میں امتیاز کرتے ہیں۔

اللہ پر ایمان رکھنے والا ہر مؤمن، طاغوت کا انکار کرنے والا ہوتا ہے اور طاغوت پر ایمان لانے والا ہر کافر ،اللہ کا انکار کرنے والا ہوتا ہے اور کسی بھی مسلمان مؤحد کا ایمان، اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا، جب تک وہ طاغوت کا انکار نہ کر دے۔

کلمہ طیبہ میں "لا الہ" کا "الا اللہ" سے پہلے اقرار اس بات کا ثبوت ہے، کہ اللہ کی توحید کے اثبات سے پہلے ہر قسم کے طاغوت سے برأت ضروری ہے۔

- ✓ ۔۔۔۔۔ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى ۔۔۔۔۔ [سورۃ البقرۃ ۔۲۵۶] ۔"۔۔۔۔ جس نے **طاغوت کا انکار کیا** اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط کڑا تھام لیا۔۔۔۔"۔
- ✓ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۔۔۔۔۔[سورۃ النحل ۔۳۶] ۔ "ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا [وہ ان سے کہتا تھا] اللہ کی عبادت کرو اور **طاغوت سے اجتناب کرو**۔۔۔۔"۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ تمام انبیاء اکرام اسی لیے مبعوث کیے گئے تھے، کہ وہ طاغوت سے لوگوں کو بچائیں؛اب جو شخص طاغوت سے اجتناب نہیں کرتا، وہ تمام انبیاء اکرام کا مخالف ہے۔

✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہا اور **اللہ تعالیٰ کے سوا اور چیزوں کی پرستش کا انکار** کر دیا، اس کا جان و مال محفوظ ہو گیا باقی ان کے دل کی حالت کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔
"[صحیح مسلم۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۱۳۲]

مندرجہ بالا حدیث بھی کلمہ توحید "لا الہ الا اللہ" کے اقرار کو ہر قسم کے طواغیت سے ظاہری انکار اور ان سے برأت کے اظہار کے ساتھ لازم کر رہی ہے۔

طاغوت اور طاغوت پرستی کی کیا تعریف ہے؟

طاغوت اپنی اصل میں اللہ کی اطاعت [یعنی "عبادت"] میں اس کے مدمقابل کو کہتے ہیں۔ طاغوت ویسے تو بے شمار ہیں مگر ان کے سرکردہ پانچ ہیں؛

- ابلیس لعین۔
- ایسا شخص جس کی عبادت کی جائے اور وہ اس فعل پر رضامند ہو۔
- جو شخص لوگوں کو اپنی عبادت کرنے کی دعوت دیتا ہوں اگرچہ اس کی عبادت نہ بھی ہوتی ہو۔
- جو شخص علم غیب جاننے کا دعوٰی کرتا ہو۔
- جو شخص اللہ کی نازل کی ہوئی شریعت کے خلاف فیصلہ کرے۔

اور طاغوت پرستی اپنی اصل میں توحید پرستی کی ضد ہے، یعنی اس اصطلاح کا اطلاق طاغوت کے متبعین پر ہوتا ہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق، طاغوت پرستی کی انتہائی مکمل اور جامع تعریفوں کو امام ابن قیّم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں رقم کیا ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

أ. **اللہ کے سوا جس کی عبادت کی جائے**، وہ مادی یا غیر مادی ہستی طاغوت ہے اور اس ہستی سے رجوع کرنے والے لوگ طاغوت پرست ہیں۔

✓ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ [سورة النحل؛ ٣٦]

"ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا [وہ ان سے کہتا تھا] اللہ کی عبادت کرو اور **طاغوت سے اجتناب کرو**"۔

ب. **جو شخص پیغمبر ﷺ کی لائی ہوئی چیز [یعنی قرآن] کے سوا** اور طرف، اپنا تنازع اور اختلافات لے جائے، وہ مادی یا غیر مادی ہستی طاغوت ہے اور اس ہستی سے رجوع کرنے والے لوگ طاغوت پرست ہیں۔

✓ ۔۔۔۔۔ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ [سورة المائدة؛ ٤٤]

"۔۔۔۔۔ اور جو خدا کے **نازل فرمائے ہوئے احکام** کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں"۔

✓ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ ۔۔۔۔۔ [سورة النساء؛ ٤٨] "اور [اے پیغمبر ﷺ] ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے، جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان [سب] پر شامل ہے، تو جو حکم خدا نے **نازل فرمایا ہے**، اس کے مطابق ان کا فیصلہ کرنا۔۔۔۔۔"۔

ت. **اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا** [یعنی قرآن و حدیث] جس کے پاس سے، اپنے جھگڑے اور اختلافات کے فیصلے ٹٹولے جائیں، وہ مادی یا غیر مادی ہستی طاغوت ہے اور اس ہستی سے رجوع کرنے والے لوگ طاغوت پرست ہیں۔

✓ ۔۔۔۔۔ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۔۔۔۔۔ [سورة النساء؛ ٦٠] "وہ **طاغوت کے پاس** فیصلہ کروانے کے لئے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ کفر کریں"۔

- ✓ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ [سورة المائدہ؛ ۵۰] "کیا یہ **زمانۂ جاہلیت کے حکم کے خواہش مند** ہیں؟ اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لیے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟"۔

- ✓ أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا۔۔۔۔ [سورۃ الانعام؛ ۱۱۴] "(کہو) کیا میں **خدا کے سوا اور منصف** تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف واضح المطالب کتاب بھیجی ہے۔۔۔۔"۔

- ✓ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا [سورۃ النساء؛ ۶۵] تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں **تمہیں منصف نہ بنائیں** اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

ث. جس کی عبادت کی جائے یا جس کی پیروی کی جائے یا جس کی اطاعت کی جائے اور اس کی مانی جائے اور ان کاموں میں **شرعی حد سے تجاوز** کرلیا جائے، وہ مادی یا غیر مادی ہستی طاغوت ہے اور اس ہستی سے رجوع کرنے والے لوگ طاغوت پرست ہیں۔

- ✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا [سورۃ النساء؛ ۵۹] "مومنو! خدا اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے، صاحب حکومت ہیں، ان کی بھی اور اگر کسی بات میں، تم میں اختلاف واقع ہو، تو اگر خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، تو اس میں **خدا اور اس کے رسول ﷺ [کے حکم] کی طرف رجوع کرو**، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے"۔

ج. جس کی **پیروی بغیر اللہ کے فرمان کی جائے**، وہ مادی یا غیر مادی ہستی طاغوت ہے اور اس ہستی سے رجوع کرنے والے لوگ طاغوت پرست ہیں۔

✓ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱتَّبِعُوا مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ ءَابَآءَنَآ ۚ أَوَلَوْ كَانَ ٱلشَّيْطَٰنُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ ٱلسَّعِيرِ [سورۃ لقمان؛۲۱] "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو [کتاب] خدا نے نازل فرمائی ہے اس کی پیروی کرو۔ تو کہتے ہیں کہ **ہم تو اسی کی پیروی کریں گے** جس پر اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا اگرچہ شیطان ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف بلاتا ہو [تب بھی؟]"

ح. جس کی اطاعت کی جائے اور اس کی بات مان لی جائے **بغیر اس علم کے کہ اللہ تبارک وتعالی کی اطاعت ہے**، وہ طاغوت ہے اور ایسا کرنے والے لوگ طاغوت پرست ہیں۔

✓ "۔۔۔۔۔وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ ٱتَّبَعَ هَوَىٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ ٱللَّهِ۔۔۔۔۔ [سورۃ القصص؛۵۰]" ۔۔۔۔۔اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر **اپنی خواہش کے پیچھے** چلے۔ ۔۔۔۔"

✓ بَلِ ٱتَّبَعَ ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓا أَهْوَآءَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ۔۔۔۔۔ [سورۃ الروم؛۲۹] "مگر جو ظالم ہیں **بے سمجھے اپنی خواہشوں کے پیچھے** چلتے ہیں۔۔۔۔۔"

کیا [ملکی؛ علاقائی؛ گروہی؛ ادارتی یا جماعتی] مفاد وغیرہ کے تحفظ اور اس کی خاطر ہر قسم کے حکم کی تعمیل بھی طاغوت پرستی ہے؟" اور "کیا ہمارا عدالتی نظام قرآن وسنت کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا پابند نہیں ہے؟

یہاں ان سوالات کا جواب بیان کرنا مقصود نہیں ہے، کیونکہ جن جن بھائیوں اور بہنوں نے نیک نیتی سے سوال نمبر ۴ میں موجود آیات کا محاسبہ کی نیت سے مطالعہ کیا ہے ان کے لیے وہی کافی ہے۔ یہاں محض مزید شرح صدر کے لیے دو احادیث کا حوالہ قلم بند ہے۔

✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسلمان پر سننا اور ماننا واجب ہے خواہ وہ اسے پسند کرے یا ناپسند کرے **بشرطیکہ کہ اسے اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے**۔ اور اگر نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سننا واجب ہے؛ اور نہ ہی اطاعت کرنا" [جامع ترمذی ۔ جلد اول ۔ جہاد کا بیان ۔ حدیث ۱۷۷۶]۔

✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "۔۔۔۔۔**اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں ہے** اطاعت تو صرف معروف میں ہے" [سنن ابوداؤد ۔ جلد دوم ۔ جہاد کا بیان ۔ حدیث ۸۶۰]۔

عافیت کی راہ یہ ہے کہ انسان، زندگی کے ہر اس معاملے میں جس میں ملکی؛ علاقائی؛ گروہی؛ ادارتی؛ پنچائتی یا جماعتی قیادت کا تعلق علمائے حق سے نہیں ہے، قرآن اور حدیث کے پیمانہ پر پرکھے یا علمائے حق سے رجوع فرمائے اور پھر جو "حکم" اس معیار پر پورا اترے، تو ایسے معاملے میں حکومت کی؛ یا اپنے سردار کی؛ یا اپنے افسر کی؛ یا اپنے علاقے کے چودھری کی یا امیر جماعت وغیرہ کی اطاعت واجب ہے، ورنہ برأت واجب ہے، کیونکہ اگر وہ "حکم" طاغوت پرستی سے محفوظ ہوا بھی؛ تو وہ "حکم" جس کی بنیاد شریعت پر نہیں ہے وہ ظلم کے خدشہ سے خالی نہیں ہو سکتا اور ظلم بھی اخروی انجام کے حساب سے انتہائی خطرناک ہے۔

- ✓ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ [سورة الهود؛ ۱۱۳] "**اور جو لوگ ظالم ہیں، ان کی طرف مائل نہ ہونا**، نہیں تو تمہیں [دوزخ کی] آگ آ لپٹے گی اور خدا کے سوا تمہارے اور دوست نہیں ہیں۔ اگر تم ظالموں کی طرف مائل ہو گئے تو پھر تم کو [کہیں سے] مدد نہ مل سکے گی"۔

- ✓ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے قید و بند کے زمانہ میں ان کی جیل کے ایک پہرہ دار نے سوال کیا کہ "کیا جو حدیث ظالموں اور ان کے مددگاروں کے متعلق ہے، وہ صحیح ہے؟" آپ نے فرمایا "ہاں" تو پہرہ دار نے کہا "تو کیا میں ظالموں کے مددگار کی حیثیت رکھتا ہوں" تو آپ نے فرمایا "نہیں، ظالموں کے مددگار تو وہ ہیں جو تمہارے بالوں میں کنگھی کرتے ہیں، تمہارے کپڑے دھوتے ہیں، تمہارے کھانے تیار کرتے ہیں اور تمہارے ساتھ خرید و فروخت کے معاملات رکھتے ہیں، **جبکہ تم تو خود ظالموں میں سے ہو**" [ماخوذ مناقب امام احمد بن حنبل از امام ابن جوزی؛ صفحہ ۳۹۷]

لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله محمد رسول الله

اللهم صل علی سیدنا محمد و علی اٰلہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

نظام کی حقیقت

کیا کوئی نظام [حکومتی یا ذیلی] ہر قسم کے عقائد یا نظریات کی صفات سے عاری ہو سکتا ہے؟

اس سوال کو اٹھانے والوں کی مثال جہم بن صفوان اور اس کے ہم عقیدہ لوگوں جیسی ہے، جنہوں نے اپنے تیئں سرے سے ہی اللہ کی صفات کا انکار کر دیا اور کہا کہ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کی جائے؛ کیونکہ صفات کے اثبات کی صورت میں توحید ختم ہو کر رہ جاتی ہے اور متعدد خداؤں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ جیسے جہم کا یہ قول باطل تھا اور کوئی ذات صفات سے عاری نہیں ہو سکتی، اسی طرح، کوئی بھی نظام [حکومتی یا اس کا ذیلی] جو بذات خود محض ایک صفاتی وجود رکھتا ہے، اس کا کسی بھی عقیدہ یا نظریہ سے خالی ہونا۔۔۔ ناممکن ہے؛ ذہنی طور پر اگرچہ ممکن ہو، لیکن ذہن کا کیا ہے، وہ تو محال چیزوں کو بھی فرض کر لیتا ہے۔

کیا اسلامی معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی، عدالتی وغیرہ جیسے نظام غیر اسلامی یا لامذہب حکومتی نظام کے ماتحت ممکن ہیں؟

ہر حکومتی نظام، کسی مخصوص مجموعہ عقائد یا نظریات کا علم بردار ہوتا ہے اور اپنے ذیلی نظاموں یعنی معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی، عدالتی وغیرہ کے ذریعے، ان عقائد و نظریات کو عملی شکل میں نافذ کرنے میں کوشاں ہوتا ہے۔ جس طرح اسلامی حکومتی نظام، اپنے ذیلی نظاموں میں انہیں عقائد اور نظریات کو تحفظ دے گا، جس کا وہ علم بردار ہے، اسی طرح غیر اسلامی یا لامذہب حکومتی نظام بھی، اپنے ذیلی نظاموں میں اسلامی عقائد و نظریات کی صرف اس شکل کو برداشت کرے گا جو اس کے اپنے وجود کے لیے خطرہ نہ ہوں۔

کسی غیر اسلامی حکومتی کے ماتحت ذیلی اسلامی نظاموں کا نظریہ، مباحث کا مرکز نظر تو ہو سکتا ہے اور شاید اس نظریہ کا قائل، اپنی چرب زبانی کے باعث اپنے مخالف کو زچ بھی کر لے، مگر اپنی حقیقت میں اسی طرح بے معنی ہے جس طرح کسی نظام کا عقیدہ یا نظریات سے عاری ہونا۔

کیا حکومتی نظام کا اسلام کے تابع ہونے کا عقیدہ ضروریات دین میں سے ہے؟

چونکہ ضروریات دین سے مراد وہ **تمام قطعی اور یقینی امور دین مراد ہیں** جن کا دین رسول ﷺ سے ہونا قطعی طور پر معلوم ہو، تو حکومتی نظام ہی کیا، بلکہ معاشرہ میں نافذ ہر نظام کا اسلام کے تابع ہونے پر دلائل قرآن اور حدیث میں اس تواتر سے بیان ہوئے ہیں کہ یہ مضمون ان کے مکمل احاطہ کا متحمل نہیں ہو سکتا؛ لیکن کسی بھی صحیح عقل و سلیم فطرت انسان کے لیے قرآن کی یہی آیت کافی ہے؛

- ✓ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ [سورة الانبياء؛ ٢٢] "اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے **تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے**۔ جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں خدائے مالک عرش ان سے پاک ہے"۔

زمین اور آسمان دونوں کا امن؛ سلامتی؛ سکون اور مکمل ہم آہنگی کا تصور فقط اس نقطہ میں پنہاں ہے کہ اس کائنات میں کل اور واحد حق کا ماخذ، اللہ سبحان و تعالیٰ کو مانا جائے؛ چنانچہ جب بھی انسان اس کے عطا کیے ہوئے کسی بھی نظام کے علاوہ کسی دوسرے نظام کو حق تصور کرے گا، تو اس کا لازمی نتیجہ زمین پر فساد کی صورت میں ہو گا۔ اور اس کے مدمقابل یہ عقیدہ رکھنا کہ

"اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق تو کیا {-----لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ -----[سورة ص؛ ٧٥]؛ "-----جس شخص کو میں نے اپنے **ہاتھوں** سے بنایا-----"}؛ اس کی تخلیق کا مقصد بھی بیان کیا {وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ [سورة الذاريات؛ ٥٦]؛ "اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اِس لئے پیدا کیا ہے کہ میری **عبادت** کریں"}؛ اور فقط نظریاتی ہدایت ہی نہیں، بلکہ اخروی نجات کے لیے مطلوبہ اعمال کا بیان بھی اپنے ذمہ رکھا{وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ [سورة التوبة؛ ١١٥]

"اور خدا ایسا نہیں، کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کر دے، جب تک کہ ان کو وہ چیز نہ بتا دے، جس سے وہ پرہیز کریں۔ بے شک خدا ہر چیز سے واقف ہے"}" **مگر اس نے کوئی حکومتی نظام عطا ہی نہیں کیا جو ہماری اجتماعی، باہمی اور انفرادی زندگی کو اللہ سبحان و تعالیٰ کی مرضی کے تابع کرے،** اتنا لغو، بیہودہ اور اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے کہ قابل توجہ ہی نہیں ہے۔

کیا اسلامی حکومتی نظام کے بغیر مکمل اسلام پر عمل درآمد ممکن ہے؟

ہر انسان کی زندگی تین دائروں میں تقسیم ہے؛ انفرادی، باہمی اور اجتماعی زندگی۔ اور ہر حکومتی نظام، اپنے ذیلی نظاموں کے ذریعے، انہی تینوں دائروں سے مخاطب ہوتا ہے۔ عموماً ہر غیر اسلامی یا لامذہب حکومتی نظام؛ ایک محدود حد تک اپنے باسیوں میں ان کے انفرادی اور باہمی معاملات میں آزادی کا علم بردار ہوتا ہے، لیکن اس رویے میں وہ کسی مخصوص تصور خیر کو دوسرے تصور خیر پر ترجیح نہیں دیتا بلکہ سب کو مساوی حق کا درجہ دیتا ہے اور اس کی نظر میں اسلام کی بنیاد پر اعمال میں کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔ اور جہلا کی اکثریت اس قسم کی مذہبی آزادی پر نہ صرف مطمئن نظر آتے ہیں بلکہ ان غیر اسلامی یا لامذہب حکومتی نظاموں کے بقا میں اپنے اقوال و افعال سے مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔

اس کے برعکس قرآن مندرجہ ذیل آیات میں انہی تین دائروں کا ذکر کرتے ہوئے، فقط اپنے بیان کردہ تصور خیر کو ہی، واحد حق کے طور پر بیان کرتا ہے اور اپنے پیروکاروں سے بھی، صرف اسی حق کی پیروی کا متقاضی ہے اور نافرمانی کی صورت میں ان کو "الکافرون"؛ "الظالمون" اور "الفاسقون" کے القاب سے نوازتا ہے۔ ان آیات کی مزید تفصیل کے لیے مضمون "شریعت کی حقیقت" کا مطالعہ فرمائیں۔

اجتماعی دائرہ؛

- ✓ إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ [سورۃ المائدۃ؛ ۴۴] "بیشک ہم نے تورات نازل فرمائی، جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق انبیاء جو [خدا کے] فرمانبردار تھے یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں اور مشائخ

اور علماء بھی، کیونکہ وہ کتاب خدا کے نگہبان مقرر کیے گئے تھے اور اس پر گواہ تھے [یعنی حکم الٰہی کا یقین رکھتے تھے] تو تم لوگوں سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا اور **جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں**"۔

باہمی دائرہ؛

✓ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ **الظَّالِمُونَ** [سورۃ المائدۃ؛۴۵] "اور ہم نے ان لوگوں کے لیے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا، کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے، لیکن جو شخص بدلہ معاف کر دے وہ اس کے لیے کفارہ ہو گا اور **جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف ہیں**"۔

انفرادی دائرہ؛

✓ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ **الْفَاسِقُونَ** [سورۃ المائدۃ؛۴۶، ۴۷] "اور ان پیغمبروں کے بعد، انہی کے قدموں پر، ہم نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو بھیجا، جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے اور ان کو انجیل عنایت کی، جس میں ہدایت اور نور ہے اور تورات کی، جو اس سے پہلی کتاب [ہے] تصدیق کرتی ہے اور پرہیزگاروں کو راہ بتاتی اور نصیحت کرتی ہے۔ اور اہل انجیل کو چاہیئے، کہ جو احکام خدا نے اس میں نازل فرمائے ہیں اس کے مطابق حکم دیا کریں اور **جو خدا کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے گا تو ایسے لوگ نافرماں ہیں**"۔

ان میں سے کسی بھی دائرہ کی کلی یا جزوی طور پر غیر موجودگی، قرآن کی مندرجہ ذیل آیت کی تکمیل میں رکاوٹ ہے؛

- ✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ

[سورۃ البقرۃ؛۲۰۸] مومنو! اسلام میں **پورے پورے داخل ہو جاؤ** اور شیطان کے پیچھے نہ چلو وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

کیا حکمرانوں کا اسلامی معاشروں میں غیر اسلامی قوانین کا نفاذ کفر حقیقی ہے یا کفر مجازی؟

اسلامی تاریخ اور بالخصوص دور حاضر میں، اس مسئلہ پر انتہائی تفصیلی کام مرتب کیا گیا ہے اور دونوں طرف کے دلائل میں اصل اختلاف، صرف اس بات پر ہے، کہ کیا غیر اسلامی قوانین کے نفاذ سے مسلمان حکمران کافر ہو جاتا ہے یا نہیں؟ ورنہ جیسا کہ کسی بھی فلسفہ کو دین پر ترجیح دینا نواقض اسلام میں سے ہے، اسی بنیاد پر غیر اسلامی قوانین کے نفاذ کے کفر ہونے پر سب علمائے حق کا اجماع ہے؛ جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے، اس عمل کا کفر ہونا واضح ہوتا ہے۔

> اہل سنت کے فرقوں میں لفظی اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ کفر کے کئی مراتب بناتے ہیں جیسا کہ ایمان کے کئی مراتب ہیں۔ "کفر دون کفر" کی اصطلاح عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ دراصل یہ اختلاف اس لیے رونما ہوا، جب ایمان کی حقیقت بیان کرنے میں بعض نے کہا، ایمان "قول اور عمل" کا نام ہے اور اس میں کمی بیشی ہوتی ہے؛ بعض نے اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا، اگرچہ اس بات پر ان سب کا اتفاق ہے، کہ جس شخص کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کافر کہا ہے، ہم بھی اس کو کافر کہیں گے۔ اس لیے کہ یہ بات تو ممتنع ہے کہ اس شخص کو **جو اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا؛ اس کو اللہ اور اس کا رسول ﷺ تو کافر کہتے ہیں** لیکن ہم اس کو کافر نہ کہیں، البتہ ایمان کی مذکورہ تشریح کے مطابق اس کا کفر عملی ہو گا اعتقادی نہیں۔ اور جس شخص نے، ایمان کو صرف تصدیق قرار دیا ہے اور عمل کو ایمان کے مسمّیٰ میں داخل نہیں کیا اور کفر کو جحود [انکار کرنا] کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، وہ ایمان اور کفر میں کمی بیشی کا قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک یہ کفر مجازی ہے اس لئے کہ کفر حقیقی تو وہ ہوتا ہے، جو ملت اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ [شرح عقیدہ طحاویہ تالیف علامہ ابن ابی العز الحنفی ترجمہ مولانا محمد صادق خلیل ؛ صفحہ نمبر ۴۱۰]

اور جہاں تک اس حاکم کا معاملہ ہے جو غیر اسلامی قوانین کے نفاذ کا مرتکب ہے؛ مندرجہ ذیل اقتباس جامع انداز میں اس کو بیان کرتا ہے؛

کلام اللہ کے فیصلوں کے خلاف فیصلہ کرنا، کبھی اس کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دے گا اور کبھی صرف معصیت کا مرتکب ہو گا، خواہ معصیت کبیرہ ہو یا صغیرہ، اور کبھی کفر مجازی ہو گا اور کفر اصغر ہو گا۔ اگر کوئی شخص اس اعتقاد کے ساتھ کتاب اللہ کے احکام کی مخالفت کرتا ہے، کہ کتاب اللہ کے احکام کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری نہیں، اس میں اختیار ہے، یا باوجود اس بات کے، کہ وہ یقین کے ساتھ اس کو اللہ کا حکم سمجھتا ہے، لیکن استخفاف [توہین، تذلیل، تحقیر، سبک سمجھنا یا کرنا] کے طور پر اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا، تو **یہ کفر بہت بڑا کفر ہے**۔ اور اگر اعتقاد تو یہ ہے، کہ کلام اللہ کے احکام کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری ہے، نیز وہ سمجھتا ہے ، کہ مخالفت کی صورت میں وہ عذاب خداوندی کا مستحق ہو گا، تو اس صورت میں کتاب وسنت سے اس کا اعراض معصیت سمجھا جائے گا اور **اس کے کفر کو کفر مجازی یا کفر اصغر سمجھا جائے گا**۔ اور اگر پوری کوشش کرنے کے باوجود، اس کی نظروں سے کتاب وسنت کا فیصلہ مخفی رہا اور اس نے خطا کرتے ہوئے کتاب و سنت کے خلاف قدم اٹھایا تو **یہ انسان خطاکار ہے**؛ اس کو کوشش کرنے کی بنا پر ثواب حاصل ہو گا اور اس کی غلطی معاف ہو گی۔ [شرح عقیدہ طحاویہ تالیف علامہ ابن ابی العز الحنفی ترجمہ مولانا محمد صادق خلیل ؛ صفحہ نمبر ۴۱۱]

اگر یہ مفروضہ برحق ہے کہ مسلمان ممالک کے حکمران **بڑے کفر کے مرتکب نہیں** ہیں تو

یا

وہ **غیر اسلامی قوانین کا نفاذ گناہ کبیرہ سمجھتے ہوئے، شدید احساس ندامت کی حالت میں کرتے ہیں** اور یہ احساس ندامت، توبہ کے نعم البدل کے طور پر، ان کے اس نواقض اسلام کو گناہ کبیرہ میں بدل دیتا ہے؛

یا

تیسری صورت میں باوجود پوری کوشش کے **ان پر کتاب وسنت کا معاملہ مخفی رہ جاتا ہے**۔

کیا اسلامی معاشروں میں رہائش پذیر مسلمان اسلام حکومتی نظام کی اقامت [قائم کرنا] کے مکلف ہیں؟

اس سوال کی تین صورتیں ہیں؛

اول صورت؛ عمومی طور پر اسلامی نظام موجود [یعنی عدالتی نظام کے ذریعے اجتماعی اور باہمی معاملات میں قرآن وسنت کی بالادستی] مگر حکمرانوں کا کفرِ مجازی کے نتیجہ میں غیر اسلامی قوانین کا نفاذ۔

اس صورت کے ایک حصہ کا جواب تفصیلی طور پر سوال نمبر ۵ میں بیان کیا جاچکا ہے، جس کا لُبّ لَباب یہ ہے، کہ غیر اسلامی قوانین کے نفاذ کا عمل بذاتِ خود کفر ہے، اگرچہ علمائے حق کے درمیان حکمران کا بڑا کفر قطعی اور یقینی نہ ہو۔ ایسی صورت میں مندرجہ ذیل حدیث کی روشنی میں وہ حاکم اپنے کفر کی وجہ سے نہیں؛ اس کفریہ عمل کی وجہ سے، مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری اور امامت سے معزول ہوجاتا ہے اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کو تبدیل کردیں؛

- ✓ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو بلایا اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی ہم سے بیعت لی وہ یہ تھیں، کہ ہم بیعت کرتے ہیں اس بات پر ہم اپنی خوشی اور اپنے غم میں اور تنگدستی اور خوشحالی، اور اپنے اوپر ترجیح دیئے جانے کی صورت میں سنیں گے اور اطاعت کریں گے اور حکومت کے لئے **حاکموں سے نزاع نہیں کریں گے لیکن اعلانیہ کفر پر**، جس پر اللہ کی طرف سے دلیل ہو۔ [صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ فتنوں کا بیان۔ حدیث ۱۹۲۸]

دوم صورت؛ عمومی طور پر اسلامی نظام موجود [یعنی عدالتی نظام کے ذریعے اجتماعی اور باہمی معاملات میں قرآن وسنت کی بالادستی] مگر حکمرانوں کا کفرِ حقیقی کے نتیجہ میں غیر اسلامی قوانین کا نفاذ۔

یہ صورت اوپر بیان کی صورت سے آسان ہے، کیونکہ ایسی صورت میں علماء کا اتفاق ہے کہ کافر مسلمانوں پر حکمران نہیں بن سکتا، نہ کسی مسلمان عورت سے شادی کرسکتا ہے۔ اسی لیے ابن المنذر کہتے ہیں: علماء کا اجماع ہے کافر کسی بھی حال میں مسلمان کا والی وحکمران نہیں بن سکتا۔ [احکام الذمہ لابن القیم: ۲/۴۱۴]

تیسری صورت؛ عمومی طور پر غیر اسلامی نظام موجود [یعنی عدالتی نظام کے ذریعے اجتماعی اور باہمی معاملات میں قرآن و سنت کے بجائے انسانوں کے بنائے ہو قوانین کی بالادستی]۔

یہ صورت اوپر بیان کی گئی دونوں صورتوں سے زیادہ خطرناک اور ضرر رساں ہے، کیونکہ پہلی دونوں صورتوں کا وبال ان حکمرانوں کے علاوہ معاشرہ کے اس محدود طبقے پر پڑتا ہے، جو ان غیر اسلامی قوانین کے نفاذ کی زد میں آتے ہیں؛ مگر یہ تیسری صورت مکمل طاغوت کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور اس تیسری صورت کا وبال حاکم کے بفرض محال اپنی ذات میں مفتی اعظم ہونے کے باوجود، معاشرہ کے ہر اس شخص پر پڑتا ہے، جو اس نظام سے اختیاری یا غیر اختیاری طور پر رجوع کرتا ہے۔

میں کس حکومتی نظام کی صورت کا شکار ہوں؟

جو شخص دین کی باریکیوں کے سمجھنے سے قاصر ہے، تو ظاہر ہے، کہ اس کی مسؤلیت اس شخص کی نسبت کہیں کم ہے جو نصوص کا تفصیلی علم رکھتا ہے اور فقہی باریکیوں کے سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے، چنانچہ ان تینوں صورتوں کی مزید اور تفصیلی وضاحت تو قرآن کی مندرجہ بالا آیت کے مطابق، ان علمائے حق کی ذمہ داری ہے، جو انبیاء کے وارث ہونے کے علمبر دار ہیں۔

- ✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا [سورة النساء؛ ۵۹] مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں **خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو** یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

علمائے حق کے کندھوں پر آج یہ بڑی بھاری ذمہ داری ہے، کہ وہ اپنے قلم و گفتار اور مساجد کے منبر سے واضح کریں کہ میری طرح کا ایک عام مسلمان اوپر بیان کی گئی صورتوں میں سے کس صورت کا شکار ہے اور قیامت والے دن کی رسوائی سے بچاؤ کے لیے اپنے انفرادی دائرہ سے باہر اس کا کیا عملی کردار ہونا چاہیے۔

علمائے حق سے چند اہم ترین سوالات؛؛؛؛؛

- **سوال اول؟؟؟** اگر آج ہم صورت اول یا دوم کے شکار ہیں، تو کیا انفرادی طور پر، رسول اللہ ﷺ کی حدیث یا قرآن وحدیث پر مبنی علمائے حق کے بیان کردہ "تبدیلی حکمران" کے اجماع پر عمل کریں، یا وہ حدیث اور اجماع "اولو الامر" یعنی علمائے حق سے مخاطب ہے تا کہ "تبدیلی حکمران" فساد فی الارض کا باعث نہ بن جائے۔
- **سوال دوم؟؟؟** اور اگر ہم تیسری صورت کے شکار ہیں، جس میں معاشرہ کا ہر مسلمان بجائے کسی مفتی کے، اپنے باہمی اور انفرادی معاملات، اس عدالتی نظام کی طرف لے جانے پر مجبور ہے، جس میں فوقیت قرآن وسنت کو حاصل نہیں ہے، تو کہیں ہم اس آیت کے مصداق تو نہیں ہیں؛

✓ ۔۔۔۔يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ

۔۔۔۔[سورۃ النساء؛ ٦٠] "وہ **طاغوت کے پاس** فیصلہ کروانے کے لئے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ کفر کریں"۔

- **سوال سوم؛؟؟؟** وہ کون سا عمومی مقام یا انتہائی مجبوری ہے، جہاں **طاغوت پرستی** مجھ جیسے عام مسلمان کے لیے حلال ہو جاتی ہے؟
- **سوال چہارم؛؟؟؟** کیا اس نظام میں اپنے حق کو چھوڑ دینا افضل ہے، یا اس کے لیے **طاغوتی عدالتی نظام** کا سہارا لینا افضل ہے؟
- **سوال پنجم؛؟؟؟** کیا اس **نظام کی تبدیلی** میرے جیسے ایک عام مسلمان پر فرض عین ہے، یا فرض کفایہ ہے، یا مستحب ہے، یا مباح ہے؟

کیا عصر حاضر میں اسلامی نظام کی غیر موجودگی کے باعث؛ کسی بھی نام نہاد مسلمان یا کافر ملک میں اقامت یکساں حکم رکھتی ہے؟

اسلام کا آسان اصول ہے اگر کسی بھی جگہ پر انسان کے لیے میں دین اسلام کے شعائر پر عمل درآمد مشکل ہو جائے تو اس پر بمطابق ذاتی استطاعت؛ دینی کشائش والی جگہ کی طرف ہجرت فرض ہو جاتی ہے۔

- ✓ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۞ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا [سورة النساء؛ ۹۸ ۔ ۹۹] اور جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں جب فرشتے ان کی جان قبض کرنے لگتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز وناتواں تھے فرشتے کہتے ہیں کیا خدا کا ملک فراخ نہیں تھا کہ تم **اس میں ہجرت کر جاتے** ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ہاں جو مرد اور عورتیں اور بچے بے بس ہیں کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ رستہ جانتے ہیں۔

نام نہاد اسلامی ممالک [تحریر مضمون کے وقت؛ بجز افغانستان کے] اور کفریہ ممالک میں یکساں نظام حکومت؛ معیشت و معاشرتی نظاموں کے باعث اور عالمی طور چہار سو یکساں دینی کشائش کے نام نہاد دعویٰ کے باعث؛ اگر قرآن حکیم کی مندرجہ بالا آیات کو وقتی طور پر موقوف قرار دے بھی دیا جائے، تو نقلی و عقلی دلائل سے اس کا فائدہ صرف ان افراد کے حق میں ثابت ہو سکتا ہے جو کفریہ ممالک کے پیدائشی شہری ہوں یا وہ افراد جو ان ممالک میں غیر مستقل مقیم ہوں نہ کہ مستقل اقامت کی نیت سے ہجرت کرنے والے [مستقل اقامت کے مسئلہ کی مکمل تفصیل کے لیے "الولاء والبراء کی حقیقت" کا مطالعہ فرمائیں]۔ بہر کیف پیدائشی شہری یا غیر مقیم افراد کے لیے بھی مکی دور کی سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں لازم ہے کہ وہ طاغوتی نظاموں سے قلبی؛ قولی اور فعلی برات کا مظاہرہ کرتے رہیں اور معروف میں اس کی اتباع اور منکر میں اس سے اجتناب کو لازم ٹھہرائیں؛

نہ کہ ان طاغوتی نظاموں کے مرہون منت اپنی دنیاوی زندگی کو مزین کرنے کی سعی کو اپنی زندگی کا مقصد ٹھہرائیں۔

درحقیقت یہ دعویٰ کہ نام نہاد مسلمان اور کفریہ ممالک کے معاشرے بھی یکساں مماثلت کے حامل ہیں؛ محض حقائق سے چشم پوشی یا جہالت کا نتیجہ ہے۔ کفریہ ممالک میں طاغوتی و دجالی نظاموں نے مکمل طور پر دینی طبقہ کے تمام تعبیرات؛ تاویلات اور اعمال کو اپنے تابع کر لیا ہے اور اپنے اپنے معاشروں کو ایک نام نہاد شخصی درجہ کی دینی اور دنیاوی آزادی کے دجل میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس آج بھی اکثر و بیشتر نام نہاد مسلمان ممالک میں یہی عالمی طور پر مسلط شدہ طاغوتی نظام اپنی تمام تر آہنی کوشش کے باوجود دینی طبقہ کو کلی طور پر اپنے ماتحت کرنے سے قاصر ہے اور معاشرہ میں باوجود بے دینی اور کفریہ اقوال و افعال پر مبنی فکری اور عملی سعی کے تاحال کفریہ ممالک کے مساوی نتائج کے حصول میں ناکام ہے اور آج بھی مسلمان معاشرے میں دینی اور دنیاوی طبقات کے طور پر نہ صرف فکری تقسیم موجود ہے بلکہ عملی تقسیم بھی موجود ہے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہ و صحبہ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

شریعت کی حقیقت

✓ حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ، ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس نے سوال کیا کہ "یا رسول اللہ ﷺ ایک نصرانی شخص ہے، جو انجیل کے موافق عمل کرتا ہے اور اسی طرح ایک یہودی شخص ہے، جو تورات کے احکام پر چلتا ہے اور **وہ اللہ پر، اس کے رسول پر ایمان بھی رکھتا ہے** [یعنی رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتا ہے] مگر اس کے باوجود وہ آپ ﷺ کے دین اور **آپ ﷺ کی شریعت پر نہیں چلتا**، تو فرمایئے کہ اس کا کیا حکم ہے؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" جس یہودی یا نصرانی نے میری بات کو سن لیا [یعنی میری دعوت اس تک پہنچ گئی] اور اس کے بعد بھی اس نے میری پیروی اختیار نہیں کی تو وہ دوزخ میں جانے والا ہے [معارف الحدیث ۔ حصہ اول ۔ کتاب الایمان ۔ حدیث ۹؛ اخرجہ الدارقطنی فی الافراد]

آج یہ حدیث بعینہ ہر اس مسلمان پر بھی چسپاں ہوتی ہے؛ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کا دعویٰ بصورت قولی تصدیق تو کرتا ہے مگر انفرادی، باہمی یا اجتماعی طور پر شریعت کا طوق گردن میں ڈالنے کا روادار نہیں۔

کیا شریعت صرف چند عبادات بصورت "ارکان اسلام" کا مجموعہ نہیں ہے؟

حدیث جبرئیل میں بیان کردہ ارکان اسلام کی تعداد پانچ ہے اور یہ اسلام کے واضع اور عظیم شعائر ہیں اور ان کو مکمل کرنے کے ساتھ اسلام مکمل ہوتا ہے اور ان کے ترک سے انقیاد [اطاعت، فرمانبرداری] کی گرہ ڈھیلی پڑجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی ﷺ نے جس دین اسلام کا ذکر فرمایا اس سے مقصود بندے کا اپنے رب کے لیے مطلقاً مطیع ہونا ہے۔ جو قدرت رکھتا ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے اس کے لیے دین کو خالص کرے اور پانچ ارکان کو ادا کرے۔ [مزید تفصیل کے لیے "عبادت اور عبادات کی حقیقت" کا مطالعہ لازمی ہے]

ان ارکان کے علاوہ واجبات اور فرائض کا وجوب، اسباب مصالح [وہ باتیں یا معاملے جن سے بھلائی ہو، مصلحتیں، نیکیاں] پر مبنی ہے وہ تمام لوگوں پر واجب نہیں ہیں۔ بعض چیزیں فرض کفایہ ہیں جیسے اقدامی جہاد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور وہ اعمال جو ان کے تابع ہیں، مثلاً امارت؛ فیصلہ، فتویٰ، پڑھنا، حدیث بیان کرنا وغیرہ؛ اور وہ اعمال جو لوگوں کے حقوق کی وجہ سے واجب ہوتے ہیں، تو اسباب کی موجودگی میں واجب ہوں گے، عدم موجودگی میں واجب نہیں ہوں گے، جیسے قرض کی ادائیگی، امانتوں کو واپس کرنا، غصب شدہ چیز کو واپس کرنا، حقوق کا انصاف، خون، مال، عزت وغیرہ، بیوی اور اولاد کے حقوق، صلہ رحمی وغیرہ۔ پس ان میں جو زید پر واجب ہے وہ عمرو پر واجب نہیں، بخلاف شہادتین، پانچوں نمازیں، رمضان کا روزہ،،، زکوۃ اور بیت اللہ کا حج کے۔

شریعت سے کیا مراد ہے اور ایک مسلمان کی زندگی میں شریعت کا کتنا عمل ودخل ہے؟

شریعت کی چند تعریفیں مندرجہ ذیل ہیں؛

- "وہ **سیدھا راستہ** جو واضح ہو"۔ امام راغب اصفہانی، مفردات القرآن:۲۵۹
- "بندوں کے لئے **زندگی گزارنے کا وہ طریقہ** جسے اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا اور بندوں کو اس پر چلنے کا حکم دیا۔ " ابن منظور، لسان العرب،۸:۱۷۵
- "شریعت سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے بطور **ضابطہ حیات** جاری فرمائے ہیں۔" عبد القادر الرازی، مختار الصحاح:۳:۴۷

انسان کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ کسی نظریہ یا عقیدہ کے بغیر عمل کر ہی نہیں سکتا۔ عقیدہ کے معنی ہیں ایک **"مقصود کی خواہش"**؛ جب تک مقصود نہ ہو اس کے حصول کے لیے عمل کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں "اعملوا الصلحات" کا ذکر ہے وہاں "امنوا" کا ذکر اس سے پہلے موجود ہے، اسلام کے نظریہ کو دل سے تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ عمل کی بنیاد نظریہ یا عقیدہ ہے، تو ایک مسلمان جس کے عقیدہ کی بنیاد ہر قسم کے طاغوت کا انکار اور خالص توحید کا اقرار ہے، اس کے بھی ہر عمل کا مبنیٰ اس کا یہی عقیدہ ہے اور اس کے تمام ظاہری اور باطنی اعمال کا نام شریعت ہے۔ شریعت نے اعمال کو مندرجہ ذیل پانچ دائروں میں تقسیم کیا ہے۔

- وہ اعمال جن کے کرنے میں ثواب اور چھوڑنے پر عذاب ہوتا ہے۔
- وہ اعمال جن کے کرنے میں عذاب اور چھوڑنے پر ثواب ہوتا ہے۔
- وہ اعمال جن کے کرنے میں ثواب اور چھوڑنے پر کوئی وعید نہیں ہے۔
- وہ اعمال جن کے کرنے پر کوئی وعید نہیں ہے اور چھوڑنے پر ثواب ہوتا ہے۔
- مباح اعمال

ہر مسلمان کا کوئی بھی ظاہری و باطنی عمل انہی مندرجہ بالا دائروں میں گردش کرے گا، جن کو قرآن اور حدیث کی سند حاصل ہے۔ یہاں تک کہ عمل مباح بھی صرف اسی وقت عمل مباح کہلائے گا جب قرآن اور حدیث سے اس کے کسی اور دائرے میں موجودگی کی دلیل عنقا ہوگی؛ جو اس عمل کے مباح ہونے کی دلیل ہے۔

کیا میں اپنی زندگی کو اپنی مرضی اور اپنے اصولوں کے مطابق نہیں گزار سکتا؟

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اہل سنت والجماعت کی ترجمانی میں فرماتے ہیں کہ صحیح و غلط، عدل و ظلم، اعتدال و انتہا کے درمیان فرق جاننے کے صحیح طریقے کو جاننے سے **عقل مکمل طور پر قاصر** ہے۔ ان فلاسفہ کے بے تکے دعووں کو قبول کرنے کا مطلب تعلیمات انبیاء کی تردید ہے جو کہ انسان کی بنیادی ضرورت "**رہنمائی**" سے انکار ہے۔

اس کائنات میں دو ہی طرح کے قوانین ہیں؛ **اول؛ وہ جو خدا نے بنائے** اور **دوم؛ وہ جو انسان وضع کرتا ہے**۔ جس طرح مادی کائنات سے متعلق فطری قوانین خدا نے بنائے اسی طرح انسانی رویے کے فطری اظہار سے متعلق قوانین بھی خدا نے بنائے جو شریعت کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ قوانین ایسے نہیں جنہیں مشاہدہ، تجربیت یا عقلیت کی روشنی میں اخذ کیا جاسکے۔ اس امکان کو ماننا در حقیقت ضرورتِ نبوت کا انکار کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے علاوہ انسانی زندگی مرتب کرنے کا جو بھی قانون انسان وضع کرتا ہے وہ سرکشی و بغاوت ہے نہ کہ اس کی فطرت کا تقاضا۔ پس فطرت سلیمہ وہی ہے، جو اسلامی احکامات اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ جو شخص اسلامی احکامات کو اپنی فطرت اور مزاج کے خلاف محسوس کرتا ہے، در

حقیقت فطرت غیر سلیمہ کا مالک ہے اور ایسی ہی غیر سلیم فطرت کے تزکیہ کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے تابع بنایا جائے۔

- ✓ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ "تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی **خواہشات اس چیز (دین و شریعت) کی تابع نہیں ہوتیں** جس کو میں اللہ کی جانب سے لایا ہوں" [مشکوۃ شریف۔ جلد اول۔ کتاب اور سنت کو مضبوطی سے پکڑنے کا بیان۔ حدیث ۱۶۴]

قرآن کریم کا حلفیہ بیان ہے کہ جو لوگ آپ ﷺ کے فیصلہ پر راضی نہ ہوں اور اس کے لئے سر تسلیم خم نہ کریں وہ ایمان سے محروم ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے۔

- ✓ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا. [سورۃ النساء؛ ۶۵] "سو قسم ہے تیرے رب کی **وہ مومن نہ ہوں گے** یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں، اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے، پھر نہ پاویں اپنے دل میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔"

کیا شریعت صرف [حرام؛ حلال؛ فرض؛ سنت] [یہ کرو] اور [یہ نہ کرو] کا مجموع ہے؟

شریعت کا اصل مقصد تو فقط آخرت میں جہنم سے نجات اور جنت میں دخول ہے، مگر اس کا مطلب قطعی طور پر یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں وہ ایک فقط **امر** [کرو] و **نہی** [نہ کرو] کی بنیاد پر ایک بے مقصد نظام حیات ہے۔ بلکہ جتنا گہرا؛ با مقصد اور باربط تعلق شریعت کا ہر مسلمان سے بیک وقت اس کی انفرادی؛ باہمی اور اجتماعی زندگی سے ہے، انسان کا اپنا وضع کردہ کوئی بھی نظام اس کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تو جب شرعی احکام کی غیر شرعی نظام میں غیر فطری پیوندکاری کی جاتی ہے تو شریعت محض "[حرام؛ حلال؛ فرض؛ سنت] [یہ کرو] اور [یہ نہ کرو]" کا مجموع نظر آتی ہے۔

شریعت دین اسلام کی چھ مصلحتوں کی محافظ ہے اور ان مصلحتوں کا تعلق ہر مسلمان کی دنیاوی اور اخروی زندگی سے ہے اور یہی محافظت **مقاصد شریعت** کہلاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں؛

أ. **دین کی حفاظت؛** دین کے شعار [الصلوۃ؛ زکوٰۃ؛ امر بالمعروف و نہی عن المنکر؛ بذریعہ جہاد فی سبیل اللہ اسلام کی طرف دعوت دینا؛ الولا و البراء کی بنیاد پر تعلقات؛ حدود کے نفاذ وغیرہ] کے قیام کو

حکومت کی اولین ترجیح قرار دینا۔ مسلمانوں کے ایک گروہ پر علم کا حصول فرض اور بقیہ عوام پر ان کی پیروی کو لازم قرار دینا۔ مرتد کے لیے موت کی سزا قرار دینا وغیرہ۔

ب. **انسانی جان کی حفاظت؛** قتل عمد میں قصاص کو اور قتل خطاء میں دیت کو مشروع قرار دینا۔ حملہ آور دشمن سے دفاع کی اجازت دینا۔ امراض کا علاج لازم اور خود کشی کو حرام قرار دینا۔ ہر وہ چیز جو مضر صحت ہے اس کو حرام قرار دینا وغیرہ۔

ت. **نسل کی حفاظت؛** زنا کو حرام [شادی شدہ زانی کو رجم اور غیر شادی شدہ زانی کو کوڑوں اور جلاوطنی کی حد] قرار دینا۔ فحاشی اور ذریعہ فحاشی کے تمام اسباب کو حرام قرار دینا۔ عورتوں کے لیے حجاب کے احکام اور مرد وزن کے لیے غض بصر کے احکام دینا۔ عدت کے احکام دینا وغیرہ۔

ث. **عزت کی حفاظت؛** قذف کی حد قرار دینا۔ غیبت اور غلط القاب سے پکارنے کو ممنوع قرار دینا وغیرہ۔

ج. **عقل کی حفاظت؛** شراب و دیگر تمام نشہ آور اشیاء کو حرام قرار دینا؛ اور اس کے استعمال کرنے والے پر حد واجب قرار دینا اور اس کے کاروبار میں ملوث تمام اشخاص کو ملعون قرار دینا وغیرہ۔

ح. **مال کی حفاظت؛** چوری اور ڈاکہ زنی کو حرام اور قابل حد جرائم قرار دینا۔ سود کو حرام قرار دینا۔ دھوکے والی تمام خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا۔ حرام طریقوں اور کاروبار کو ممنوع قرار دینا وغیرہ۔

اس شریعت کا نفاذ کس کی ذمہ داری ہے؟

سورۃ المائدۃ کی آیت نمبر ۴۴ تا ۴۷ شریعت کے اجتماعی؛ باہمی اور انفرادی ذمہ داری کے دائروں کی وضاحت بھی کرتی ہے اور غیر ذمہ داروں کی دین اسلام میں جگہ اور حیثیت کا تعین بھی کرتی ہے۔

اجتماعی ذمہ داری؛

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا

تَشۡتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَمَنۡ لَمۡ يَحۡكُمۡ بِمَا أَنۡزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الۡكَافِرُونَ [سورۃ المائدۃ؛ ۴۴] بیشک ہم نے توریت نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے **یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں** اور مشائخ اور علماء بھی کیونکہ وہ کتاب خدا کے نگہبان مقرر کیے گئے تھے اور اس پر گواہ تھے (یعنی حکم الٰہی کا یقین رکھتے تھے) تو تم لوگوں سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا اور **جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔**

یہ آیت دینی و دنیاوی اولو الامر [حکمران، علماء، مشائخ اور مفتیان] سے متعلق ہے جو مسلمان معاشرہ کے اجتماعی معاملات کے ذمہ دار ہیں۔ ان پر اس آیت کی رو سے لازم ہے کہ وہ معاشرہ میں خدا کے نازل کردہ شریعت کی بالادستی کو اجتماعی سطح پر یقینی بناتے ہوئے معاشرہ میں احکام شریعہ کی تشہیر، تلقین اور اس کے نفاذ کو لازم بنایں اور جو ایسا نہ کرے اس کا مقام دین اسلام میں کافر کا ہے؛ اس کفر کے مرتکب افراد کا کفر حقیقی یا مجازی ہونا ایک دوسری بحث ہے، مگر اس کفریہ عمل کی وجہ سے وہ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری اور امامت سے معزول ہو جاتا ہے اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کو تبدیل کر دیں؛

- ✓ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا نبی ﷺ نے ہم لوگوں کو بلایا اور ہم نے آپ ﷺ کی بیعت کی آپ ﷺ نے جن باتوں کی ہم سے بیعت لی وہ یہ تھیں، کہ ہم بیعت کرتے ہیں اس بات پر ہم اپنی خوشی اور اپنے غم میں اور تنگدستی اور خوشحالی، اور اپنے اوپر ترجیح دیئے جانے کی صورت میں سنیں گے اور اطاعت کریں گے اور حکومت کے لئے **حاکموں سے نزاع نہیں کریں گے لیکن اعلانیہ کفر پر**، جس پر اللہ کی طرف سے دلیل ہو۔ [صحیح بخاری ۔ جلد سوم ۔ فتنوں کا بیان ۔ حدیث ۱۹۷۸]

باہمی ذمہ داری؛

وَكَتَبۡنَا عَلَيۡهِمۡ فِيهَا أَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ وَالۡعَيۡنَ بِالۡعَيۡنِ وَالۡأَنۡفَ بِالۡأَنۡفِ وَالۡأُذُنَ بِالۡأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالۡجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنۡ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنۡ لَمۡ يَحۡكُمۡ بِمَا أَنۡزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ [سورۃ المائدۃ؛ ۴۵] اور ہم نے ان لوگوں کے لیے تورات میں **یہ حکم لکھ دیا تھا**، کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے، لیکن جو شخص بدلہ معاف کر دے وہ اس کے لیے کفارہ ہو گا اور **جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف ہیں۔**

یہ آیت اپنے سے ماقبل آیت کے تحت تشہیر کردہ، تلقین کردہ اور حکم شدہ ظاہری قوانین کی عملی شکل ہے اور ان دینی ودنیاوی اولوالامر [جج؛ ادارتی افسران؛ مفتیان؛ جماعتی یا پنچایتی ذمہ داران وغیرہ] سے متعلق ہے جو معاشرہ میں مسلمانوں کے اجتماعی اور باہمی معاملات میں ان قوانین کے نفاذ پر مامور ہیں۔ اور اس آیت کی رو سے باہمی معاملات میں اللہ کے نازل کردہ احکام کے نفاذ میں کوتاہی اور اس کے نتیجے میں کسی ایک فریق پر زیادتی اللہ کے نزدیک ظلم ہے اور جو ایسا کرے اس کا مقام دین اسلام میں ظالم کا ہے اور مسلمانوں پر ظالم کو معزول کرنا نہیں بلکہ اس کو ظلم سے روکنا لازم ہے ورنہ تمام معاشرہ تباہ ہو سکتا ہے۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ظالم یا مظلوم بھائی کی مدد کرو، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن ظالم کی کس طرح مدد کریں، آپ ﷺ نے فرمایا **اس کا ہاتھ پکڑ لو** [یعنی اس کو ظلم سے روکو]۔ [صحیح بخاری ۔ جلد اول ۔ گری پڑی چیز اٹھانے کا بیان ۔ حدیث ۲۳۴۱]
- ✓ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے لوگو تم یہ آیت پڑھتے ہو "[یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا عَلَیْکُمْ أَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَیْتُمْ؛ ۵:۱۰۵] تک "اے ایمان والو تم اپنی جانوں کی فکر کو ضروری سمجھو، کوئی گمراہ تمھیں ضرر نہیں پہنچا سکتا بشرطیکہ تم ہدایت یافتہ ہو"؛ جبکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ اگر لوگ **ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اُسے نہ روکیں** تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کردے۔ [جامع ترمذی ۔ جلد دوم ۔ فتنوں کا بیان ۔ حدیث ۴۳]

انفرادی ذمہ داری؛

وَقَفَّیْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِیسَى ابْنِ مَرْیَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَیْنَاهُ الْإِنْجِیلَ فِیهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِینَ ۝ وَلْیَحْکُمْ أَهْلُ الْإِنْجِیلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِیهِ وَمَنْ لَمْ یَحْکُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُونَ [سورۃ المائدۃ؛ ۴۶، ۴۷] اور ان پیغمبروں کے بعد، انہی کے قدموں پر، ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے اور ان کو انجیل عنایت کی جس میں ہدایت اور نور ہے اور تورات کی، جو اس سے پہلی کتاب (ہے) تصدیق کرتی ہے اور **پرہیز گاروں کو راہ بتاتی اور نصیحت کرتی ہے**۔ اور اہل انجیل کو چاہیئے کہ جو احکام، خدا نے اس میں نازل فرمائے ہیں اس کے مطابق حکم دیا کریں اور **جو خدا کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے گا تو ایسے لوگ نافرماں ہیں**۔

حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اور انجیل مقدس کے متعلق دو حقیقتیں مُسلّمہ ہیں؛

- **اول**؛حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے، مگر ان کی حیثیت اہل یہود کے انتظامی امور میں پچھلے انبیاء[جن کا ذکر آیت نمبر ۴۴ میں گذر چکا ہے]کی مانند نہیں تھی اور نہ ہی ان کے حوارین ان کی زندگی میں ایک منظم معاشرہ کی شکل اختیار کر سکے، جن کے حکمران کے طور پر آپ علیہ السلام ان کے اجتماعی معاملات پر شریعت کا نفاذ کرتے؛
- **دوم**؛انجیل مقدس شرعی احکامات کا نہیں بلکہ مواعظ حسنہ کا مجموع ہے اور اس کے مباحث کا مرکز تزکیہ نفس اور انسان کے اپنے خالق کے ساتھ تعلقات پر ہے۔

ان دونوں حقیقتوں کی روشنی میں اوپر والی آیت واضح کرتی ہے کہ اس کا تعلق مسلمانوں کے ان انفرادی معاملات سے ہے جو عبادات، پرہیز گاری اور تزکیہ نفس کے زمرہ میں آتے ہیں۔ معاشرہ میں جوان معاملات میں خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے اور ظاہری شریعت کی پیروی کو اپنے اوپر لازم نہ ٹھیرائے، اس کا مقام دین اسلام میں فاسق کا ہے اور عام مسلمانوں کو ان کے ساتھ تعلقات میں احتیاط برتنے کا حکم دیا ہے۔

- ✓ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے **فاسق لوگوں** کی دعوت قبول کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [مشکوۃ شریف۔ جلد سوم۔ ولیمہ کا بیان۔ حدیث ۴۲۷]
- ✓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "**منافق** کو سردار مت کہو کیونکہ اگر وہ سردار ہو تو بے شک تم نے اپنے رب عزوجل کو ناراض کر دیا"۔ [سنن ابوداؤد۔ جلد سوم۔ ادب کا بیان۔ حدیث ۱۵۶۹]

شریعت میں مصلحت یا حفاظتی تدابیر کا کیا مقام ہے؟

اس سوال کے مفصل جواب کے لیے " رخصت اور حفاظتی تدبیر کی حقیقت "والے مضمون کا مطالعہ فرمائیں؛ مگر اس مضمون کی نسبت سے ایک مختصر جواب مطالعہ کے لیے حاضر ہے۔

- ✓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتے ہیں کہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو کاموں میں اختیار دیا جاتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے **آسان کام کو اختیار فرمالیتے؛ اگر وہ گناہ نہ ہوتا**، اگر وہ کام گناہ (کا سبب) ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ اس سے دور رہنے والے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لئے (کبھی

کسی بات میں کسی سے)انتقام نہیں لیا مگر اللہ تعالیٰ کی حرمت کے خلاف (کوئی)کام کیا جاتا، تو آپ ﷺ ضرور اللہ کے لئے اس کا انتقام لیتے تھے۔ [صحیح بخاری ۔ جلد دوم ۔ انبیاء علیہم السلام کا بیان ۔ حدیث ۸۱۴]

شریعت میں مصلحت اس چیز کو کہا جائے گا جس کا باطل ہونا شریعت کی نصوص یا اصول سے ثابت نہ ہو۔ البتہ جب کسی چیز کا باطل ہونا کسی شرعی نص یا شرعی اصول سے ثابت ہو گیا تو اب اس ہر چیز کو اس کی حرمت کے باوجود اختیار کرنا "اردو" استعمال کے لحاظ سے 'مصلحت' ہو تو ہو؛ شرعاً "مصلحت" نہ ہو گا۔ فقہائے اسلام کے نزدیک مصلحت کا اعتبار کرنے کے لئے شرعاً مندرجہ ذیل دو شرطیں عائد ہوتی ہیں؛

- **شرط اول**؛ مصلحت؛ مقاصد شریعت کی ترتیب میں آتی ہو؛ امام شاطبی رحمہ اللہ "الموفقات" کے جز اول میں فرماتے ہیں کہ جان و مال اور عقل و نسل کی حفاظت مقاصد دین میں شامل ہے مگر **حفظ دین** سب سے پہلے اور مقدم ہے۔ دیگر فقہاء بھی مصلحت کی اس شرط پر متفق ہیں کہ وہ مقاصد شریعت کے ترتیب کے تابع ہو جو کہ حفظ دین سے شروع ہوتے ہیں اور دین کے بعد ہی جان، مال، عقل اور نسل کی حفاظت کی نوبت آتی ہے۔ آج تک کسی فقیہ نے اِس بات سے اختلاف نہیں کیا کہ حفظ دین سب سے بڑی مصلحت ہے۔
- **شرط دوئم**؛ مصلحت کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مصالح مرسلہ میں آنی چاہیے؛ یعنی وہ ظاہر شریعت کی کسی نص سے متصادم نہ ہو؛ مثلاً سود کے مال کو صدقہ کرنے میں بظاہر مصلحت نظر آتی ہے مگر شریعت اسے مصلحت نہیں مانتی۔ ایسی صورت میں "**مصلحت کا تقاضا؛ مفسدت {فساد} ہے**"۔ اب اگر کوئی شخص نصوص سے متعارض چیز کو مصلحت مانتا ہے تو نصوص کا مفسدت {فساد} ہونا خود بخود لازم آجائے گا؛ **معاذ اللہ**۔

جہاں تک اخف الضررین {کمتر برائی} کے مسئلہ کا تعلق ہے تو اگرچہ یہ مصالح [وہ باتیں یا معاملے جن سے بھلائی ہو، مصلحتیں، نیکیاں] اور مفاسد [خرابیاں، برائیاں، فتنے، جھگڑے، فسادات] کی ترجیح کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے مگر اس کی بنیاد پر دین میں تغیر کو جائز یا کمتر برائی کو عین دین کے طور پر پیش کرنا محض ایک گمراہی ہے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً كثیرا كثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

گناہوں کی حقیقت

اللہ تعالیٰ جب ہمیں گناہوں سے بچنے اور ان کو چھوڑ دینے کا حکم دیتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ ہم اپنے گناہوں کے ارتکاب سے اس کو کسی قسم کا نقصان پہنچاسکتے ہیں بلکہ اس حکم کا مقصود صرف اور صرف ہماری بھلائی ہے اور وہ بھی صرف اخروی بھلائی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پیروی کرتے ہوئے جب انسان گناہوں سے پرہیز کرتا ہے تو اس کو اس دنیا میں بھی اس کے مثبت اثرات نظر آتے ہیں۔اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکامات کی نافرمانی کرتے ہوئے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے، وہ اپنی اس دنیاوی زندگی میں بھی ان کے منفی اثرات کو محسوس کرتا ہے، چاہے دنیاوی تاویلات کے ذریعے اپنے دل کو مطمئن کرتا رہتا ہو اور اپنے فسق و فجور کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا ہو۔ ہمارے سلف صالحین جب بھی کسی دنیاوی تکلیف یا پریشانی میں مبتلا ہوتے تو ان کا ذہن فوراً اپنے گناہوں کی طرف جاتا اور وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنے میں لگ جاتے۔

- ✓ وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ [سورة الشوری ؛٣٠] "اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو **تمہارے اپنے فعلوں سے** اور وہ بہت سے گناہ تو معاف ہی کر دیتا ہے۔"
- ✓ وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ [سورة الروم ؛٣٦] "اور جب ہم لوگوں کو اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو اس سے خوش ہو جاتے ہیں اور اگر **ان کے عملوں کے سبب جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہیں کوئی گزند پہنچے** تو ناامید ہو کر رہ جاتے ہیں"

کیا میرے گناہوں کا میری دنیاوی زندگی پر بھی کوئی اثر ہے؟

بلاشبہ گناہوں کا انسانی زندگی پر بڑا اثر ہوتا ہے اور امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی مشہور تصنیف "الجواب الکافی" میں انسان پر گناہوں کے اٹھارہ منفی اثرات بیان کیے ہیں، جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں؛

- **علم میں کمی کا سبب؛** علم ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے اور اس کی نافرمانی علم کی کمی کا سبب بنتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے امام وایع بن جارح رحمہ اللہ سے اپنی یادداشت کی کمزوری کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے اللہ کی نافرمانی چھوڑنے کا حکم دیا اور کہا کہ علم ایک نور ہے اور یہ نور فاسقوں اور فاجروں کو نہیں دیا جاتا۔
- **رزق میں کمی کا سبب؛** جس طرح خدا خوفی اور اس کا تقوی رزق میں فراوانی کا باعث بنتا ہے تو وہیں اس کی نافرمانی رزق میں کمی کا باعث بنتی ہے۔
- **دل اور بدن کی کمزوری؛** انسانوں کے گناہوں کا براہ راست اثر اس کے دل کی کمزوری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا اثر اس کے تمام بدن پر نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔
- **عذاب شدہ اقوام کی میراث؛** ہر گناہ کسی نہ کسی عذاب شدہ قوم کی میراث ہے اور وہ قوم اس گناہِ واحد یا ان گناہوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی لعنت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ جیسے قوم نوح کا شعار ان کے مفسدانہ عقائد اور ان پر ہٹ دھرمی تھی؛ ہم جنس پرستی قوم لوط کا شعار تھا؛ ناپ تول میں کمی اور لوگوں کے حقوق کو غصب کرنا قوم شعیب کا وطیرہ تھا؛ فتنہ وفساد اور جابرانہ حکومت قوم فرعون کی نشانی تھی۔ سو ہر گناہ کسی نہ کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی نشانی ہے جس سے ہر مسلمان کو بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
- **حقارت یا اہانت کا باعث؛** الحسن البصری رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ "وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیر اور ذلیل ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی؛ اگر وہ اللہ کے سامنے عزت دار ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرماتا"۔

- **دوسروں پر اثر؛** ایک گناہ گار کے گناہوں کے برے اثرات کا اثر اس کے قرب وجوار میں موجود جانوروں پر بھی پڑتا ہے اور وہ بھی اس کے گناہوں کے باعث آنے والی تکالیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔
- **خفت اور عاجزی کا سبب؛** ہر قسم کی عزت اور بلندی صرف اللہ تعالٰی کی اطاعت میں ہے۔ امام ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "میں نے گناہوں کے سبب دلوں کو مرتے دیکھا ہے اور ان گناہوں کی عادت میں مبتلا ہونے کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں خفت اور عاجزی کا سبب بنتا ہے"۔
- **دلوں کی سختی کا سبب؛** جب اللہ تعالٰی کی نافرمانیاں بڑھتیں ہیں تو دل سخت ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا "ہر گز نہیں! واقعہ یہ ہے کہ **زنگ چڑھ گیا ہے ان کے دلوں پر** ان (اعمالِ بد) کا جو وہ کماتے رہے ہیں" [سورۃ المطففین؛۱۴]۔
- **زمین پر فساد کا سبب؛** اللہ تعالٰی نے فرمایا "خشکی اور تری میں لوگوں کے **اعمال کے سبب فساد پھیل گیا** ہے تا کہ اللہ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں" [سورۃ الروم؛۴۱]۔
- **شرم وحیا کی گمشدگی؛** شرم وحیا دل کی زندگی کی جڑ ہے اور ہر اچھائی کی بنیاد ہے اور گناہوں کا ارتکاب اس کی دل سے گمشدگی کا سبب بنتا ہے۔
- **اللہ تعالٰی کی اطاعت سے دوری؛** اگر گناہوں کی کوئی اور سزا نہ ہوتی، تو صرف اللہ تعالٰی کی اطاعت سے دوری ہی ان کو چھوڑنے اور ان سے دور رہنے کے لئے کافی وجہ ہوتی۔

اگر ہم ان گناہوں کے برے اثرات پر غور کریں اور ان کو اپنی یاداشت کا مستقل حصہ بنالیں تو گناہوں سے بچنا اور اپنی تکالیف اور پریشانیوں میں ظاہری اسباب سے نہیں، بلکہ "مسبب الاسباب" یعنی اللہ تعالٰی سے رجوع کرنا معمول بن سکتا ہے۔

کیا صغیرہ گناہوں کا ارتکاب بھی فکرمندی کی بات ہے؟

صغائر، یعنی صغیرہ گناہ وہ ہیں جن سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع تو فرمایا ہے، لیکن ان کی کوئی سزا بیان نہیں فرمائی یا ان کے بارے میں سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے یا اظہار ناراضگی نہیں فرمایا۔ مندرجہ

ذیل قرآن کی آیت اور حدیث نبوی ﷺ میں کبائر سے بچنے کی شرط پر صغائر کے بخشش کی بشارت موجود ہے؛

- ✓ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۔۔۔۔۔[سورۃ النجم؛ ۳۲]"جو **صغیرہ گناہوں کے سوا** بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔بے شک تمہارا پروردگار بڑی بخشش والا ہے۔۔۔۔۔۔"۔
- ✓ ارشاد نبوی ﷺ ہے "پانچ نمازیں اور جمعہ سے جمعہ تک اپنے درمیانی اوقات میں سرزد ہونے والے گناہوں کے لئے کفارہ ہیں، جب تک **کبائر کا ارتکاب نہ کرے**۔[صحیح مسلم۔ جلد اول۔ وضو کا بیان۔ حدیث ۵۵۰]

مگر فکرمندی کی بات یہ ہے کہ چند صورتحال میں صغائر کبائر میں تبدیل ہو جاتے ہیں؛ مثلاً؛

- صغیرہ گناہ کو معمولی سمجھ کر، اس پر مسلسل عمل کرتے رہنا بھی صغیرہ کو کبیرہ بنا دیتا ہے۔
- تکبر کی وجہ سے صغیرہ گناہ پر عمل کرنا بھی صغیرہ کو کبیرہ بنا دیتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ؛
- ✓ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنے بائیں ہاتھ سے کھانا کھایا تو آپ ﷺ نے فرمایا "اپنے دائیں ہاتھ سے کھا" تو وہ آدمی کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا آپ ﷺ نے فرمایا "(اللہ کرے) تو اسے اٹھا ہی نہ سکے" اس آدمی کو سوائے **تکبر اور غرور کے اور کسی چیز نے اس طرح کرنے سے نہیں روکا**۔ راوی کہتے ہیں کہ وہ آدمی اپنے ہاتھ کو اپنے منہ تک نہ اٹھا سکا۔[صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ پینے کی چیزوں کا بیان۔ حدیث ۷۷۱]
- بعض اوقات آدمی کی نیت صغیرہ گناہ کو کبیرہ بنا دیتی ہے؛ مثلاً؛ محفل میں سرگوشی صغیرہ گناہ ہے مگر اس سرگوشی سے مطلوب اگر تیسرے کی دل آزاری ہو تو یہی صغیرہ گناہ کبیرہ بن جائے گا۔

- اسی طرح گناہِ کبیرہ کی نیت اور مصمم ارادہ گناہِ صغیرہ ہے مگر اس گناہِ کبیرہ کا ارتکاب اس صغیرہ کو بھی کبیرہ بنا دیتا ہے۔
- بعض اوقات صغیرہ گناہ کا نتیجہ اسے کبیرہ گناہ بنا دیتا ہے؛ مثلاً؛ کسی غیر عورت کا غیر محرم مرد کے ساتھ دلکش اور لوچ دار آواز سے گفتگو کرنا صغیرہ گناہ ہے؛ لیکن اگر یہ گفتگو ناجائز تعلقات پر منتج [بطور نتیجہ] ہو تو پھر یہ کبیرہ گناہ بن جائے گا۔

کیا فاسق [پوشیدہ گناہ کرنے والا] اور فاجر [اعلانیہ گناہ کرنے والا] کے گناہوں میں کوئی فرق ہے؟

یہ وہ اہم ترین مسئلہ ہے جس کی ہلاکت کا احساس ہماری اکثریت کے ذہنوں سے تقریباً محو ہو چکا ہے اور ہماری پوری توجہ کا مستحق ہے کیونکہ اسی مسئلہ پر ایک مسلم معاشرہ کی سلامتی اور اس کے دین کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ اور یہ اہم مسئلہ معاشرہ میں کھلے عام گناہوں کا ارتکاب کرنا یا ان کی کھل کر اشاعت کرنا۔

- ✓ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ "میری تمام امت کے گناہ معاف ہوں گے **مگر وہ شخص جو اعلانیہ گناہ کرتا ہو** اور یہ تو جنون کی بات ہے کہ رات کو ایک آدمی کوئی کام کرے اور اللہ اس پر پردہ ڈالے، پھر صبح ہونے پر وہ آدمی کہے کہ اے فلاں، میں نے گزشتہ رات فلاں فلاں کام کئے، رات کو اللہ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈالا اور یہ کہ صبح کو اس نے اللہ کے ڈالے ہوئے پردہ کو کھول دیا"۔ [صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ ادب کا بیان۔ حدیث ۱۰۲۶]
- ✓ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا"۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں جس کے **گناہوں پر پردہ** ڈالتا ہے، تو قیامت کے دن بھی اس پر پردہ ڈالے گا"۔ [المستدرك الحاكم؛ كتاب الايمان؛ ۴۹]
- ✓ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بچو ان ناپاک کاموں سے جن کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اور اگر تم میں سے کوئی کسی گناہ کے سبب آزمایا جائے تو اسے چاہیے کہ **وہ اس کو پوشیدہ رکھے** جیسا کہ اللہ نے اس کو پوشیدہ رکھا۔""۔ [الحاکم؛ اس حدیث کی مزید تفصیل مجھے نہیں مل سکی؛ مثلاً صحت، باب، حدیث نمبر وغیرہ]

✓ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کہتے تھے کہ "اللہ جل جلالہ کسی خاص شخصوں کے گناہ کے سبب عام لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہ کرے گا مگر **جب گناہ کی بات اعلانیہ کی جائے گی** تو سب عذاب کے مستحق ہوں گے"۔ [موطا امام مالک۔ جلد اول۔ کتاب مختلف بابوں کے بیان میں۔ حدیث ۱۷۱۷]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو بندہ دنیا میں کسی **بندے کے عیب چھپائے** گا قیامت کے دن اللہ اس کے عیب چھپائے گا" [صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ صلہ رحمی کا بیان۔ حدیث ۲۰۹۴]۔ مگر علماء کے مطابق اس حدیث سے ان لوگوں کو استثناء حاصل ہے جو کھلے عام گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں یا خود ہی ان کو لوگوں پر ظاہر کرتے ہیں، اور ایسے لوگوں کی غیبت جائز ہے تا کہ لوگ ان سے ملنے اور ان کے ساتھ معاملات کرنے سے گریز کریں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایسے کسی شخص کو غیبت سے کوئی تحفظ حاصل نہیں جو اپنے گناہوں کی تشہیر میں ملوث ہو، امام نووی رحمہ اللہ نے ایسے شخص کے متعلق فرمایا کہ ایسے شخص کی غیبت جائز ہے مگر صرف ان گناہوں کی جن کا وہ اعلانیہ مرتکب ہوا۔

کھلے عام گناہ کا ارتکاب کرنے والا یا اپنے پوشیدہ گناہ کو لوگوں پر ظاہر کرنے والا اصل میں اللہ کو اس کے عظیم مرتبہ سے گرانے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے ان گناہوں سے رکنے کا حکم اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دیا اور ان گناہوں کا ارتکاب کرنے والا جہاں اللہ کے احکامات سے بے اعتنائی کا اظہار کرتا ہے وہیں وہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے منصب سے بھی گھٹاتا ہے اور ایک مسلمان معاشرہ میں بگاڑ کا باعث بنتا ہے اور اس کے اس رویے سے اس شخص کے تکبر اور سینہ زوری کا اظہار ہوتا ہے۔

گناہوں کے کھلے عام ارتکاب یا ان کی کھلے عام اشاعت ایک صالح معاشرہ میں انتہائی منفی اثر ڈالتی ہے اور اس سے گناہ سے فطرتی نفرت میں کمی واقع ہوتی ہے اور معاشرہ میں ان گناہوں کے ارتکاب کو ایک ہلکا عمل سمجھا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس طرح کے افعال میں ملوث ہیں ان کے متعلق اللہ سبحان وتعالٰی نے فرمایا؛

✓ إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ [سورة النور؛ ۱۹] "اور جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ

مومنوں میں بے حیائی پھیلے ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہو گا۔ اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"

آج اگر ہم اپنے اطراف کا جائزہ لیں اور ان معاشروں پر نظر ڈالیں جن میں ہم زندگی گزار رہے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ گناہوں کی کثرت اور ان میں کثیر لوگوں کے ملوث ہونے کا اصل سبب، ان کی اشاعت کی مناسب روک تھام نہ ہونا، انفرادی آزادی کے بیہودہ تصور کا پرچار اور امر بالمعروف اور نہی المنکر کے فریضہ سے کوتاہی ہے۔

باوجود رسول اللہ ﷺ کی انتہائی سخت وعید کے کہ "میری تمام امت کے گناہ بخش دیے جائیں گے سوائے اس کے **جو اعلانیہ گناہ کرتا ہے**۔" ہم دیکھتے ہیں بہت سارے لوگ اس فعل میں جان بوجھ کر یا جہالت کے باعث ملوث ہیں، مثلاً آج ہر طرف سے گانے بجانے کی آواز کانوں میں پڑتی ہے حتیٰ کہ اس فعل بد سے ہماری مسجدیں بھی محفوظ نہیں اور ہر نماز کے دوران ہم مسجد کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مختلف قسم کی موسیقی سنتے رہتے ہیں اور اس کو معمولی بات سمجھ کر اگلی نماز تک پھر بھلا دیتے ہیں۔ خواتین جو بغیر حجاب اور شرعی پردے کے لوگوں کے بیچ میں پھرتی ہیں اور اسی طرح کی بیشمار مثالوں کا آج ہم سے ہر شخص اپنے ارد گرد مشاہدہ کر سکتا ہے؛ اور اپنے معاشروں کے زوال کی وجہ سمجھ سکتا ہے۔

- ✓ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ [سورة القيامة؛ ۱۴] "بلکہ انسان خود ہی **اپنے آپ کو خوب جانتا ہے**"

اس مضمون میں "فاسق" سے مراد وہ شخص ہے، جو گناہ کو اللہ کی نافرمانی اور باعث عار سمجھتے ہوئے کھلے عام اس کے ارتکاب سے باز رہتا ہے مگر تنہائی میں یہ اپنی نفسانی اور بشری کمزوریوں کے باعث اس کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کی حد تک "فاسق" کی تعریف سے، وہ منافق اور ریاکار شخص مستثنیٰ ہے، جس کا ذکر مندرجہ ذیل حدیث میں ہے؛

- ✓ نبی ﷺ نے فرمایا "میں جانتا ہوں ان لوگوں کو جو قیامت کے دن تہامہ کے پہاڑوں کے برابر نیکیاں لے کر آئیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو اس غبار کی طرح کر دے گا جو اڑ جاتا ہے۔ ثوبان ؓ نے عرض

کیا" یارسول اللہ ﷺ ان لوگوں کا حال ہم سے بیان کر دیجئے اور کھول کر بیان فرمایئے، تاکہ ہم لاعلمی سے ان لوگوں میں نہ ہو جائیں"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تم جان لو کہ وہ لوگ تمہارے بھائیوں میں سے ہیں اور تمہاری قوم میں سے اور رات کو اسی طرح عبادت کریں گے جیسے تم عبادت کرتے ہو، لیکن وہ لوگ یہ کریں گے کہ جب اکیلے ہوں گے تو حرام کاموں کا ارتکاب کریں گے"۔ [سنن ابن ماجہ۔ جلد سوم ۔ زہد کا بیان ۔ حدیث ۱۱۲۵]

ایک فکر انگیز خیال

- ✓ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "جب بندہ زنا میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے **دل سے ایمان نکل کر** اس کے اوپر سائبان کی طرح ہو جاتا ہے۔ پھر جب بندہ گناہ سے فارغ ہو جاتا ہے تو دوبارہ ایمان اس میں داخل ہو جاتا ہے" [المستدرك ۔ جلد ۱ ۔ کتاب الایمان ۔ حدیث ۵۶]

اسی طرح ایک اور مقام پر؛

- ✓ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص زنا کرتا ہے یا شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے **ایمان اس طرح نکال لیتا** ہے جیسے انسان قمیص اتار دیتا ہے" [المستدرك ۔ جلد ۱ ۔ کتاب الایمان ۔ حدیث ۵۷]

ایک مومن کے لیے یہ احساس ہی جان لیوا ہونا چاہیے کہ اگر کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے دوران ہی اس کی موت کا وقت آ گیا، تو وہ ایمان، جو واپسی کے لیے گناہ کے خاتمہ کے انتظار میں ہے، کیا اس کے ساتھ عالم برزخ میں جائے گا؟

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی اٰلہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

نفاق کی حقیقت

پچھلی امتیں اپنے اپنے انبیاء سے حق خالص پانے کے باوجود اپنی چند ہی پشتوں بعد گمراہ ہو گئیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ان کے عوام دین کے علم سے قریب قریب بالکل کورے ہو رہتے تھے؛اور اگر انہیں اس کا کچھ علم ہوتا بھی کہ حق کیا ہے تو اس سے تقریباً نابلد ہی سے ہو جاتے کہ حق کیا نہیں ہے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیرِ حق یعنی غیرِ اسلام ان کے افکار،عقائد،شرائع اور اعمال میں بتدریج گھستا رہتا ہے اور وہ ان سب کو عین دین اسلام سمجھ کر،یا کم از کم دین اسلام کے لیے رخصتوں کی صورت میں قابل برداشت تصور کر کے اپنے سینوں سے لگاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اصل دین ان کی پشت پر رہ جاتا ہے۔

کیا میں منافق ہوں؟

اس سوال کا اصل جواب بذات خود ایک دوسرے سوال میں پنہاں ہے؛اور وہ یہ ہے کہ "**کیا میں اپنے ایمان کے ضائع ہونے سے خوف زدہ ہوں؟**"۔اگر تو اس مذکورہ سوال کا جواب اثبات میں ہے تو الحمد للہ اوپر والے سوال کا جواب نفی میں ہے۔

ابراہیم تیمی رحمہ اللہ نے کہا کہ جب میں اپنے گفتار[قول]اور کردار[عمل]کو ملاتا ہوں تو مجھے اس امر کا خوف ہوتا ہے کہ[کہیں]میں جھٹلانے والوں میں نہ ہو جاؤں؛ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ نے کہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملا ان میں سب اپنے منافق ہونے کا خوف کرتے تھے؛ان میں کوئی شخص یہ نہ کہتا تھا کہ میں جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام کے ایمان پر ہوں؛حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ **نفاق کا خوف اسی کو ہو گا جو مومن ہو** اور اس سے بے خوف وہ شخص ہو گا جو منافق ہو۔

کیانفاق کی اقسام اور ان کے بنیادی محرکات کا علم ضروری ہے؟

ایمان کے دوبڑے دشمن کفر اور نفاق ہیں؛اور ان سے بچاؤ کا واحد حل ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ علم کا حصول اور اس علم کی روشنی میں **اپنے اعمال کا تنقیدی جائزہ**۔

کفر کے مقابلے میں نفاق زیادہ خطرناک ہے کیونکہ کفر کی حد کو پار کرنے والے کو کوئی بھی مسلمان معاشرہ عمومی طور پر کاٹ کرر کھ دیتا ہے اور اس کے شر سے عموماً بچنا آسان ہوتا ہے؛اس کے برعکس منافق کے ؛جو نہ صرف اپنے منافقانہ اعمال کا دفاع کرتا ہے بلکہ عین وقت کی ضرورت کے طور پر پیش کرتا ہے۔اس لیے لوگوں کو خود ان افکار؛صفات؛اعمال اور اخلاق کا علم حاصل کرنااور دوسروں کو خبردار کرنا ضروری ہے جو حقیقت ایمان کے ساتھ کسی طرح جوڑ نہیں کھاتے اور صرف منافقوں کے ہی شایان شان ہوسکتے ہیں۔مزید اللہ تعالٰی کے مندرجہ ذیل فرمان سے یہ واضح ہے کہ جیسے ظاہری کافر کی اطاعت اسلام میں ممنوع ہے اسی طرح ظاہری منافقت کے علم برداروں کی اطاعت بھی ممنوع ہے؛

- ✓ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا[سورة الاحزاب؛۴۸] "اور **کافروں اور منافقوں کا کہانہ ماننا** اور نہ ان کے تکلیف دینے پر نظر کرنااور خدا پر بھروسہ رکھنا۔اور خدا ہی کارساز کافی ہے"

نفاق کتنی اقسام کا ہوتا ہے؟

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود نفاق کی اقسام اور ان کے محرکات کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے جو کہ آج کے زمانہ پر بھی بعینہ چسپاں ہوتا ہے۔شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا؛

زمانہ رسالت میں منافق دوطرح کے تھے؛ایک تو وہ لوگ جو زبان سے کلمہ شہادت ادا کرتے تھے مگر دل ان کے پوری طرح کفر اور جحود پر جمے ہوئے تھے،صرف دھوکہ دینے کے لیے ایسا کہتے تھے۔۔۔۔؛نفاق کی اس قسم کو **نفاق اعتقادی** کہتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ جو دائرہ اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے مگر ان کے ایمان میں کمزوریاں تھیں؛ پختگی نہ تھی [اس ضعف ایمانی کی مختلف نوعیتیں تھیں]، مثلاً؛

- **ایک گروہ** تو ان لوگوں کا تھا جو ہر معاملہ میں اپنی قومی روش کو دیکھتے تھے۔۔۔۔؛
- **دوسرا گروہ** ایسے لوگوں کا تھا جن کے دلوں پر دنیا کی حقیر لذتوں کا عشق بُری طرح چھایا ہوا تھا، ایسی بُری طرح کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے لیے ان میں کوئی جگہ خالی نہیں رہ گئی تھی۔۔۔۔؛
- **تیسرا گروہ** ان لوگوں کا تھا جن کو معاشی افکار و اشغال نے اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا اور وہ اس امر کی ان کو فرصت ہی نہ لینے دیتے تھے کہ وہ آخرت کا بھی کوئی خیال کریں۔۔۔۔؛
- **چوتھا گروہ** ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جن کو آنحضرت ﷺ کی نبوت پر پورا اطمینان ہی نہیں تھا۔۔۔۔؛
- **پانچواں گروہ** ایسے افراد کا تھا جن کے اندر قبائل اور خاندانی محبت اس حد تک رچی بسی ہوئی تھی کہ اس نے ان کو مجبور کیا کہ اپنے اپنے قبیلوں کی تائید و اعانت میں ہر طرح کی مساعی پر ثابت قدم رہیں اگرچہ وہ اہل اسلام کے خلاف ہی کیوں نہ پڑتی ہوں۔۔۔۔؛

نفاق کی اس قسم کو **نفاق عملی یا نفاق اخلاق** کہتے ہیں۔"

ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اپنے ایمان کی حفاظت اور اس باطنی مرض کی شناخت کے لیے خود احتسابی کے نظریہ سے اپنے قول اور فعل کا جائزہ لے کہ وہ کہیں دانستہ یا نادانستہ طور پر اوپر بیان کیے گئے نفاق عملی کے کسی گروہ کا رکن تو نہیں ہے۔

نفاق کے بنیادی محرکات کتنے اور کون سے ہیں؟

نفاق کا رویہ اختیار کرنے پر انسان کو جو چیزیں ابھارتی ہیں ان کے پیچھے بنیادی تین محرکات ہیں؛

- اسلام کو اندر سے نقصان پہنچانے کی خواہش؛
- مادی مفاد کی پرستش؛
- حقائق دینی کے صحیح ادراک سے محرومی؛

ان میں سے پہلا محرک "نفاق عقیدہ" کے ساتھ اور تیسرا "نفاق عملی" کے ساتھ مخصوص ہے؛ جبکہ دوسرا محرک دونوں میں مشترک ہے، اس سے نفاق عملی بھی پیدا ہوتا ہے اور نفاق عقیدہ بھی۔ قرآن حکیم بھی جب منافقین کو نصیحت کرتا ہے تو اس کے پس منظر میں ان ہی تین باتوں میں سے کوئی ایک بات ضرور ہوتی ہے۔

کیا قرآن اور حدیث میں عملی نفاق کی ظاہری علامات کا بیان ہے؟

[بحوالہ حقیقت نفاق تحریر مولانا صدر الدین اصلاحی] قرآن اور حدیث میں عملی نفاق کی ۳۷ ظاہری علامات کا بیان ہے جن کی فہرست خود احتسابی کے نظریہ کے تحت اس مضمون کے آخر میں موجود ہے۔ اس فہرست کے مطالعہ سے ایک تشویش انگیز بات کا احساس ہوتا ہے کہ ایک عمل یعنی "جہاد فی سبیل اللہ" جس کا ذکر اس فہرست میں جا بجا موجود ہے؛ اور باوجود کہ اس عمل کی آج امت کو شدید ضرورت بھی ہے اور یہی عمل اسلام دشمن عناصر کی وجہ دشمنی میں سر فہرست بھی ہے، مگر ہمارے عوام و خواص کی اکثریت کی ترجیحات میں موجود ہی نہیں؛ بلکہ کچھ نام نہاد مسلمان اس عمل کی مخالفت میں ہر فورم پر اس سے براءت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

یہ ظاہری علامات کی فہرست دونوں قسموں کے منافقین [یعنی اعتقادی اور عملی منافق] کا احاطہ کر رہیں ہیں اور ان کی موجودگی کی تعداد اور شدت ہر منافق کے ذاتی حالات اور اس کے انفرادی نفسانی رجحانات پر منحصر ہے۔

کیا علاماتِ نفاق کا تعلق گناہ کبیرہ سے بھی ہے؟

بظاہر اور حقیقتاً بھی بیشتر علاماتِ نفاق کبیرہ گناہوں میں شامل ہیں اور **ان کا مرتکب گناہگار بھی ہو سکتا ہے اور منافق بھی**؛ مگر ان دونوں کے بیچ فرق اور گناہگار کی امتیازی خصوصیات کو قرآن کی مندرجہ ذیل آیات میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے؛

- ✓ وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ [سورة آل عمران؛ ۱۳۵]" اور وہ کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں **تو خدا کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں** اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور **جان بوجھ کر اپنے افعال پر اڑے نہیں رہتے**"
- ✓ وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ [سورة التوبه؛ ۱۰۲]" اور کچھ اور لوگ ہیں کہ **اپنے گناہوں کا (صاف) اقرار کرتے ہیں** انہوں نے اچھے برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا۔ قریب ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توجہ فرمائے۔ بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے"
- ✓ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ [سورة النحل؛ ۱۱۹]" پھر جن لوگوں نے **نادانی سے برا کام کیا۔ پھر اس کے بعد توبہ کی اور نیکوکار ہو گئے** تو تمہارا پروردگار (ان کو) توبہ کرنے اور نیکوکار ہو جانے کے بعد بخشنے والا اور ان پر رحمت کرنے والا ہے"

عملی نفاق کی ظاہری علامات

[طوالت کے پیش نظر قرآنی آیات اور احادیث حذف کی جارہی ہیں؛ جو حضرات تفصیل کے متقاضی ہیں وہ اصل کتاب "حقیقت نفاق تحریر مولانا صدر الدین اصلاحی" کا مطالعہ فرمائیں]

{۱} ظاہر اور باطن کا مختلف ہونا۔ {۲} خود غرض اور موقع پسند ہونا۔ {۳} مشکلات میں راست بازی و دیانت کو بیوقوفی کہنا۔ {۴} اسلام اور امت اسلامیہ کے مصائب پر خوش اور اس کی ترقی اور خوش حالی کو دیکھ کر جلنا۔ {۵} مصالح اسلامی کے خلاف سازشیں کرنا۔ {۶} اسلامی سیاسیات سے متعلق اہم امور جنہیں اہل حل و عقد کے پاس صیغہ راز میں رکھنا چاہیے ان کو عوام میں مشہور کرنا۔ {۷} ارشادات نبوی ﷺ اور فرامین الٰہی کے خلاف سرگوشیاں کرنا۔ {۸} اہل حق اور اہل باطل دونوں سے فریب کارانہ راہ و رسم رکھنا تاکہ ہر ایک کی

مخالفت سے امن حاصل رہے۔{۹}قوانین اسلام[خصوصاً جہاد کو]کو خلاف مصلحت بلکہ وجہ فساد اور ناقابل عمل سمجھنا، اس کے مقابلہ میں اپنے نفس کے وضع کردہ خود غرضانہ طرز عمل کو امن و اصلاح کا ضامن سمجھنا۔{۱۰}فتنہ پسند ہونا۔{۱۱}اسلام کو آج قبول کرنا اور کل اس سے برگشتہ ہو جانا محض اس لیے تاکہ عوام کو اسلام سے نفرت پیدا ہو۔{۱۲}کفار اور دشمنان اسلام سے دلی دوستی اور محبت یا مددگاری و معاونت کا تعلق رکھنا۔{۱۳}اسلام کی محارب اور بدخواہ قوتوں کو علمبرداران اسلام کے مقابل امداد دینا یا امداد کا وعدہ کرنا۔{۱۴}کفار کے ہاں رسوخ اور عزت کا طالب ہونا۔{۱۵}اسلامی عدالت کو چھوڑ کر ایسی عدالتوں میں اپنے معاملات لے جانا جو غیر اسلامی قوانین پر فیصلہ کرتی ہوں۔{۱۶}شریعت کے قانون پر محض اُس وقت عمل کرنا جب کہ اپنا فائدہ ہوتا ہو؛ اور جہاں یہ اندیشہ ہو کہ شریعت کا فیصلہ ہماری خواہشوں کے خلاف ہوگا وہاں اس سے دور بھاگنا اور صاف لفظوں میں اس کو ٹھکرا دینا۔{۱۷}حق کے واضح ہو جانے کے بعد اور اسے حق جان لینے کے باوجود غرور اور خود پرستی کی وجہ سے اور جھوٹی عزت کے خیال سے اپنی غلط روش پر جمے رہنا۔{۱۸}اخلاق اور تقویٰ کے بجائے نسلی اور قومی امتیازات کو وجہ عزت و ذلت سمجھنا اور انہی امتیازات کو سوال اٹھا کر امت میں نسلی گروہ بندی پیدا کرنا۔{۱۹}تقویٰ اور مغفرت کو ہیچ اور اپنے آپ کو ان چیزوں سے بلند و برتر اور بے نیاز سمجھنا۔{۲۰}اپنی عقل و فہم کو معیارِ حق سمجھنا اور قرآن کے بیان کردہ حقائق کا مذاق اڑانا یا ان پر نکتہ چینی کرنا۔{۲۱}نماز اور اذان کا بلکہ تمام شعائرِ اسلامی کا مذاق اڑانا۔{۲۲}اللہ تعالیٰ کو، اس کے رسول ﷺ کو اور اس کی آیات کو دل لگی کا سامان بنانا۔{۲۳}مالدار مسلمانوں کے مخلصانہ انفاق فی سبیل للہ پر ریاکاری کا الزام لگانا اور غریب مسلمانوں کے تھوڑے صدقات کی ہنسی اڑانا۔{۲۴}خدا سے یہ دعا کرنا کہ اگر مجھے تو نے مال دیا تو تیری راہ میں خرچ کروں لیکن مالدار ہو جانے کے بعد اس عہد کو فراموش کر دینا اور راہ خدا میں خرچ کرنے سے بخل کرنا۔{۲۵}اگر راہ خدا میں کبھی خرچ کیا بھی تو قلبی کراہیت اور ناگواری کے ساتھ۔{۲۶}راہ خدا میں صرف کرنے کو مفت کا تاوان اور لاحاصل خرچ سمجھنا۔{۲۷}دوسرے مالدار مسلمانوں کو غریب کی مدد کرنے سے روکنا تاکہ حزب اسلامی میں بالآخر پراگندگی پیدا ہو جائے۔{۲۸} مصائب کے وقت توحید سے رشتہ عقیدت کا ٹوٹ جانا۔{۲۹}لوگوں کو اچھے کاموں سے روکنا اور برائی کی

تلقین کرنا۔{۳۰}معاشرہ میں فحش اور بد اخلاقی کی ترویج کرنا۔{۳۱}شیرازہ ملت کو مذہبی فرقہ بندیوں کے ذریعے درہم برہم کرنا۔{۳۲}گناہ اور برائی میں تگ ودو کرنا۔{۳۳}اپنی مطلب براری کے لیے جھوٹی قسمیں کھانا۔{۳۴}جھوٹے وعدے کرنا۔{۳۵}بغیر کسی کارنامہ کے سرانجام دیے اس کا کریڈٹ حاصل کرنے کی کوشش کرنا یعنی جھوٹی شہرت کا حریص ہونا۔{۳۶}سلامتی قلب حاصل نہ ہونے کے باعث سچائی اور نیکی کی حقیقتیں نہ سمجھ پانا۔{۳۷}بزدل ہونا۔{۳۸}اعدائے اسلام سے درپردہ خوشامدانہ ربط وضبط رکھنا، صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ کوئی گزند نہ پہنچائیں۔{۳۹}بزدلی اور عشق دنیا کی وجہ سے ہر مصیبت کو خواہ اس کا رخ کسی طرف ہو، اپنے ہی لیے سمجھنا۔{۴۰}اپنے "مسلم" ہونے پر توفیق الٰہی کا شکر گزار ہونے کے بجائے الٹا اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور عام امتِ مسلمہ پر احسان رکھنا۔{۴۱}نماز کی ادائیگی اور پابندی کو گراں محسوس کرنا، محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر نماز پڑھنے کی لیے مسجد میں آنا اور اس طرح سستی سے آنا کہ جس سے صاف ظاہر ہو کہ بادل ناخواستہ آئے ہیں۔{۴۲}ہلکے اور بے ضرر احکام شرعیہ پر تو عمل کر لینا، لیکن سخت اور ایثار طلب احکام سے روگردانی کر جانا۔{۴۳}جہاد کا نام سن کر کانپ اٹھنا اور میدان جہاد کی طرف رخ کرتے ہوئے شدت خوف سے بدحواس ہو جانا۔{۴۴}فریضہ جہاد کی ادائیگی کے وقت جب کہ عام امت اس فرض کو پورا کرنے کی لیے غنیم کے مقابل جا رہی ہو، ہر طرح کی استطاعت رکھنے کے باوجود امام وقت کے سامنے طرح طرح کے بہانے پیش کرنا اور پیچھے رہ جانے کی اجازت چاہنا۔{۴۵}جنگ کی ضرورت سورج کی طرح عیاں ہو لیکن مختلف تاویلوں سے [تاکہ اس آزمائش سے نجات مل جائے] اس ضرورت کا انکار کرنا۔{۴۶}جہاد کی ضرورت سے انکار تو نہ ہو لیکن اس کی تکلیفوں اور صعوبتوں کا تصور کر کے اسے مصالح کے خلاف بتانا، خود بھی گھر بیٹھ رہنا اور دوسروں کو بھی تن آسانی اور عافیت کوشی کی ترغیب دینا۔ {۴۷}میدان جہاد میں مصالح ملّی اور اسلامی عزت وناموس کے بجائے اپنی جانوں ہی کی فکر میں رہنا۔{۴۸} مسلمان ہونے کا مطلب یہ سمجھنا کہ اب ہمیں کسی مصیبت سے دوچار نہ ہونا چاہیے، کیونکہ جب ہم ہی رب السماوات الارض کے تنہا نام لیوا ہیں تو وہ ہم کو اپنے منکروں اور دشمنوں کے مقابلے میں مبتلائے مصیبت کیوں کرے گا۔ پھر جب کوئی ایسا موقع آ پڑے کہ مسلمانوں کو مادی مضرت پہنچ رہی ہو تو خدا، اس کے

رسول ﷺ اور اس کے بھیجے ہوئے دین اسلام کی صداقت میں طرح طرح کے شک کرنا۔{۴۹}میدان جہاد سے امام اور لشکر اسلام کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہونا، خواہ اپنی جان بچانے کی نیت سے یا خواہ مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کی غرض سے۔{۵۰}شرکت جہاد کی سعادت سے محروم رہنے پر حزین وملول ہونے کے بجائے مسرور ہونا۔{۵۱}خود رکنے کے علاوہ دوسروں کو بھی میدان جنگ میں جانے سے روکنا۔{۵۲}راہ حق میں جان دینے کی سعادت اور ارجمندی سے بے خبر ہونا، اسے مفت کا ضیاع جان سمجھنا، اور جس طرح کسی کی بدانجامی پر افسوس کیا جاتا ہے اس طرح شہدا کی موت پر افسوس کرنا۔{۵۳}ایمان کی قوت اور صبر و توکل علی اللہ کی کیفیت کا قدر شناس نہ ہونا؛ کفر و ایمان دونوں کو اثر، نفوذ اور ثبات کے لحاظ سے ایک جیسا سمجھنا؛ اس علم سے محروم اور اس یقین سے خالی ہونا کہ فتح و شکست کا مدار اصلی مادّی اسباب پر نہیں بلکہ ایمان باللہ کی بخشی ہوئی قلبی استقامت پر؛ اس حقیقت سے ناآشنا ہونا کہ حق پرست کی حمایت سے اگر دنیا جہاں کے انسان منہ موڑلیں تب بھی اس کے لیے غم واضراب کا کوئی موقع نہیں۔{۵۴}صرف اس وقت جنگ کے لیے نکلنا جب یہ توقع ہو کہ نہ کوئی خطرناک صورت حال واقع ہو گی اور نہ راستہ میں مشکلات اور مصائب پیش آئیں گے، بلکہ نہایت آسانی سے مال غنیمت لوٹ کر واپسی ہو جائے گی۔{۵۵}خطرہ کے وقت تو مسلمانوں کا ساتھ نہ دینا، مگر جب بُرا وقت گزر جائے اور مسلمان میدان جنگ سے واپس آئیں تو پوری مؤمنانہ صورت اور مخلصانہ لب ولہجہ کے ساتھ ان کا استقبال کرنا اور اپنے عدم شرکت کی جھوٹی مجبوریاں بیان کر کے معذرت خواہ ہونا اور محض زبانی، اور وہ بھی نمائشی، اظہار ہمدردی اور لمبی چوڑی قسموں سے لوگوں کو خوش رکھنے کی سعی کرنا۔{۵۶}اگر کسی مجبوری کی وجہ سے جنگ میں شریک ہونے کی نوبت بھی آ جائے تو جماعت میں فتنہ انگیزیاں کرتے رہنا، اور اس طرح اس سے تقویت کے بجائے اور کمزور کرنا۔{۵۷} امن کو اپنی غرض کی خاطر تباہ وبرباد کرنا۔ خصوصاً ایسے وقت کو اپنی مطلب براری کے لیے غنیمت سمجھنا اور اس میں فتنہ وفساد برپا کر دینا جب اقتدار حکومت اپنی دوسری اہم مشغولیتوں کے باعث ان کی نگرانی نہ کر رہا ہو۔{۵۸}جہاد میں شریک ہونا بھی تو محض دنیاوی فائدے کے لیے اور حصول غنائم کے لالچ سے، نہ کہ حق کو بلند کرنے اور باطل کو سرنگوں کرنے کی خاطر۔{۵۹}قربانیاں دینے کے وقت چھپ کر بیٹھ رہنا، لیکن مال

غنیمت میں، یا جو شئے بھی عام مسلمانوں کی قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہو، اس میں حصہ بٹانے کے لیے اسلام کی فلاح و بہبود کا دم بھرتے اور ایمان کے نعرے لگاتے ہوئے آموجود ہونا۔{۶۰}وظائف، اموال غنیمت، صدقات یا زکوٰۃ کی تقسیم کے وقت زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کی سعی کرنا، اور اگر حسب خواہش حصہ نہ لگے تو بگڑ بیٹھنا اور اپنی کارگزاریوں کو دیکھنے کے بجائے امام جماعت پر بہتان لگانا۔{۶۱}ایسی پالیسی اختیار کرنا کہ بہر صورت اپنا دہانِ آز [منہ کی بھوک] بھرے۔ اگر مسلمان غالب ہوں تو ان سے بھی مالِ غنیمت میں حصہ مل کر رہے اور اگر دشمن غالب رہیں تو ان سے بھی صلہ ہاتھ آئے۔{۶۲}اسلام کی محبت کو اہل و عیال اور وطن کی محبت پر قربان کر دینا اور بوقت ضرورت دین کی خاطر ترک وطن یعنی ہجرت نہ کرنا اور غیر اسلامی طرز کی زندگی بسر کرنے پر قانع رہنا۔{۶۳}کفر کی حکومت میں بغیر کسی واقعی مجبوری کے برضا ورغبت زندگی بسر کرنا اور اس کے ساتھ تعاون کرنا؛ یہاں تک کہ اس کا حق وفاداری ادا کرتے ہوئے اسلام کے خلاف نبرد آزما ہو جانا۔{۶۴}ایسے مواقع سے دور رہنا جہاں حق و صداقت کی باتیں ہو رہی ہوں اور اگر وہاں پہلے سے موجود ہوں تو چپکے سے نظر بچا کر کھسک جانا۔{۶۵}دل کا ایسا سخت اور سیاہ اور بے حس ہو جانا کہ قرآنی نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہو بلکہ انہیں قابل نفرت سمجھ کر ان سے اعراض کرنا۔{۶۶}جماعتی حیثیت سے منتشر رہنا؛ دلوں کا ایک دوسرے سے پھٹا ہوا ہونا اور بظاہر متحد معلوم ہونے کے باوجود باہم دگر کھنچے ہوئے رہنا۔{۶۷}حرام خوری میں چھوٹ ہونا۔{۶۸}وعدہ خلافی کا عادی ہونا۔{۶۹}امانت میں خیانت کر جانا۔{۷۰} جھگڑتے وقت گالیوں پر اتر آنا۔{۷۱} جھوٹ بولنا۔{۷۲}روٹی اور پیٹ کو اپنی توجہات اور مساعی کا مرکز بنانا۔{۷۳}دین کے سچے مخلص اور صاحب عزم خدمت گزاروں سے بغض رکھنا۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

کفر کی حقیقت

کیا عصر حاضر میں اس موضوع کی کوئی خصوصی اہمیت ہے؟

✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" قیامت کے قریب فتنے ہوں گے سیاہ تاریک شب کے حصوں کے مانند، **ان فتنوں میں مرد صبح ایمان کی حالت میں کرے گا، تو شام کفر کی حالت میں اور کوئی شام ایمان کی حالت میں کرے گا، تو صبح کفر کی حالت میں**۔ ان فتنوں میں بیٹھنے والا، کھڑے ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا، چلنے والے سے اور چلنے والا، دوڑنے والے سے بہتر ہو گا۔۔۔۔ [سنن ابن ماجہ ۔ جلد سوم ۔ فتنوں کا بیان ۔ حدیث ۸۴۱]

اس حدیث سے دو باتیں تو واضح ہوتی ہیں؛

- اول یہ کہ آخر زمان میں ان فتنوں کی حیثیت گناہ کبیرہ کی نہیں بلکہ کفر کی ہو گی، چاہے آپ اس کو کفر حقیقی کہیں یا کفر مجازی، اس سے مسئلہ کی سنگینی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ کفر حقیقی یا کفر مجازی پہچاننے کے دو طریقے ہیں؛ اول طریقہ تو علمی ہے، یعنی براہ راست علماء سے یا دینی کتب میں علماء کی طویل بحثوں کے درمیان اپنے ہر کفریہ عقیدہ، قول یا عمل کی تحقیق کرے کہ آیا وہ عقیدہ یا قول یا عمل، کفر حقیقی کے فقہی معیار پر پورا اترتا ہے یا کفر مجازی کے۔ اور دوسرا طریقہ عملی ہے، یعنی ہر بھائی یا بہن اپنے شہر کہ کسی بھی "برن وارڈ" میں تشریف لے جا کر صرف پانچ منٹ نظر بھر کر سو فیصد جلے ہوئے شخص اور ستر فیصد جلے ہوئے شخص کا موازنہ کر لے، تو نتیجہ کے اعتبار سے کفر حقیقی اور کفر مجازی کی ہلاکت اور تکلیف کا فرق یقیناً سمجھ میں آجائے گا۔ انشاء اللہ۔

- دوم یہ کہ اس کا شکار وہ لوگ زیادہ ہوں گے جو جتنا زیادہ دنیا کے حصول کی دوڑ میں تیز چلنے کی کوشش کریں گے اور اسی وجہ سے وہ مقامات جو دنیا کے حصول کے زیادہ مواقع فراہم کریں گے، اتنے ہی زیادہ فتنوں کی آماجگاہ ہوں گے۔ مثلاً ترقی یافتہ ممالک؛ غیر ترقی یافتہ ممالک سے زیادہ اس خطرہ سے دوچار ہونگے۔۔۔ شہروں میں رہائش پذیر؛ قصبوں اور گاوں وغیرہ میں رہائش پذیر والوں سے زیادہ اس خطرہ سے دوچار ہونگے۔۔۔، علی ہذا القیاس۔ اسی تناظر کی منظر کشی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

✓ "قریب ہے کہ مسلمان کا اچھا مال بکریاں ہوں گی، جن کو لے کر وہ پہاڑ کی چوٹیوں اور چٹیل میدانوں میں چلا جائے تا کہ اپنے دین کو فتنوں سے بچالے"۔ [صحیح بخاری۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۱۸]

اور مندرجہ بالا دونوں باتوں کی اصل بنیادی وجہ اس بنیادی علم کی کمی ہے، جس کے نتیجہ میں گناہ اور کفر کے باطنی فرق کا احساس ختم ہونے کے باعث، ان فتنوں سے آگاہی اور ان میں موجود ہلاکت کا احساس ہی انفرادی اور اجتماعی سطح پر معدوم ہو گیا ہے۔ اور اس بنیادی علم کی کمی کی دو وجوہات ہیں، اول دنیادار طبقے کی نفس پرستی اور دنیا کے حصول کی محبت اور دوم منبر و محراب سے کفریہ عقائد و اقوال و اعمال کی نشان دہی اور ان کے متعلق تعلیم و ترویج کا مفقود ہونا۔

عصر حاضر میں کفر کا خطرہ بڑھ کیوں گیا ہے؟

الحمد للہ عصر حاضر میں "جدید اعتدال پسندی" اور "روایت پسندی سے نجات" کے فلسفے کے باعث اکثر ضروریات دین کی طرح تکفیر کا مسئلہ بھی اکثریت کے لیے شجر ممنوعہ قرار پا چکا ہے۔ عوام و خواص الحمد للہ اب اس خوف سے نجات پا چکے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی انگلی ان کے قابل گرفت اقوال و افعال پر اٹھ سکتی ہے اور مسلمانوں کی اکثریت "کفر" کے حقیقی خطرہ کو معمولی سی بھی اہمیت دینے سے انکاری ہے۔ جبکہ انسان کے ازلی اور ابدی دشمن کی زندگی کا واحد نصب العین ہی انسان کو اسلام کے دائرہ سے نکال کر کفر کے دائرہ میں داخل کرنا ہے اور یہ شیطان لعین کے ہزاروں سال کے تجربہ کا منہ بولتا ثبوت ہے، کہ کفر کے حقیقی خطرہ کی طرف نہ تو عوام کی توجہ ہے اور نہ ہی خواص کی۔ مزید براں، چونکہ عصر حاضر میں "تکفیر" کو صرف

خوارج کے امتیازی نشان کے طور پر پیش کرنے کی وجہ سے اس کی حیثیت محض ایک فرقہ کی علامت کے طور پر رہ گئی ہے، اسی لیے ہمارے خواص بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ انفرادی تکفیر بلاشبہ انتہائی حساس اور نازک مسئلہ ہے اور اس کا تعلق اسلامی حکومت کے دائرہ کار سے ہے، مگر عمومی کفریہ عقائد واقوال واعمال کا ذکر بھی منبر ومحراب سے مفقود ہونا واقعی ایک انتہائی تشویش ناک رجحان ہے۔

حقیقت میں تکفیر کے مسئلہ کے دو پہلو ہیں؛

- **پہلا پہلو** تو یہ ہے کہ ایک عالم جب تکفیر کا فتویٰ جاری کرتا ہے تو وہ کسی کو کافر بناتا نہیں ہے بلکہ محض اس کا کفر اس پر ظاہر کرتا ہے۔
- **دوسرا پہلو** ان کفریہ عقائد واقوال واعمال سے متعلق ہے جو باعث تکفیر بنے۔

اس مضمون کا موضوع سخن تکفیر کے دوسرے پہلو [یعنی کفریہ عقائد واقوال واعمال] کے ساتھ ساتھ، ان بنیادی اصولوں کے متعلق ہے، جن سے کفر کی پہچان ممکن ہوتی ہے، تاکہ ہم کفر کی حقیقت اور اس کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے اپنی اور اپنے گھر والوں کی آخرت کی حفاظت کر سکیں۔

✓ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ [سورۃ الاعراف؛ ۲۰۱] "جو لوگ پرہیز گار ہیں جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو **چونک پڑتے ہیں اور (دل کی آنکھیں کھول کر) دیکھنے لگتے ہیں**"۔

کیا یہ کفریہ عقائد واقوال واعمال متفق علیہ امور میں سے ہیں؟

ہر انسان کی زندگی تین دائروں میں مقید ہے؛ سب سے اندر، مطلوب اور محفوظ ترین دائرہ "اللہ کی اطاعت" کا دائرہ، اس سے باہر انتہائی خطرناک "اللہ کی معصیت" کا دائرہ اور اس دائرہ سے باہر سب سے مغضوب یعنی "کفر کا دائرہ"۔ اور ان تینوں دائروں کی حدود و قعود کی باریکیوں کا تعین تو ایک جیّد عالم کے لیے ممکن ہو، مگر ہم جیسے عام مسلمانوں کے لیے تو کفریہ عقائد واقوال وافعال کے تین درجے ہو سکتے ہیں؛

- [اول درجہ] یہ عقائد و اقوال و افعال اکثریتی سلف و خلف کے علماء کے مطابق متفق علیہ باعث کفر ہیں؛[فاعل پر لازم؛فوراً قلبی و عملی توبہ اور تجدید ایمان لازم]۔مثالوں کے لیے مضمون "نواقض اسلام کی حقیقت"کا مطالعہ فرمائیں۔
- [دوم درجہ] ان عقائد و اقوال و افعال کے کفر پر اکثریتی سلف و خلف کے علماء کا اختلاف، مگر گناہ کبیرہ کی حیثیت پر اتفاق؛[فاعل پر لازم؛فوراً قلبی و عملی توبہ لازم]۔مثلاً نماز اور حج کا عملی ترک کرنا وغیرہ۔بشرطیکہ عامل ان اقوال و افعال کو حلال نہ جانتا ہو کیونکہ ایسی صورت میں یہ اول درجہ کا کفر ہے۔
- [سوم درجہ] ان عقائد؛اقوال یا افعال کے کفر تو کُجا گناہ کبیرہ کی حیثیت پر بھی علماء کا اختلاف ؛ گویا کہ بظاہر عوام کے لیے معاملہ مشتبہ ہے۔اس درجہ کی مثال زمانہ سلف میں تو موجود نہیں، مگر عصر حاضر، میں اس کی بہترین مثالیں اسلامی جمہوریت، موجودہ ٹیکس کا نظام، اسلامی بینکینگ، کفریہ ممالک کی شہریت کا حلف اور کفار کی ولایت قبول کرنا، وغیرہ ہیں۔اس تیسری صورت حال میں ایک مومن کا طرز عمل رسول کریم ﷺ کی اس حدیث کے مطابق ہی ہو سکتا ہے، خصوصاً جبکہ مشتبہ امور کی نوعیت صرف گناہ کی نہیں بلکہ کفر کی ہو؛

✓ "۔۔۔۔ حلال بھی کھلا ہوا ہے اور حرام ظاہر ہے، ان کے درمیان چند امور مشتبہ ہیں، چنانچہ جس نے **اس چیز کو چھوڑ دیا جس کے گناہ ہونے کا شبہ ہو** تو وہ اس کو بھی چھوڑ دے گا جو صاف گناہ ہے اور جس نے ایسے کام کرنے کی جرات کی جس کے گناہ ہونے کا شک ہو تو وہ کھلے ہوئے گناہ میں مبتلا ہو جائے گا۔۔۔۔" [صحیح بخاری۔ جلد اول۔ خرید وفروخت کے بیان۔ حدیث ۱۹۷۲]

میری ذاتی تحقیق اور نقلی دلائل کی بنیاد پر، میرا رجحان ان علماء کی طرف ہے جو مروجہ اسلامی جمہوریت، کفریہ ممالک کی شہریت کا حلف اور کفار کی ولایت قبول کرنے کو **کفریہ اعمال** میں سے گردانتے ہیں اور اسلامی بینکینگ اور موجودہ ٹیکس کے نظام میں بھی میرا رجحان ان علماء کی طرف ہے جو اس کو **گناہ کبیرہ** سمجھتے ہوئے حرام جانتے ہیں۔

کفریہ عقائد واقوال واعمال کو جاننا ایک مسلمان کے لیے کیوں ضروری ہے؟

- ✓ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "۔۔۔۔۔اور آگ میں ڈال دیا جانا اس [**مومن**] کو زیادہ پسند ہو اس سے کہ **کفر کی طرف واپس** ہو، جب کہ اللہ نے اس کو اس سے نجات دلائی ہے۔۔۔۔۔"۔[صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ ادب کا بیان۔ حدیث ۹۹۹]

جس طرح مسلمان ہونے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام کیا ہے، اسی طرح یہ معلوم کرنا اور پھر معلوم رکھنا بھی ضروری ہے کہ اسلام کیا نہیں ہے ورنہ اسلام کی صحیح اور بے آمیز حقیقت کی نہ حفاظت ممکن ہے نہ پیروی۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم ایمان کی ضد یعنی کفر کی حقیقت اور اس کے حدود و قعود کا علم حاصل کریں ورنہ کہیں آخرت کا معاملہ قرآن کی اس آیت کے موافق نہ ہو جائے۔

- ✓ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا [سورۃ الکہف ؛ ۱۰۴] "وہ لوگ جن کی سعی دنیا کی زندگی میں برباد ہو گئی۔ اور **وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں** کہ اچھے کام کر رہے ہیں"۔

کتاب "صارم مسلول" میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں "اعمال کی بربادی کفر کی وجہ سے ہوتی ہے اور کفر کے علاوہ اور کسی گناہ سے سارے اعمال کے ضائع ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ جو ایمان پر مرے گا وہ ایک دن ضرور جنت میں داخل ہو گا؛ اگر اس کے تمام اعمال ضائع ہو چکے ہوں گے تو پھر وہ کس عمل کی بنا پر جنت میں جا سکے گا؛ اعمال کو وہی چیز گرانے والی ہے جو ایمان کی ضد ہو اور وہ کفر ہے؛ اصول شریعت کا یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے"۔

بلاشبہ اللہ غفور ورحیم ہے اور اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق وہ جس کو چاہے بخش دے یا عذاب دے مگر یہ اختیار کلی طور پر اس کا استحقاق ہے۔ اسی استحقاق کے تحت وہ سب سے پہلے ایک عالم؛ ایک مجاہد اور ایک انفاق کرنے والے کو جہنم میں داخل کرے گا اور اسی استحقاق اور **رحمت کاملہ** کے تحت وہ جہنم سے ہر اس شخص کو نجات دے گا جس کے دل میں رائی برابر ایمان ہو گا۔ مگر ایک مسلمان سے مطلوب تو یہ ہے، کہ وہ ایمان کے حصول کے بعد اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارے اور آخرت میں اللہ کی اس **رحمت**

کاملہ کا امیدوار بنے نہ کہ، اس دنیا کو اپنی خواہشات کے حصول کا مرکز قرار دیتے ہوئے آخرت میں اللہ کی اس رحمت کاملہ کا خواہش مند۔

- ✓ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" عقلمند و بہادر شخص وہ ہے، **جو اپنے نفس کو جھکا دے** اور فرمان الٰہی کا مطیع و فرمانبردار بنادے اور اس اجر و ثواب کے لئے اچھے عمل کرے جو موت کے بعد پائے گا۔ نیز احمق و نادان اور بزدل شخص وہ ہے، **جو اپنے نفس کو خواہشات کے تابع بنادے** اور اللہ تعالی سے اس بات کا متمنی اور آرزومند ہو کہ وہ اس سے راضی ہو، اس کو بخش دے اور اس کو جنت میں داخل کرے۔ [مشکوۃ شریف۔ جلد چہارم۔ دکھلاوے اور ریاکاری کا بیان۔ حدیث ۱۲۱۵]

کیا کسی مسلمان کو کافر قرار دینا بہت سنگین معاملہ نہیں ہے؟

"مُرجِئہ" وہ لوگ ہیں جو عمل کو ایمان کا حصہ نہیں سمجھتے؛ کہتے ہیں کہ ایمان قول و تصدیق کا نام ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک کفر، دلی انکار اور زبانی تکذیب کا نام ہے۔ ان میں جو غلو کرنے والا فرقہ ہے وہ "جہمیہ" کا ہے؛ وہ کہتے ہیں کہ ایمان صرف دلی تصدیق کا نام ہے اور کفر، دلی انکار کا نام ہے جو تصدیق کے منافی ہو۔ جبکہ اصل معاملے کی سنگینی کے احساس کے لیے اہل سنت والجماعہ کے علمائے حق کے مندرجہ ذیل صرف چند اقوال پر غور فرمایئے؛

- امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ [الصارم المسلول:۱۷۷] میں فرماتے ہیں؛" خلاصہ یہ کہ جس نے کفریہ قول یا فعل کا ارتکاب کیا اس کی وجہ سے وہ کافر ہو گیا، اگرچہ کافر ہونے کہ ارادے سے نہ کیا ہو، اس لیے کہ "قصداً کفر کوئی نہیں کرتا" الا ما شا اللہ"۔
- [بحوالہ اِکفارُ المُلحدین تصنیف مولانا انور شاہ کاشمیری]؛ "حاصل یہ ہے کہ کسی گناہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر نہ کہنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کفریہ عقائد و اعمال کی وجہ سے بھی اس کو کافر نہ کہا جائے بلکہ "بذنب" کی قید سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تکفیر سے ممانعت کا حکم صرف "گناہ"

تک محدود ہے اور صرف مسلمان کے لئے ہے اور **"کفریہ عقائد و اعمال اختیار کر لینے کے بعد تو وہ مسلمان اور اہل قبلہ میں سے ہی نہیں رہتا"۔**

- امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں؛"اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے مومن اپنے ایمان سے خارج نہیں ہوتا **"بشرطیہ کہ وہ گناہ کو حلال نہ کہتا ہو"**۔ اگر وہ گناہ کی حالت میں توبہ کرنے سے پہلے مر جائے تو ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں جائے گا جیسا کہ حدیث میں ذکر ہے، البتہ اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، اللہ چاہے تو اس کے اس کبیرہ گناہ کو معاف کر دے اور چاہے تو اس کے گناہ کے بقدر اسے سزا دے اور پھر اپنی رحمت سے اسے جنت میں داخل کر دے۔"

ایک اسلامی حکومت کی موجودگی میں شرعی عدالت کا قاضی اس دنیا میں تو انہی اصولوں پر کفر ظاہری کا فتویٰ قائم کرے گا جن کا قرآن اور حدیث کی رو سے کفریہ عقائد یا اقوال یا اعمال ہونا ثابت ہے اور سلف و خلف کے علمائے حق کی اکثریت کا ان پر اتفاق ہے۔ مگر شرعی حد کے نفاذ سے پہلے اس شخص کی جہالت کو دور کرنے کی کوشش، اس کو اپنی غلطی سے پلٹنے اور توبہ کرنے کا موقعہ فراہم کیا جائے گا جو ایک اسلامی حکومت کا نعمت خاصہ ہے؛ مگر آج ایک اسلامی حکومت کی غیر موجودگی کی وجہ سے یہ ذمہ داری بھی ہم پر انفرادی طور پر لازم ہے کہ اس جہالت کو دور کرنے کے اسباب ہم خود ہی اختیار کریں اور اگر اپنے عقائد و اقوال و اعمال میں کفر کا کوئی شائبہ بھی پائیں تو اللہ سے توبہ کرتے ہوئے اپنے ایمان اور اسلام کی تجدید کر لیں۔

میرے ظاہری اقوال و اعمال کا کفر سے کتنا تعلق ہے؟

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں؛

- ✓ وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ **[سورۃ التوبہ؛ ۵۴]** "اور ان کے خرچ (اموال) کے قبول ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوئی سوا اس کے انہوں نے خدا سے اور اس کے رسول سے کفر کیا اور نماز کو آتے ہیں تو سست کاہل ہو کر اور خرچ کرتے ہیں تو ناخوشی سے"۔

احادیث رسول ﷺ کے مطابق؛

- ✓ ابوہریرہ ؓ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم اس وقت تک ہے کہ وہ **لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کی گواہی دینے لگیں** اور میرے **ان تمام احکام پر ایمان لے آئیں** جو میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہوں اگر وہ ایسا کر لیں تو مجھ سے اپنی جان و مال محفوظ کر لیں گے ہاں حق پر ان کی جان و مال سے تعرض کیا جائے گا باقی ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ [صحیح مسلم۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۱۲۹]
- ✓ حضرت اسامہ بن زید ؓ کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حرقہ کی جانب بھیجا ہم نے صبح کو اس قوم پر حملہ کر کے انہیں شکست دے دی، میں اور ایک انصاری اس قوم کے ایک آدمی کے پیچھے لگ گئے جب ہم نے اسے گھیر لیا تو اس نے کہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اس انصاری نے تو ہاتھ روک لیا، مگر میں نے اس کے نیزہ مار کر اسے قتل کر دیا، جب ہم واپس آئے تو نبی ﷺ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا؛ اسامہ! **تم نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے کے بعد بھی اسے قتل کر دیا**، میں نے عرض کیا اس نے جان بچانے کے لیے کہا تھا، مگر آپ ﷺ برابر یہی فرماتے رہے، یہاں تک کہ میں نے تمنا کی کہ کاش آج سے پہلے میں اسلام نہ لایا ہوتا۔ [صحیح بخاری۔ جلد دوم۔ غزوات کا بیان۔ حدیث ۱۴۷۱]

مندرجہ بالا قرآنی آیت اور احادیث واضح کرتیں ہیں کہ اس دنیا میں تمام اہمیت ظاہری عمل کی ہے اور باطنی ایمان کا معاملہ آخرت کے لیے موخر ہے۔ ان نقلی دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب تک کوئی شخص **ظاہری طور پر کفریہ اقوال یا افعال کو نہ اپنائے**، اس وقت تک وہ مسلمان کہلانے کا حقدار ہے، حتّٰی کہ اعتقادی منافقین بھی اس حقیقت کا ادراک رکھتے تھے اور خود کو اس دنیا میں ملت اسلامیہ کا رکن کہلانے کے لیے اسلامی شعائر یعنی نماز، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ پر ظاہری طور پر کاربند تھے۔

کفر اور گناہ کبیرہ میں کیا فرق ہے؟

مندرجہ بالا سوالات اور ان کے جوابات کا واحد مقصد مختلف زاویوں سے صرف ایک بات واضح کرنا تھی کہ ایک مسلمان کے لیے کفر ایک یقینی اور حقیقی خطرہ ہے اور ایک اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ کی عدم

موجودگی کے باعث، ایک مسلمان کی حیثیت میں مرنے کے لیے ضروری ہے کہ انفرادی طور پر اپنے ظاہر اور باطن کو کفریہ عقائد و اقوال و اعمال کی غلاظتوں سے پاک رکھنے کی مقدور بھر کوشش کریں۔

اب ہم اس عظیم ترین مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے لاعلمی کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت ظاہری مماثلت کی وجہ سے، کفریہ اقوال و اعمال کو گناہ کبیرہ کے مترادف سمجھتے ہوئے، ان کی سنگینی کو پس پشت ڈال دیتی ہے؛ جبکہ دلائل نقلی کی رو سے "توبہ کے بغیر" مرنے کی صورت میں، ان میں سے ایک عمل تو موانع کفر کی عدم موجودگی میں، دائمی جہنم کو واجب کرتا ہے، جبکہ دوسرا عمل موانع حدود [یعنی غَيْرَ بَاغٍ [طالب حرام نہ ہو] وَلَا عَادٍ [رخصت کی مقدار سے آگے نہ بڑھے]] کی عدم موجودگی میں، جہنم کو عارضی قیام گاہ قرار دیتے ہوئے، اس عمل کے بداثرات سے پاک ہونے کے بعد جنت میں داخلے کو ممکن قرار دیتا ہے۔

بہرکیف اس فرق کو واضح کرنے سے پہلے لازم ہے کہ ہم "ضروریات دین کی حقیقت" کے مضمون کا مطالعہ ایک بار پھر خوب غور سے کرلیں۔ اگر ضرورت دین کی اصطلاح آپ پر واضح ہوگئی ہے، تو اب سمجھیں کہ، ہر نواقض اسلام [یعنی کفریہ عقیدہ یا قول یا عمل] اپنے اصل میں کسی بھی ضرورت دین کی صریح مخالفت کرتے ہوئے، اس کے "قائم مقام" [Replacement] ہونے کا دعوی دار ہوتا ہے، جبکہ گناہ کبیرہ ضروریات دین میں پہلے سے موجود، اللہ کی وضع کردہ "حدود" سے تجاوز اور "محرمات" کے ارتکاب کا نام ہے۔

اس اصول کو مندرجہ ذیل حدیث کی روشنی میں بہتر سمجھا جاسکتا ہے؛

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "سات ہلاکت میں ڈال دینے والی چیزوں سے بچو" عرض کیا گیا "اے اللہ کے رسول ﷺ وہ سات ہلاک کرنے والی چیزیں کونسی ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ کے ساتھ کسی کو "**شریک**" ٹھہرانا اور "**جادو**" کرنا اور کسی نفس کا "**قتل**" کرنا جسے اللہ نے حرام کیا سوائے حق کے اور "**یتیم کا مال**" کھانا، "**سود**" کھانا، جہاد سے دشمن کے "**مقابلہ سے بھاگنا**" اور پاکدامن عورتوں پر "**بدکاری کی تہمت لگانا**"۔

اس حدیث پاک میں سات کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے؛ جن میں سے دو ظاہری اعمال [شرک اور جادو] کی حیثیت، دین کے بنیادی اساس اور متفق الیہ [عقیدہ توحید اور طاغوت سے براءت] کے قائم مقام [Replacement] کی سی ہے، جن کی وجہ سے یہ دو اعمال نواقض اسلام کے قبیل میں شامل ہیں اور دیگر اسلامی شعار پر کاربند ہونے کے باوجود وہ شخص [موانع کفر کی عدم موجودگی میں] دنیا اور آخرت میں کافر قرار پائے گا؛ جبکہ بقیہ پانچ ظاہری اعمال کا تعلق اللہ سبحان و تعالیٰ کی قائم کردہ حدود اور محرمات سے ہے اور اللہ سبحان و تعالیٰ کی رحمت خصوصی کی وجہ سے [موانع حدود کی عدم موجودگی میں] یہ ابدی جہنم کو واجب نہیں کرتے، بشرطیہ کہ فاعل ان کو حلال نہ جانتا ہو۔

غرض کہ نواقض اسلام کی ظاہری حیثیت، اس دنیا میں تو گناہ کبیرہ کی سی ہے، مگر دنیا و آخرت میں جس طرح گناہ کبیرہ کے بد اثرات اور جہنم میں عارضی دخول کے خطرہ سے پاک ہونے کے لیے، موانع حدود کی موجودگی لازم ہے، اسی طرح کفر کے بد اثرات سے پاک ہونے کے لیے، جہنم میں ابدی دخول سے بچنے اور گناہ کبیرہ کے درجہ تک لانے کے لیے، موانع کفر کی "**اضافی موجودگی**" بھی لازمی ہے۔

کیا گناہ کبیرہ کسی دوسرے کے لیے جائز سمجھنا بھی کفر ہے؟

گو علمی طور پر یہ مسئلہ تفصیلاً ضروریات دین کی روشنی میں واضح ہو چکا ہے کہ گناہ کبیرہ ضروریات دین میں شامل ہیں اور ان کا مرتکب گناہ گار ہے اور کسی بھی گناہ کبیرہ کو اس کے مقام سے ہٹا کر جائز قرار دینا کفر ہے؛ مگر عملی طور پر عصر حاضر کی روشنی میں، کفریہ اور مسلم معاشروں میں غیر اسلامی اصطلاحات کی ترویج کے باعث، اس مسئلہ کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے اور مزید تفصیل کی متقاضی ہے۔

کفریہ معاشروں میں، ہر کبیرہ گناہ کے مرتکب کو مندرجہ ذیل دو اصطلاحات کے تابع، کبائر کو جائز قرار دینے کا، قانونی تحفظ عطا کر دیا گیا ہے؛

- **شخصی آزادی**[Freedom]
- **تعین خیر و شر**[Right to Define GOOD & BAD]

اور اس قانونی تحفظ کو معاشرہ میں قبولیت کا مقام دلوانے کے لیے مندرجہ ذیل مزید دو اصطلاحات کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے؛

- کفریہ نقطہ نظر سے؛ **مساوات**[EQUALITY]؛ کہ چونکہ ہر فرد کو یہ شخصی آزادی حاصل ہے، کہ وہ اپنے لیے خیر و شر کا جو پیمانہ چاہے طے کرلے؛ لہذا ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ **دوسروں کے اس مساوی حق** کو تسلیم کرے؛
- کفریہ نقطہ نظر سے؛ **رواداری** [TOLERANCE]؛ کہ ہر فرد اس بات کا قائل ہو کہ ذاتی زندگی میں اقدار [Values] کی جو بھی ترتیب ہو مگر معاشرتی سطح پر وہ اس ترتیب کو قبول کرے گا، جس میں شخصی آزادی کے اصول کو مقدم رکھا جائے گا۔ کفریہ نقطہ نظر میں [Tolerance] کا مطلب اختلاف رائے کو برداشت کرنا نہیں، بلکہ اس کا مطلب **اقداری ترتیب کے فرق کو غیر اہم اور لایعنی** سمجھنا ہے۔

مسلم معاشروں میں عام عوام جہالت کے باعث اور لبرل طبقہ جان بوجھ کر ان اصطلاحات کا بے دریغ استعمال تو ضرور کرتا ہے مگر الحمد للہ ثمّ الحمد للہ کہ دینی طبقہ کی موجودگی کے باعث آج بھی اکثریت کے نزدیک کبیرہ گناہوں کا احساس موجود ہے اور تمام کبائر مثلاً شراب نوشی، زنا، فحاشی، لواطت بازی، ہم جنس پرستی، مرد و زن کا آزادانہ اختلاط وغیرہ اپنے جواز کی سند سے محروم ہیں۔

یاد رکھیں کہ گناہ کو اپنے لیے جائز سمجھنا یا دوسرے کے لیے جائز سمجھنا، دونوں صورتوں میں کفر ہے اور دونوں صورتوں میں جائز سمجھنے سے مراد "انسان کے دل سے اس گناہ سے فطری کراہت کے احساس کا معدوم ہو جانا ہے"۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

- ✓ "تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے اس پر لازم ہے کہ اس برائی کو اپنے ہاتھ سے مٹائے اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے روکے اگر اس کی استطاعت نہ ہو **تو اپنے دل سے اس برائی کو مٹائے**۔ (یعنی بوقت استطاعت مٹانے کا عزم رکھے) اور یہ **ایمان کا سب سے [أضعف**

الایمان] کمزور درجہ ہے"۔ [مشکوۃ شریف ۔ جلد چہارم ۔ توکل اور صبر کا بیان ۔ حدیث ۱۰۶۲]

کیا مسلمان معاشروں میں بھی کبائر کو جائز سمجھنے کا رجحان موجود ہے؟

اس سوال کے تفصیلی جواب کے لیے "نواقض اسلام کی حقیقت" مطالعہ فرمائیں، مگر یہاں محض ایک مثال پیش خدمت ہے۔۔۔۔۔

- ✓ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "دجال اس "مرقناۃ" کی دلدلی زمین میں آکر پڑاوڈالے گا اس کے پاس نکل نکل کر جانے والوں میں **اکثریت خواتین کی ہوگی** اور نوبت یہاں تک جا پہنچے گی کہ ایک آدمی اپنے گھر میں اپنی ماں، بیٹی، بہن، اور پھوپھی کے پاس آکر انہیں اس اندیشے سے کہ کہیں یہ دجال کے پاس نہ چلی جائیں رسیوں سے باندھ دے گا۔۔۔۔" [مسند احمد ۔ جلد سوم ۔ حدیث ۸۸۴]
- ✓ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "میں نے جہنم میں جھانک کر دیکھا تو وہاں **عورتیں زیادہ تھیں** اور جنت میں جھانکا، جنت میں فقراء کی اکثریت تھی" [جامع ترمذی ۔ جلد دوم ۔ جہنم کا بیان ۔ حدیث ۵۱۰]

مندرجہ بالا دونوں احادیث کے باعث ہماری خواتین اور ان سے محبت کے دعویداروں کو حقیقی پریشانی کے ساتھ ساتھ، ان وجوہات کی جستجو ہونی چاہیے جو اتنی خطرناک وعیدوں کے سبب ہیں۔ گو اسی موضوع کی دیگر احادیث میں شکوہ اور شکایت کی زیادتی، خاوند کی نافرمانی اور ناشکری جیسی وجوہات کا ذکر موجود ہے، مگر عصر حاضر میں شاید اضافی وجہ خواتین کا متعدد ضروریات دین کے ماتحت محرمات کو جائز امور میں شامل کر لینا ہے، مثلاً صرف چند امور میں تقابلی موازنہ پیش خدمت ہے؛

- دین کا حکم؛ عورت کی قوّامیت کی ممانعت [یعنی دنیاوی امور میں مرد کا قوّام ہونا]
  عصر حاضر میں عمومی قول و عمل؛ حقوق نسواں، عورت مرد کے برابر ہے، دینی طبقہ کی عورت کو محکوم رکھنے کی سازش کے نعرے وغیرہ۔
- دین کا حکم؛ بے پردگی اور بے حیائی سے ممانعت

عصر حاضر میں عمومی قول و عمل؛ آزادی نسواں، پردہ تو آنکھ کا ہے، پردہ تو دل کا ہے، پردہ دنیاوی ترقی میں رکاوٹ ہے، پردہ دینی نہیں بلکہ عربوں کا ثقافتی مظہر تھا، میرا جسم میری مرضی جیسے افکار کی ترویج اور تشہیر۔

- دین کا حکم؛ نامحرم سے تعلقات کی ممانعت [خصوصاً تنہائی میں]

عصر حاضر میں عمومی قول و عمل؛ ہمارے دل صاف ہیں، ہمارے ذہن صاف ہیں، ہم تو صرف اچھے دوست ہیں وغیرہ۔

- دین کا حکم؛ نامحرم سے گفتگو میں آواز کی نرمی سے ممانعت

عصر حاضر میں عمومی قول و عمل؛ فن کے نام پر آواز کا نجی و عوامی محفلوں میں ہر محرم اور نامحرم کے سامنے کھل کر اظہار، اچھی آواز لوگوں کی امانت ہے، روکھے انداز میں گفتگو مجلسی آداب کے خلاف ہے، پیشہ ورانہ تعلقات کی ضرورت وغیرہ۔

- دین کا حکم؛ چال ڈھال کے ذریعے مخصوص زینت ظاہر کرنے کی ممانعت

عصر حاضر میں عمومی قول و عمل؛ کھیل کے میدانوں میں نامحرموں کی موجودگی میں مردانہ لباس میں اچھل کود اور دوڑ ہمارا حق ہے اور علاقائی، ملکی یا بین الاقوامی میڈیا پر اس کا نشر ہونے سے ہماری صلاحیتوں کا فروغ وغیرہ۔

- دین کا حکم؛ محرم کے بغیر سفر کی ممانعت

عصر حاضر میں عمومی قول و عمل؛ دینی طبقہ کی طرف سے عورت کو تابع رکھنے کی سازش، عصر حاضر کے سفری ذرائع محفوظ ہیں وغیرہ۔

- دین کا حکم؛ بلاضرورت گھر سے نکلنے کی ممانعت

عصر حاضر میں عمومی قول و عمل؛ مالی آزادی میرا حق ہے، گھر میں بیٹھنے سے صلاحیتوں کو زنگ لگتا ہے وغیرہ۔

- دین کا حکم؛ جنس مخالف کی مشابہت سے ممانعت

عصر حاضر میں عمومی قول و عمل؛ فیشن وقت کی ضرورت، مردوں جیسے بال اور ان جیسے لباس [خصوصاً پتلون] کا استعمال تو اتنا عام ہے کہ حتّٰی کہ بعض دینی سوچ والے احباب کے گھر بھی اس لعنت شدہ فعل سے محفوظ نہیں۔

گو ان امور کا تعلق خواتین سے ہے، مگر روز محشر ہم تمام مرد حضرات کا [شادی سے پہلے] باپ یا بھائی اور [شادی کے بعد] شوہر یا بیٹا ہونے کی حیثیت سے اور صنف نازک پر قوّام ہونے کے باعث، ان امور سے متعلق اپنی کوتاہیوں کی جوابدہی سے فرار ممکن نہیں ہے۔

کیا کفریہ عقائد و اقوال و اعمال کے سبب واجب ہونے والے کفر کے موانع [کفر ثابت ہونے میں رکاوٹیں] بھی ہیں؟

اس موقع پر بہتر ہے کہ "**موانع کفر**" یعنی "**کفر ثابت ہونے میں رکاوٹیں**" کو بھی سمجھ لیا جائے، کیونکہ اسلامی حکومت اور شرعی عدالتوں کے مفقود، علمائے حق سے دوری، معاشرہ میں اس موضوع کے شجر ممنوعہ ہونے کے باعث اور عوام کی اکثریت کی عقیدہ میں مُرجِیہ کی موافقت کے سبب؛ ان موانع کا اطلاق بھی انتہائی غیر جانبداری سے ہر اس مسلمان کو جس کو واقعی اپنی آخرت کی فکر ہے، خود کرنے پڑیں گے۔ علماء و فقہا نے مندرجہ ذیل چار بنیادی موانع کفر بیان کیے ہیں؛

- جہالت اور لاعلمی
- خطا اور غلطی
- تاویل
- جبر و اکراہ کی حالت

دینی کتب میں ان کے علاوہ بھی موانع کفر کا ذکر ملتا ہے مگر ان چار پر چونکہ اتفاق ہے اسی لیے ان کو یہاں ذکر کیا گیا، اب اگر کوئی بھائی یا بہن اپنے حالات اور اعمال کے سبب کسی خاص موانع کفر کی تلاش میں ہے تو اس کو کسی عالم حق کی تلاش کرنی پڑے گی، مگر یاد رکھیں کہ ان موانع کفر کا تعلق دنیا میں تکفیر کے فتوی سے بچنے سے ہے نہ کہ آخرت کے عذاب کے خطرے سے، کیونکہ اللہ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ اور ہر موانع

کفر کی بھی اپنی حدود و قعود ہے جس کی تفصیل اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے اور نہ ضرورت کیونکہ اس مضمون کا مقصد کفر سے بچنا ہے نا کہ کفر کے فتوی سے۔

مزید بر آں، اکراہ کی حالت میں کلمہ کفر کہنا اگرچہ جائز ہے مگر اس سلسلہ میں بالاتفاق یہی ہے کہ انسان عزیمت کی راہ اختیار کرے یعنی ایمان کی خاطر جان کی بازی لگادے مگر کلمہ کفر نہ کہے اور اس مانع کا اطلاق بھی ہم جیسے عام مسلمانوں پر ہے نہ کہ علماء پر۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ایک عالم دین کے حوالے سے پوچھا گیا کہ کیا وہ [مشکل وقت میں] "تَقِیَّہ" [وہ راز جو دل میں رکھا جائے اور کسی کے خوف سے ظاہر نہ کیا جائے] کر سکتا ہے؟ [یعنی جھوٹ بول کر جان بچا سکتا ہے] تو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ اگر عالم ایسے موقع پر "تَقِیَّہ" کرنی لگیں اور جاہل پہلے ہی حق بات نہ جانتے ہوں تو حق کیسے واضح ہو گا؟۔

کفر کی حقیقت کا خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب تک انسان اختیاری یا غیر اختیاری طور پر "معصیت کے دائرہ" سے باہر نہیں نکلتا، اس وقت تک وہ کم از کم ابدی جہنم کے خطرہ سے محفوظ ہے، گو کہ جہنم کے وقتی قیام سے بھی اللہ تعالٰی اپنی پناہ عطا فرمائے، اگرچہ ہماری اکثریت اس وقتی قیام کے مسئلہ کو تو فکری یا عملی طور پر کوئی خطرہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔

بہر کیف کفر کے خطرہ سے بچنے کے لیے لازم ہے کہ ہم کم از کم یہ پختہ ارادہ تو کر لیں کہ ہم اپنے تمام عقائد و اقوال و اعمال کو عصر حاضر کے تقاضوں پر نہیں بلکہ دین کی کسوٹی پر پرکھیں گے اور اگر ہم اور ہماری اولاد، عصر حاضر کے تقاضوں کے باعث [نعوذ باللہ من ذالك] عملاً دینی فرائض، سنتوں اور مستحبات کی تارک بھی ہوں، تو کم از کم منکر نہ ہوں اور اسی طرح اگر ہم اور ہماری اولاد، عصر حاضر کے تقاضوں کے باعث [نعوذ باللہ من ذالك] عملاً مکروہات اور محرمات پر عمل پیرا بھی ہوں، تو کم از کم ان سے فطری کراہت کو دل سے نکال کر جائز نہ ٹھہرائیں۔ مجھے قطعی احساس ہے کہ اس کراہت کو اپنے اور اپنی اولاد کے نفس میں زندہ رکھتے

ہوئے، اسلامی ممالک میں بھی روزمرہ کی زندگی ایک آزمائش سے کم نہیں ہے، مگر کفریہ ممالک میں تو اس آزمائش میں سے گزرنا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔[الا ماشاء اللہ]

اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ توحید کا اقرار دل؛زبان اور عمل ہر چیز سے ہونا چاہیے۔ان تینوں میں سے کسی ایک چیز سے انکار کرنے کی وجہ سے کوئی شخص مسلمان نہیں بن سکتا؛مثلاً اگر کوئی شخص دل میں توحید کا علم رکھتا ہے اور قول سے اس کا اظہار بھی کرتا ہے مگر عملاً توحید کا باغی ہو تو وہ سرکش کافر ہے جیسا کہ "**ابلیس**"["-----إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ" [سورۃ الانفال؛۴۸] "-----مجھے تو **خدا سے ڈر لگتا ہے**۔ اور خدا سخت عذاب کرنے والا ہے"] اور اسی طرح وہ شخص بھی کافر ہے جو دل میں توحید کا علم رکھتا ہو مگر قولاً اور عملاً توحید کا باغی ہو جیسا کہ "**فرعون**"["وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا-----" [سورۃ النمل؛ ۱۴] "اور بے انصافی اور غرور سے ان سے انکار کیا لیکن **ان کے دل ان کو مان چکے تھے**-----"]۔اسی طرح کوئی شخص توحید کا قولی اظہار کرے اور اس پر ظاہری عمل بھی کرے مگر اس توحید کا دل سے اعتقاد نہ رکھتا ہو تو وہ منافق ہو گا؛ایسا شخص کفار سے بھی زیادہ برا ہے۔

بہر کیف، اللہ تعالیٰ جو دلوں کے بھید خوب جانتا ہے اور ہماری شاہ رگ سے بھی قریب ہے، اس کی بے پناہ رحمت اور اپنی مخلوق کے ساتھ ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت و کرم کی وجہ سے امید ہے کہ روز محشر، وہ موانع کفر کی تعداد میں، بطور احسان عظیم، اپنے علم سے مزید اضافہ فرماتے ہوئے، اپنی اس مخلوق کو جو اس دنیا میں ظاہری و عملی شرک سے پاک تھی، اس کو کفر کے دائرہ اور جہنم کی ابدی زندگی [نعوذ باللہ من ذالك] سے نکال کر فقط معصیت کے دائرہ اور جہنم کے وقتی عذاب [نعوذ باللہ من ذالك] میں شامل کر لے، مگر یہ فقط اس کا استحقاق ہے، ہمارے موجودہ عقائد و اقوال و اعمال کا جواز نہیں۔

انسانی زندگی مختلف افکار کا مجموعہ ہے اور جو فکر باقی افکار پر حاوی ہو جاتی ہے اسی کا اثر انسان کے کردار پر نظر آتا ہے۔اور ہر فکر کی بنیاد یا تو "**خوف**" پر ہوتی ہے یا "**محبت**" پر۔اکثریت کے لیے عموماً "**خوف**" ہی کسی بھی فکر کا بنیادی محرک ہوتا ہے، چاہے یہ خوف دنیاوی ناکامیوں کا ہو یا چاہے اخروی ناکامیوں کا؛اور یہی بنیادی

محرک ایک مستقل قوت کی شکل میں اس فکر کی آبیاری کرتا ہے۔ جس کی عصر حاضر کی ایک انتہائی سادہ مثال وہ فکر ہے جس کی آبیاری ساری عمر ہمارے والدین نے قولی یا عملی صورت میں ہمارے ذہنوں میں کی اور وہی فکر جو ہم نے قولی یا عملی صورت میں اپنی اولاد میں منتقل کی؛"**اگر تم نے محنت نہ کی اور تعلیم حاصل نہ کی، تو دنیا میں ناکامی تمہارا مقدر ہو گی**"، جبکہ دین کا مطالبہ ہے کہ ہم "**جو شخص روز قیامت جہنم سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہی اصل میں کامیاب ہے**" والی فکر کی ترویج اپنے اور اپنی اولاد کے اوپر لازم ٹھہرائیں؛

گناہوں کے دنیا و آخرت میں بد اثرات

یاد رہے کہ توبہ کے بغیر، گناہ کبیرہ اپنے موانع کی موجودگی میں صفر کے درجہ پر پہنچ سکتے ہیں، مگر کفریہ اقوال اور اعمال اپنے موانع کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ گناہ کبیرہ کے درجہ پر گر سکتے ہیں، اسی لیے اس موضوع کے اختتام پر [کفر کے نہیں] محض گناہوں کے بعض نقصانات کا ذکر اس نیت سے قلم بند کر رہا ہوں کہ ان نقصانات کا بار بار مطالعہ فرمانے سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین پر ثابت قدمی اور استقامت نصیب فرمائیں گے۔

جہنم میں جلنا۔۔۔؛حشر میں رسوائی۔۔۔؛قبر میں عذاب۔۔۔؛موت کے وقت فرشتوں کا سختی سے پیش آنا۔۔۔؛قبر میں منکر نکیر کا سختی سے پیش آنا۔۔۔؛دل کا سخت ہو جانا۔۔۔؛دل کو زنگ لگ جانا۔۔۔؛ایک مرتبہ گناہ کے بعد دوبارہ گناہ کرنے کو جی چاہنا۔۔۔؛گناہ پر گناہ کرتے رہنا۔۔۔؛گناہ کا احساس دل سے ختم ہو جانا۔۔۔؛علم سے محروم ہو جانا۔۔۔؛رزق میں برکت نہ رہنا۔۔۔؛اللہ تعالیٰ سے وحشت آنا۔۔۔؛نیک پرہیز گار لوگوں سے وحشت ہونا اور ان سے دور بھاگنا۔۔۔؛قحط کا آنا۔۔۔؛غلہ کثرت کے باوجود آسانی سے نہ ملنا۔۔۔؛مہنگائی کا پیدا ہونا۔۔۔؛بارش کا بند ہونا۔۔۔؛آندھیوں کا آنا۔۔۔؛عذاب کا نازل ہونا۔۔۔؛اکثر کاموں میں دشواری پیش آنا۔۔۔؛دل میں اندھیرا معلوم ہونا۔۔۔؛نیکیوں سے محروم ہونا۔۔۔؛عمر گھٹنا۔۔۔؛عمر میں برکت نہ رہنا۔۔۔؛توبہ کا ارادہ کمزور ہو جانا۔۔۔؛بے دینوں، گناہ گاروں اور غیر مسلموں کو پسند کرنا

اور ان کو دوست رکھنا۔۔؛دوسری مخلوقات کا گناہ گار پر لعنت کرنا۔۔؛نبی کریم ﷺ کی طرف سے اس گناہ گار پر لعنت ہونا۔۔؛فرشتوں کی دعا سے محروم ہو جانا۔۔؛پیداوار وغیرہ میں کمی ہونا۔۔؛روز روز نئی اور لاعلاج بیماریوں کا پیدا ہونا۔۔؛حیاو عزت کا جاتا رہنا۔۔؛دینی غیرت و حمیت کا جاتا رہنا۔۔؛اللہ تعالٰی کی عظمت کا احساس دل سے نکل جانا۔۔؛اللہ تعالٰی کا خوف دل سے نکل جانا۔۔؛نعمتوں کا چھن جانا۔۔؛ بلاؤں کا ہجوم ہو جانا۔۔؛شیاطین کا مسلط ہونا۔۔؛اسباب ووسائل کے ہوتے ہوئے بھی دل میں سکون نہ رہنا۔۔؛دل کا ہر وقت بے چین اور پریشان رہنا۔۔؛دل کا تنگ ہو جانا۔۔؛دل میں مختلف وساوس کا ابھرنا۔۔؛اللہ تعالٰی کی رحمت سے مایوس ہونا۔۔؛مرتے وقت منہ سے کلمہ حق نہ نکلنا۔۔؛بغیر توبہ کے مرنا۔۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

نواقض اسلام کی حقیقت

نواقض اسلام کا علم کیوں ضروری ہے؟

تمام لغوی، اصطلاحی، عرفی اور مجازی معنوں سے قطع نظر؛ حقیقی اسلام صرف اس دنیا میں اللہ تعالٰی کی ظاہری اطاعت کا عہد ہے اور **نواقض اسلام سے مراد وہ امور ہیں جو اس عہد کو توڑ دیتے ہیں** اور اسی لیے ان کی سنگینی سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہیے۔ نواقض اسلام جب ان باتوں کو کہتے ہیں جو آدمی کو دین سے خارج کر دیں؛ تو پھر ان سے بچنے اور بچانے کا کام ہر کسی کو کرنا ہے اور اس کے علم کو عام کرنے کی بنیادی غرض یہی ہونی چاہیے کہ لوگ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کی اسیری سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچائیں۔ لہذا سب سے پہلے تو نواقض اسلام کا جاننا ہر شخص کے اپنے فائدے کے لئے ہے پھر اس کے ساتھ ساتھ جہاں تک ہو سکے وہ دوسروں کو نواقض اسلام کے متعلق خبردار کرے۔ ایک کم علم سے کم علم آدمی بھی مسلم معاشرے کے اندر ایک کفریہ قول یا کفریہ عمل کو کفر ہی پکارے گا۔

نواقض اسلام اور گناہ کبیرہ میں کیا فرق ہے؟

اس سوال کے تفصیلی جواب کے لیے مضمون "کفر کی حقیقت" سوال نمبر ۷ "کفر اور گناہ کبیرہ میں کیا فرق ہے" کا مطالعہ فرمائیں۔

کیا قرآن میں شرک کے علاوہ ہر بد عمل کی بخشش کا ذکر نہیں ہے؟

سورۃ النساء میں دو مقامات پر اللہ سبحان و تعالٰی فرماتا ہے؛

- ✓ "إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا" [سورۃ النساء؛ ۴۸] " خدا اس **گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا**

شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے اور جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا"

- ✓ "إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا" [سورة النساء؛۱۱۶] " خدا اس کے **گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے** اور اس کے سوا [اور گناہ] جس کو چاہیے گا بخش دے گا۔ اور جس نے خدا کے ساتھ شریک بنایا وہ رستے سے دور جا پڑا"۔

گو کہ اللہ کے ہر حکم میں اختیاری کوتاہی کی بنیادی وجہ شرک ہی ہوتی ہے، مگر ان آیات کے طرز خطاب سے بظاہر شرک اکبر مراد ہے، جو توحید مطلوب و مقصود کا متضاد ہے اور جس کے باعث کفر ہونے پر امت میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ اب اگر ان آیات کو صرف انہی ظاہری معنوں میں مراد لیا جائے، کہ شرک اکبر کے علاوہ، ہر کفریہ عقیدہ و قول و عمل صرف گناہ کبیرہ کے قبیل سے ہے اور کوئی عقیدہ یا قول یا عمل اس وقت تک کفر قرار نہیں پا سکتا جب تک اس پر شرک اکبر کا اطلاق نہ ہوتا ہو، تو اس سے مندرجہ ذیل دو مفروضوں کا لازم ہونا ثابت ہوتا ہے؛

- عقیدہ آخرت یا عقیدہ رسالت یا عقیدہ ختم نبوت یا ضروریات دین کے اعلانیہ انکار کے باوجود بھی ہر مسلمان جنت میں داخل ہو گا۔
- ہر وہ یہودی یا عیسائی جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یا آج بھی فقط اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتا ہے وہ بھی جنت میں داخل ہو گا۔

ہر ذی شعور مسلمان ان دونوں مفروضوں کے باطل ہونے میں ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں کرے گا؛ تو اس سے ثابت ہوا کہ ان آیات میں اصل مقصود شرک اکبر کی شدید ترین مذمت کے بعد، خالص توحید کو جنت میں داخلے کے لیے اولین شرط قرار دینا اور اس **شرک اکبر کی موجودگی میں موانع کفر کا غیر مؤثر ثابت ہونا ہے، نہ کہ جنت میں داخلہ کی واحد شرط کے طور پر اس کا بیان**۔

عصر حاضر کے حالات کے حساب سے اہم ترین نواقض اسلام کون سے ہیں؟

اس سوال کا جواب امام محمد بن وہاب رحمہ اللہ کی تحریر "نواقض اسلام" کی شرح "التبیان فی شرح نواقض اسلام مصنف شیخ سلیمان بن ناصر بن عبد اللہ العلوان حفظہ اللہ" کے اردو ترجمہ سے ماخوذ ہے۔ یہ مضمون ان نواقض اسلام کو دلائل سے ثابت کرنے کے نقطہ نظر سے تحریر نہیں کیا گیا کیونکہ اس مقصد کا حصول، قرآن وحدیث سے دلائل کی کثرت کے باعث محض چند صفحات میں ممکن نہیں ہے؛ صرف یاد دہانی اور انسانی نفسیات کے اس پہلو کے تحت تحریر کیا گیا ہے کہ جب بھی انسان کو کوئی بھولی بسری بات یاد کرائی جائے تو دل و دماغ میں اس کا خیال تروتازہ ہو جاتا ہے؛ اسی طرح کسی بھی ناقضِ اسلام کو دیکھ کر یا سن کر، ذہنوں پر چھائی گرد اور دلوں سے سختی ہٹانے کے لیے قرآن کی ایک آیت یا رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث ہی کافی ہوتی ہے؛ ورنہ نہ ماننے والے کے لیے تو پورا قرآن اور احادیث کے مجموعے بھی کافی نہیں۔

أ. **شرک اکبر؛** اللہ تعالٰی کے ساتھ کسی کو شریک کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ توبہ کے بغیر مشرک کی بخشش نہیں ہے اور اگر بغیر توبہ کے مر گیا تو ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

✓ "إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا" [سورة النساء؛ ۴۸] "خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو **اس کا شریک بنایا جائے** اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کردے اور جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا"۔

شرک اکبر کی چار بڑی قسمیں ہیں؛

- **دعا میں شرک؛** انبیاء اور اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ، وہ ضرورتوں کو پورا کرتے اور مصیبتوں کو دور کرتے ہیں۔ پھر مشکلات سے نجات پانے کے لیے ان سے دعا کرنا، یعنی انہیں پکارنا شرک اکبر ہے۔

✓ نبی کریم ﷺ نے فرمایا؛ "ان الدعاء هو العبادة" [ترمذی؛ الدعوات باب الدعا مخ العبادة؛ ۳۳۷۲] "بیشک دعا ہی **عبادت** ہے"

- **نیت اور ارادہ میں شرک؛** اس شرک کے مرتکب وہ اعتقادی منافقین ہیں جن کے ظاہری ایمان لانے کا مقصد ہی اس کے ذریعے کسی اور کا تقرب حاصل کرنا، یا دنیا کی زندگی کی زینت

کا حصول، یا دین اسلام کی بیخ کنی ہوتا ہے۔[ریاکاری جو کہ شرک اصغر ہے، اس کا معاملہ اس شرک سے جدا ہے]

- **اطاعت میں شرک؛** حرام و حلال مقرر کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالٰی کو ہے، اگر کوئی شخص اپنے مذہبی پیشواؤں؛ حکمرانوں یا ججوں کو یہ حق دے کہ وہ اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے سکتیں ہیں، تو وہ اللہ تعالٰی کی اطاعت میں شرک کرتا ہے۔

✓ "اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ"۔ [سورة التوبة؛ ۳۱] "انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابن مریم کو **اللہ کے سوا خدا بنا لیا** حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے"۔ عدی بن حاتم ﷛ نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ ہم نے اپنے علماء کی کبھی عبادت نہیں کی" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ان علماء نے جس کو حلال قرار دیا اس کو تم نے بھی حلال سمجھا اور جس کو ان علماء نے حرام قرار دیا اس کو حرام سمجھا؛ **یہی ان کی عبادت ہے**" [ترمذی؛ ۳۰۹۵]

- **محبت میں شرک؛** اللہ کے ساتھ ساتھ کسی دوسری چیز سے اللہ جیسی محبت کرنا؛ یہ شرکیہ محبت ہے۔

✓ "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ـــــ" [سورة البقرة؛ ۱۶۵] اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر خدا کو شریک (خدا) بناتے اور **ان سے خدا کی سی محبت** کرتے ہیں۔ لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو خدا ہی کے سب سے زیادہ دوست دار ہیں ـــــ

ب. **وسیلہ سمجھ کر یا شفاعت کرنے والا مان کر پکارنا؛** جو شخص اللہ تعالٰی کو خالق؛ رازق اور مالک ماننے کے باوجود غیر اللہ کو سفارشی سمجھ کر پکارے گا اور ان پر بھروسہ کرے گا وہ کافر ہو جائے گا۔

- "وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ۔۔۔۔۔" [سورة یونس؛۱۸] "اور یہ (لوگ) خدا کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کا کچھ بگاڑ ہی سکتی ہیں اور نہ کچھ بھلا ہی کر سکتی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ **خدا کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں**۔۔۔۔"۔

- "أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ" [سورة الزمر؛۳] "دیکھو خالص عبادت خدا ہی کے لئے (زیبا ہے) اور جن لوگوں نے اس کے سوا اور دوست بنائے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ **ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں**۔ تو جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں خدا ان میں ان کا فیصلہ کر دے گا۔ بے شک خدا اس شخص کو، جو جھوٹا ناشکرا ہے، ہدایت نہیں دیتا"۔

ت. **مشرکوں کو کافر نہ سمجھنا:** جس نے مشرکوں کو کافر نہیں سمجھا، یا ان کے کافر ہونے میں شک کیا، یا ان کے مذہب کو صحیح سمجھا، تو وہ شخص کافر ہے۔ کفار کے مذہب کو اچھا کہنا یا اس کی تعریف کرنا رواداری نہیں بلکہ اللہ کے دین کے ساتھ کھلا کفر ہے۔

- "قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ ۔۔۔۔۔" [سورة الممتحنه؛۴] تمہیں ابراہیم علیہ السلام اور ان کے رفقاء کی نیک چال چلنی (ضرور) ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے، جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو، بے تعلق ہیں (اور) تمہارے (معبودوں کے کبھی) قائل نہیں (ہو سکتے) اور جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ **ہم میں، تم میں، ہمیشہ کھلم کھلا عداوت اور دشمنی رہے گی**۔۔۔۔

اسلام کا دعوی کرنے والے پر لازم ہے کہ، وہ مشرکوں کو کافر قرار دے؛ ان سے دشمنی رکھے اور جو ان مشرکوں سے محبت کرے اور ان کا دفاع کرے ان سے بھی بغض رکھنا چاہیے۔

ث. **کسی فلسفے کو دین پر ترجیح دینا:** جس نے یہ سمجھا کہ نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی اور کا طریقہ زندگی زیادہ مکمل اور جامع ہے، یا نبی کریم ﷺ کے طریقہ حکمرانی سے بہتر اور کوئی طریقہ حکمرانی ہے، تو وہ کافر ہے۔ جو سیاست، نظام، تعلیم، نظام معیشت اور سماجی سائنس کے دیگر افکار میں سے کسی ایک معاملے میں کسی فلسفے یا نظریہ کو اللہ کے دین پر ترجیح دیتا ہے، تو وہ کافر ہے۔ اور جس نے انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے طاغوتی قوانین کو رسول اللہ ﷺ کے طریقہ سے بہتر سمجھا، یا ان قوانین کے ذریعے فیصلہ کرنا جائز سمجھا، یا زانی کو رجم کرنے اور چور کے ہاتھ کاٹنے کو آج کے دور کے لیے نامناسب خیال کیا، تو پس وہ کافر ہے۔

- ✓ "۔۔۔۔۔ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۔۔۔۔۔" [سورۃ المائدہ؛ ۳] "۔۔۔۔۔ آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا **دین کامل کر دیا** اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔۔۔۔۔"۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے میں تمہارے پاس ایک ایسی شریعت لے کر آیا ہوں جو روشن اور صاف ستھری ہے، تم ان اہل کتاب سے کسی چیز کے متعلق سوال نہ کیا کرو اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں صحیح بات بتائیں اور تم اس کی تکذیب کرو اور غلط بتائیں تو تم اس کی تصدیق کرو۔ اس ذات کی قسم، جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو انہیں بھی **میری پیروی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہوتا**"۔ [مسند احمد۔ جلد ششم۔ حدیث ۱۰۲۷]

ج. **دین سے بغض رکھنا:** جس نے نبی کریم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی کسی چیز کو ناپسند کیا اور اس سے بغض رکھا وہ شخص کافر ہے۔ مثلاً چار شادیوں کی اجازت کو؛ دو عورتوں کی گواہی، ایک مرد کی گواہی کے برابر کو؛ پردہ کے احکامات کو؛ داڑھی کو؛ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کو؛ زانی کے رجم اور چور

کے ہاتھ کاٹنے کی سزاؤں وغیرہ کو، ناپسند کیا تو ایسا شخص دین کی کسی ایک بات سے نفرت یا بغض رکھنے کی بنا پر کافر ہے۔

- ✓ "وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ" [سورة محمد؛ ٨،٩] اور جو کافر ہیں ان کے لئے ہلاکت ہے۔ اور وہ ان کے اعمال کو برباد کر دے گا۔ یہ اس لئے کہ خدا نے جو چیز نازل فرمائی **انہوں نے اس کو ناپسند کیا** تو خدا نے بھی ان کے اعمال اکارت کر دیئے۔

ح. **دین کا مذاق اڑانا؛** دین اسلام کے کسی امر کا استہزا کرنا، اس کا مذاق اڑانا، اجماع امت کے مطابق کفر ہے؛ اگرچہ کوئی غیر سنجیدگی سے بھی اس فعل کا ارتکاب کرے۔

- ✓ "۔۔۔۔۔ وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ۔۔۔۔۔" [سورة التوبة؛ ٦٥، ٦٦] "اور اگر تم ان سے (اس بارے میں) دریافت کرو تو کہیں گے ہم تو یوں ہی بات چیت اور دل لگی کرتے تھے۔ کہو کیا **تم خدا اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول ﷺ سے ہنسی کرتے تھے**۔ بہانے مت بناؤ، تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔۔۔۔۔"۔

پس رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والے دین کی کسی بات کا مذاق اڑانا، چاہے وہ، نماز ہو؛ داڑھی ہو؛ شلوار کا ٹخنے سے اوپر کرنا ہو؛ شرعی پردہ ہو؛ سود کا چھوڑنا ہو، یا جنت اور جہنم کی کسی چیز کا ذکر ہو، کفر ہے۔ بعض لوگ جنت یا جہنم، حتی کہ فرشتوں اور اللہ تعالٰی کے بارے میں بھی، ایسے چٹکلے بیان کرتے ہیں گویا کہ یہ سب ڈھکوسلے ہوں اور "دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال اچھا ہے" جیسی بات ہو۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات کا احترام اور تعظیم ہر مسلمان پر لازم ہے۔ جنت اور جہنم کے ذکر سے دلوں پر ایک ہیبت اور خوف بیٹھنا چاہیے۔ دین کی ہر بات کا تقدس ہے۔ جو شخص دین کی کسی بات کا مذاق اڑا کر لوگوں کو ہنسائے، تو صریحاً کفر ہے اور جو شخص اس استہزا کو سنے اور اس میں ایمانی غیرت بیدار نہ ہو اور اسی مجلس میں بغیر کسی سخت مجبوری کے شریک رہے، تو اس کا حکم بھی وہی ہے، جو دین کا استہزا کرنے والے کا ہے۔

خ. **جادو؛** پس جس نے جادو کیا، یا اس سے رضا مند ہوا، اس نے کفر کیا۔

- ✓ "۔۔۔۔۔ يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۔۔۔۔۔" [سورۃ البقرۃ ؛۱۰۲] "۔۔۔۔۔اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے، جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعہ) آزمائش ہیں۔ **تم کفر میں نہ پڑو**۔۔۔۔۔"
- ✓ رسول اللہ ﷺ نے جادو کو سات ہلاکت خیز گناہوں میں شمار کیا۔ [صحیح بخاری ۔ جلد دوم ۔ وصیتوں کا بیان ۔ حدیث ۴۳]
- ✓ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہیں کہ "جو شخص **کاہن یا نجومی کے پاس جائے اور اس سے کچھ پوچھے** {یعنی غیب کی باتیں دریافت کرے} تو اس کی چالیس دن رات کی نمازیں قبول نہیں کی جاتی" ۔[مشکوۃ شریف ۔ جلد چہارم ۔ طب کا بیان ۔ حدیث ۵۲۹]
- ✓ جو شخص کسی **کاہن یا نجومی کے پاس جائے اور اُس کی باتوں کی تصدیق کرے** تو گویا اس نے محمد ﷺ پر نازل ہونے والی شریعت سے کفر کیا۔" [مسند احمد ۔ جلد چہارم ۔ حدیث ۲۳۵۰]

آج شہروں میں، گمراہ سنیاسی عامل اور نجومی جگہ جگہ بورڈ لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں اور اعلانیہ کالا علم کا ماہر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؛ اسی طرح اخبارات میں "آپ کا ہفتہ کیسا گزرے گا" کے عنوان سے جھوٹی خبریں؛ حالانکہ ان تمام کا گاہک بننے سے اور ان کی تصدیق کرکے، آدمی مسلمان نہیں رہتا۔

د. **مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد؛** کافروں کی طاقت کو مضبوط کرنے اور مسلمانوں پر انہیں فتح یاب کرنے کے لیے مسلمانوں کی جاسوسی کرنا؛ ان کے راز کفار تک پہنچانا اور مسلمانوں پر کفار کے غلبہ کے لیے کوشش کرنا، صریحاً کفر ہے۔

- ✓ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ" [سورۃ المائدۃ؛۵۱] "اے ایمان والو!

یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور **جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہیں میں سے ہو گا** بیشک خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

لہٰذا ہر وہ اتحاد جو مجاہدین فی سبیل اللہ کے خلاف آمادہ جنگ ہو، اس کا حصہ بننا، جس سے اسلام و مسلمین کا جھنڈا سرنگوں اور کفر کا جھنڈا سربلند ہو، یا اس کی مدد کرنا، وہ جرم ہے، جس سے آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

ذ. **شریعت محمدی سے خروج کو جائز سمجھنا؛** جس نے شریعت محمدی سے خروج کیا، یا اس کو جائز سمجھا، اور یہ گمان کیا کہ اس کو یا کسی خاص مسلمان کو اس دین کی ضرورت نہیں ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم کو سکھایا تھا؛ وہ کافر ہے اور اسلام سے خارج ہے۔

✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میری امت جنت میں داخل ہو گی مگر وہ آدمی جس نے انکار کیا اور سرکشی کی وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا"، پھر پوچھا گیا "وہ کون آدمی ہے جس نے انکار کیا اور سرکشی کی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: جس آدمی نے میری اطاعت و فرمانبرداری کی وہ جنت میں داخل ہوا۔ اور **جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا اور سرکشی کی۔**" [مشکوۃ شریف۔ جلد اول۔ کتاب اور سنت کو مضبوطی سے پکڑنے کا بیان۔ حدیث ۱۴۰]

ر. **دین سے اعراض؛** کفر اعراض، وہ کفر ہے جس میں انسان کا کلمہ پڑھنے کے باوجود، دین سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اعراض کرنے والا شخص وہ ہے، جو اللہ کے دین کی طرف متوجہ نہیں ہوتا؛ نہ دین کا علم سیکھتا ہے اور نہ ہی دین کے کسی حکم پر عمل کرنے کا اسے خیال آتا ہے۔ ایسا شخص اس رویہ کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ دین اسلام سے اعراض اور روگردانی کرنے سے مراد ہے، کہ دین اسلام کی بنیادی عقائد و تعلیم سے بھی لاعلم رہنا، جن سے آدمی مسلمان بنتا ہے؛ اس سے مراد دین کا تفصیلی علم نہیں ہے، جو علماء و طلباءِ دین کا خاصہ ہے۔

- ✓ "وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى "[سورة طه؛ ۱۲۴] "اور جو **میری نصیحت سے منہ پھیرے گا** اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کو ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے"۔
- ✓ "۔۔۔۔۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا أُنْذِرُوا مُعْرِضُونَ "[سورة الاحقاف؛ ۳] "۔۔۔۔۔ اور کافروں کو جس چیز کی نصیحت کی جاتی ہے اس سے **منہ پھیر لیتے ہیں**"۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں؛ کفر اعراض، سے مراد وہ کفر ہے، جس میں کوئی شخص اپنے دل اور کانوں سے رسول اللہ ﷺ کے قول سے اعراض کرے؛ رسول ﷺ کی تصدیق کرے اور نہ ہی تکذیب کرے؛ رسول ﷺ سے دوستی رکھے اور نہ ہی دشمنی رکھے اور کتاب و سنت کی طرف، جو رسول ﷺ لے کر آیا ہے، مائل نہ ہو۔ [مدارج السالکین]

ز. تقدیر کا انکار کفر ہے؛

- ✓ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر امت میں مجوسی ہیں اور میری امت کے مجوسی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ تقدیر نہیں ہے۔ ان میں سے جو مر جائے تو تم اس کے جنازے میں شریک نہ ہو اور جو ان میں سے بیمار ہو جائے تو ان کی عیادت نہ کرو اور **وہ دجال کے گروہ ہیں** اور اللہ تعالیٰ کا ان پر حق ہے کہ ان کو دجال سے ملا دے"۔ [سنن ابوداؤد۔ جلد سوم۔ سنت کا بیان۔ حدیث ۱۲۸۸]۔
- ✓ آپ ﷺ نے فرمایا "۔۔۔۔۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کا اور اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور قیامت کا یقین رکھو، **تقدیر الٰہی کو یعنی ہر خیر و شر کے مقدم ہونے کو سچا جانو**۔۔۔۔۔" [صحیح مسلم۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۹۶]

مندرجہ بالا امور کے علاوہ بھی بہت سے عقائد؛ اقوال اور اعمال ایسے ہیں جن کے حاملین کو علمائے حق نے مرتدین کہا ہے مثلاً؛

- جو اللہ تعالیٰ کو یا اس کے رسولوں میں سے کسی رسول یا فرشتوں میں سے کسی فرشتے کو گالی دیتا ہے۔
- انبیاء و رسل میں سے کسی رسول کا منکر؛ یا خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے بعد کسی نئے نبی کی آمد کا قائل ہو۔
- شریعت کے فرائض میں سے کسی فریضہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، والدین کی اطاعت وغیرہ کا انکار کرنے والا۔
- اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ کام مثلاً زنا، شراب، چوری، جادو، قتل وغیرہ کو جائز سمجھنے والا۔
- قرآن مجید کو غلاظت کی جگہ پھینکنے والا؛ اس کو پاؤں کے نیچے روندنے والا اور اس کی توہین کرنے والا۔
- اللہ تعالیٰ، فرشتوں، رسولوں، کتابوں اور آخرت میں سے کسی چیز کا انکار کرنے والا۔
- اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں سے کسی کا انکار کرنے والا۔

یہ تمام امور اسلام کی ضد اور منافی ہیں اور ان تمام امور کا مرتکب کافر اور مرتد ہے؛ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی شخص ان کا ارتکاب مذاقاً کرتا ہے یا سنجیدہ ہو کر۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

تبلیغ کی حقیقت

تبلیغ سے لغوی طور پر مراد ہے "پہنچانا" اور اسلامی اصطلاح کے طور پر اس سے مراد "اللہ اور رسول ﷺ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا؛ اسلام کی تعلیمات صحیحہ کو دوسروں تک پہنچانا؛ دین اسلام کی تعلیمات کا صحیح مفہوم لوگوں تک پہنچانا اور اللہ کے دین کو تمام ادیان پر سربلند کرنے کی کوشش کرنا" ہے اور اس کی فرضیت کے دلائل مندرجہ ذیل ہے؛

قرآن مجید میں اللہ تعالی نے اپنے رسول ﷺ پر تبلیغ کو فرض فرمایا؛

- ✓ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ۔۔۔۔ [سورة المائدة ؛ ٦٧] "اے پیغمبر ﷺ جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب **لوگوں کو پہنچادو**۔۔۔۔"
- ✓ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ [سورة التوبة ؛ ٢٩] جو اہل کتاب میں سے خدا پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر (یقین رکھتے ہیں) اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو خدا اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں **ان سے جنگ کرو** یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

اور احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت پر تبلیغ کو فرض فرمایا؛

- ✓ "میری بات دوسرے **لوگوں کو پہنچادو** اگرچہ وہ ایک ہی آیت ہو۔۔۔۔" [صحیح بخاری۔ جلد دوم۔ انبیاء علیہم السلام کا بیان۔ حدیث ٧١٨]

تبلیغ؛ دین کی بنیادی ترین اصطلاح ہونے کہ ساتھ ساتھ، رسول اللہ ﷺ کے سمیت تمام انبیاء اور رسولوں کا بنیادی فرض منصبی بھی تھا؛ اور رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت کے باعث اس فرض کا **خصوصی** بوجھ دینی اور

دنیاوی "اولو الامر" کی صورت میں امت کے علماء، مشائخ اور حکمرانوں پر ہے اور **عمومی** طور تمام امت اس فرض کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے۔

مگر جس طرح جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح کا اطلاق کسی ایک خاص طریقہ یا عمل پر نہیں ہے بلکہ یہ مختلف اعمال اور طریقوں کے مجموع کا مظہر ہے، جس کی چوٹی "قتال فی سبیل اللہ" ہے، اسی طرح اس اسلامی فریضہ تبلیغ کا اطلاق بھی کسی ایک خاص طریقہ یا عمل پر نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی مختلف اعمال کے مجموعے کا نام ہے اور تبلیغ کے دو مختلف میدان عمل ہونے کی وجہ سے اس کی دو چوٹیاں ہیں "**امر بالمعروف و نہی المنکر**" اور "**اقدامی جہاد فی سبیل اللہ**"۔ تبلیغ کی حیثیت دینی اور دنیاوی "اولو الامر" کی سطح پر تو فرض عین کی سی ہے، مگر عوامی سطح پر انفرادی حالات کی بنیاد پر کبھی فرض عین؛ کبھی فرض کفایہ؛ کبھی سنت؛ کبھی مستحب اور کبھی مباح، حتی کہ کبھی کسی فساد کے پیش نظر ممنوع۔

میرے ناقص مطالعہ کے مطابق اس دینی فریضہ کے چھ [٦] مختلف طریقہ کار قرآن اور حدیث سے ثابت ہیں؛ جن میں سے تین اندرونی طریقے ہیں جن کا تعلق باہم مسلمانوں میں دین کی ترویج اور مسلمان معاشرہ کے تحفظ اور اصلاح سے ہے اور دو بیرونی طریقے ہیں جن کا تعلق کفار کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے سے ہے اور ایک کا تعلق دونوں معاشروں سے ہے۔

أ. **تعلیم** [علم سیکھانا] و **تعلم** [علم سیکھنا] [اندرونی طریقہ]

- ✓ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ **[سورة التوبة ؛ ١٢٢]** "اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں۔ تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ **دین کا [علم سیکھتے اور اُس] میں سمجھ پیدا کرتے** اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو **ان کو ڈر سناتے تاکہ وہ حذر کرتے**"

اگرچہ مندرجہ بالا آیت کے اصل مخاطب علمائے اکرام ہیں مگر حدیث پاک "جس سے **علم کی کوئی بات پوچھی گئی** اور اس نے نہیں بتائی، اس کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام لگا دی جائے گی۔" [احمد، ابو داود، ترمذی، ابن ماجه] کی وجہ سے یہ ہر اس شخص پر واجب ہے جس سے کوئی ایسا مسئلہ استفسار کیا گیا ہو جس کا وہ عالم ہو۔

عمومی سطح پر سیرت رسول ﷺ سے ہر کس و نا کس نہیں، بلکہ فقط اہل علم پر مبنی انفرادی یا اجتماعی وفود کی تشکیل اور ارسال، اصحاب صفہ کے مثل مدارس اور مساجد میں تعلیمی حلقے وغیرہ اسی طریقہ تبلیغ کی سنت کے تحت موجود ہیں۔

ب. **مواعظ حسنہ** [اندرونی طریقہ]

✓ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا [سورة النساء؛ ٦٣] "ان لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے خدا اس کو خوب جانتا ہے تم ان [کی باتوں] کو کچھ خیال نہ کرو اور **انہیں نصیحت کرو اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں میں اثر کر جائیں**"

اس طریقہ تبلیغ کے بھی اصل مخاطب اور اہل، اس امت کے علماء، احبار اور شیوخ ہیں، کیونکہ دین میں مواعظ حسنہ [بشمول فضائل اعمال] کا دین کی بنیادوں یعنی قرآن و حدیث [صرف صحیح و حسن] کے تابع ہونا لازم ہے اور ہر نماز جمعہ سے پہلے کا وعظ اسی زمرہ میں آتا ہے۔ اور عصر حاضر میں گو یہی طریقہ تبلیغ انتہائی وسیع پیمانہ پر ہر دینی جماعت وغیرہ کے زیر استعمال ہے، مگر عموماً اس میں نہ واعظ کی اور نہ ہی وعظ کردہ مواد کے علمی حیثیت کا تعین لازمی سمجھا جاتا ہے۔

سیرت رسول ﷺ اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس طریقہ تبلیغ کے تحت عوامی خطبات اور دینی حلقے ہی معروف سنت ہیں۔

ت. **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** [اندرونی طریقہ]

✓ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ

[سورۃ آل عمران، ۱۱۰] "[مومنو] جتنی امتیں [یعنی قومیں] لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ **نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو** اور خدا پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہت اچھا ہوتا ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں [لیکن تھوڑے] اور اکثر نافرمان ہیں"

یہ دینی اصطلاح اپنی جامعیت اور وسعت کے حساب سے تبلیغ کی اسلامی اصطلاح کی مکمل ہم پلہ اور مترادف ہے، بلکہ یہ کہنا کہ اسلامی معاشروں میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی اصل تبلیغ، بلکہ تبلیغ کی چوٹی ہے، تو بے جا نہیں ہو گا۔ کیونکہ حدیث کے مطابق "**افضل جہاد**" یعنی جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق بیان کرنے کا تعلق اسی طریقہ تبلیغ سے ہے۔ احادیث کی بنیاد پر جو فرق ان دونوں میں بیان کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ "تبلیغ" کا تعلق کل دین یعنی باطنی عقائد اور ظاہری اعمال دونوں سے ہے، جب کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عمومی تعلق اسلامی معاشرہ کے تحفظ اور اصلاح سے منسلک ہونے کے باعث صرف ظاہری اقوال اور اعمال سے ہے۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "راستوں میں بیٹھنے سے بچتے رہو"، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ ہمارے لئے تو اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ کر گفتگو کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں"، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اگر تم انکار کرتے ہو [یعنی تمہیں ضرور ہی بیٹھنا پڑے] تو پھر راستے کا حق ادا کرو"، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ "راستے کا حق کیا ہے؟"، رسول اللہ ﷺ فرمایا کہ "نگاہ نیچی رکھنا اور تکلیف پہنچانے سے باز رہنا، سلام کا جواب دینا اور **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا**"۔ [سنن ابوداؤد۔ جلد سوم۔ ادب کا بیان۔ حدیث ۱۴۱۱]
- ✓ پھر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ کی قسم تم لوگ ضرور **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو گے** اور تم ضرور ظالم کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لوگے۔ اور اسے حق کی طرف مائل کرو گے اور تم اسے حق پر روکے رکھو گے۔ جیسا کہ حق پر روکنے کا حق ہے"۔ [سنن ابوداؤد۔ جلد سوم۔ لڑائی اور جنگ وجدل کا بیان۔ حدیث ۹۴۲]

یہ طریقہ تبلیغ "اولو الامر" یعنی حکمران اور علماء پر تو فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے، مگر عوام میں مندرجہ ذیل حدیث کی روشنی میں اس کی فرضیت ہر شخص کی ذہنی وجسمانی استطاعت، حالات اور دائرہ اختیار کی وجہ سے مختلف فیہ ہے۔

- ✓ آپ ﷺ نے فرمایا "**تم سب لوگ نگہبان ہو**، اور تم سب لوگوں سے سوال کیا جائے گا، امام بھی نگہبان ہے، اس سے بھی سوال ہو گا، تم نے [رعیت کے ساتھ کیا برتاؤ کیا] مرد اپنے گھر والوں پر نگہبان ہے اور اس سے بھی سوال کیا جائے گا، اور غلام بھی اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اس سے بھی سوال کیا جائے گا، خبردار! تم سب نگہبان ہو اور تم سے سوال ہو گا"۔ **[صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ نکاح کا بیان۔ حدیث ۱۷۶]**

سیرت رسول ﷺ سے انفرادی یا اجتماعی وفود کی تشکیل اور ارسال کے دلائل تو اس طریقہ تبلیغ کے تحت عدم موجود ہیں، مگر مسلمان معاشروں میں گشت کی سنت کی گنجائش اوپر بیان کی گئی "راستوں میں بیٹھنے" والی حدیث کی روشنی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اس طریقہ تبلیغ کے تحت ممکن ہے۔

ث. **دعوت دین** [بیرونی طریقہ]

- ✓ ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ **[سورة النحل؛ ۱۲۵]** "[اے پیغمبر] لوگوں کو **دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ**۔ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔ جو اس کے رستے سے بھٹک گیا تمہارا پروردگار اسے بھی خوب جانتا ہے اور جو رستے پر چلنے والے ہیں ان سے بھی خوب واقف ہے"

اس طریقہ تبلیغ کے اصل مخاطب قرآن اور سنت کے مطابق صرف کفار ہیں؛ کیونکہ ہر مسلمان کو تعلیم و تعلم، مواعظ حسنہ یا امر بالمعروف و نہی المنکر کے ذریعے "اپنے پروردگار کے **راستے پر چلانے**" کی ضرورت تو ہو سکتی ہے، مگر اس کو دوبارہ "اپنے پروردگار کے **راستے کی طرف بلانا**"، جس کا وہ پہلے ہی علم بردار ہے، ایک بے معنی کاوش ہے۔

قرآن اور سیرت رسول ﷺ کے شواہد گواہ ہیں کہ اس دعوت کے خصوصی مخاطب ہمیشہ " ٱلۡمَلَأُ" یعنی "کفار کے سردار" رہے ہیں، گو کہ عام کفار اس دعوت کی عمومیت میں شامل ہے اور اس کی وجہ عربی کے اس مشہور مقولہ سے بآسانی سمجھ آسکتی ہے کہ "الناس علی دین ملوکھم "یعنی "عوام حکمرانوں کے طریقے پر چلتے ہیں"۔

سیرت رسول ﷺ سے ہر کس و ناکس نہیں، بلکہ فقط اہل علم پر مبنی انفرادی یا اجتماعی وفود کی تشکیل اور ارسال کے دلائل، اس طریقہ تبلیغ کے تحت موجود ہیں اور گشت کی مشہور سنت جو رسول اللہ ﷺ کے علاوہ تمام انبیاء علیہم السلام کی بھی مستقل سنت رہی ہے، اس کا تعلق بھی اسی طریقہ تبلیغ سے ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ مکہ کی گلیوں، بازاروں، میلوں اور طائف کی وادیوں میں کفار کو **دین کی دعوت** دیتے نظر آتے ہیں۔

ج. **مجادلہ** [باہمی طریقہ]

- ✓ ادۡعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُم بِالَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعۡلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِينَ [سورة النحل؛ ۱۲۵] "[اے پیغمبر] لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ۔ اور بہت ہی **اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو**۔ جو اس کے رستے سے بھٹک گیا تمہارا پروردگار اسے بھی خوب جانتا ہے اور جو رستے پر چلنے والے ہیں ان سے بھی خوب واقف ہے"

یہ میدان فقط علماء کے لیے مخصوص ہے اور عوام کا اس میں نہ کوئی کردار ہے اور نہ ہی اس کی سنگینی اور نزاکت کے باعث ہونا چاہیے۔ مسلمان معاشروں میں عام مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت اور فتنوں کے سدّ باب کے لیے اور کفار معاشروں میں دین حق کی تبلیغ کے لیے، انفرادی و اجتماعی وفود کی تشکیل اور ارسال، حق پرست اہل علم کی صوابدید پر ہے۔ مگر گشت کے ذریعے اس طریقہ تبلیغ کی ادائیگی پر کوئی طبقہ فکر مُصر نہیں ہے۔

ح. **اقدامی جہاد** [بیرونی طریقہ]

- ✓ وَقَاتِلُوهُمۡ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتۡنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوۡا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعۡمَلُونَ بَصِيرٌ [سورة التوبة؛ ۳۹] "اور ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ [یعنی کفر کا

فساد] باقی نہ رہے اور **دین سب خدا ہی کا ہو جائے** اور اگر باز آجائیں تو خدا ان کے کاموں کو دیکھ رہا ہے"

ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر، اگر کوئی شخص بھی نیک نیتی سے سیرت رسول ﷺ اور سیرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا مطالعہ کرے گا، تو اس طریقہ تبلیغ کی افادیت اور دوررس نتائج کی کامیابی سے انکار نہیں کر سکے گا۔ وہ کفار کے سردار جنہوں نے براہ راست یا بالواسطہ، دعوت دین کے طریقہ تبلیغ کو رد کر دیا اور اپنی قوم کی ہدایت پانے کے راستے سے ہٹنے سے انکار کیا، تو ان کے لیے یہ تبلیغ کا آخری طریقہ انتہائی مؤثر اور وسیع پیمانے پر عوام کی ہدایت کا سبب بنا۔ سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۹ کی روشنی میں، اقدامی جہاد فی سبیل اللہ کا طریقہ تبلیغ ہونے کی سب سے واضح دلیل وہ شرائط ہیں، جو قتال سے پہلے کفار کے سامنے رکھنا لازم ہیں یعنی دین اسلام قبول کر لو یا جزیہ قبول کر لو۔ پہلی صورت میں تو وہ خود اسلام کے داعی بن جاتے ہیں اور دوسری صورت میں عوام کے اوپر سے ان کی "اولو الامر" والی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور عوام آزادنہ فیصلہ کرنے پر قادر ہو جاتی ہے۔

قرآن، احادیث اور سیرت رسول ﷺ کے شواہد سے یہ طریقہ تبلیغ "اولو الامر" یعنی حکمران اور علماء پر تو فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے، [مگر عمومی سطح پر فرض کفایہ ہونے کے باوجود] اسلامی حکومتوں کے زوال سے پہلے تک، یہی طریقہ تبلیغ عوام الناس میں مقبول ترین تھا۔ اسی طریقہ تبلیغ کی فضلیت میں قرآن و حدیث رطب اللسان نظر آتے ہیں اور اسے کل دین کی چوٹی قرار دیتے ہیں اور قرآن و حدیث کے سیکڑوں صریح دلائل کی بنیاد پر ہر اہل علم کو واضح ہے کہ عوام الناس در حقیقت اسی طریقہ تبلیغ کے اصل مخاطب ہیں۔

کیا ہر دور میں "لا الہ الا اللہ" کی تبلیغ انبیاء علیہم السلام کی سنت کی پیروی اور امت کا فریضہ اول نہیں ہے؟

کلمہ توحید "لا الہ الا اللہ" نہ صرف دین اسلام کی واحد بنیاد ہے بلکہ اس کل کائنات کی بقا کا باعث ہی یہی کلمہ ہے۔ اس کلمہ کے علم کا حصول [فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ ۔۔۔ سورۃ محمد:۱۹] اور اس کی تبلیغ نہ صرف رسول اللہ ﷺ بلکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام [معروفاً] کا بنیادی فرض منصبی تھا اور رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے بدولت یہ اس امت کا بھی اولین فریضہ ہے۔

مگر یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام پر تمام مصائب و تکالیف کا تعلق اسی کلمہ کی تبلیغ سے ہے؛ دین کا کوئی بھی عمل اپنے نتیجہ کے اعتبار سے نفس پر اتنا بھاری نہیں جتنا اس کلمہ کی تبلیغ؛ حتّٰی کہ جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں۔ اور اس بوجھ کا تعلق **اللہ کی واحدانیت [إِلَّا اللَّهُ]** کے اعلان سے زیادہ در حقیقت **طاغوت کے انکار سے ہے [لَا إِلَٰهَ]**۔ قرآن حکیم کے مطابق اس کلمہ کے حامل وہی افراد ہیں جو اس کے دونوں اجزا پر ایمان لاتے ہیں اور اسی لیے اس کلمہ کی تبلیغ بھی وہی معتبر ہے جو ان دونوں اجزا کے تبلیغ پر محیط ہو۔

- ✓ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ [سورة البقرة؛ ٢٥٦] دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے ہدایت (صاف طور پر ظاہر اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے تو جو شخص **طاغوت سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے** اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی ہے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور خدا (سب کچھ) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے۔
- ✓ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ [سورة النحل؛ ٣٦] اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ **خدا ہی کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو**۔ تو ان میں بعض ایسے ہیں جن کو خدا نے ہدایت دی اور بعض ایسے ہیں جن پر گمراہی ثابت ہوئی۔ سو زمین پر چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

چونکہ یہ کلمہ توحید "لا الہ الا اللہ" ہر قسم کے طاغوت سے انکار کی صورت میں ہر باطل نظام سے بغاوت کا اعلان ہے؛ اسی لیے یہ کلمہ ہر دور کے باطل نظام سے منسلک مستفیدین کے لیے ناقابل قبول رہا ہے اور اس کے حقیقی مبلغین ان کے ظلم و جور کا نشانہ رہے ہیں۔ آج بھی جو اشخاص اس کلمہ کی تبلیغ کا دائرہ طاغوت کے انکار تک وسیع کرنے پر اصرار کرتے ہیں وہ تمام مروجہ باطل نظاموں کے لیے ناقابل قبول ہیں اور یہ نظام ایسے اشخاص کو اپنے سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے؛ جیسا کہ ماضی میں تمام انبیاء علیہم السلام؛ رسولوں علیہم السلام اور ان کے سچے ورثا کے ساتھ ہوا۔

اور اس کے بر عکس جو اشخاص صرف اللہ کی واحدانیت کی تبلیغ پر قانع ہیں، ان کے لیے نہ صرف ان باطل نظاموں کے دروازے کھلے ہیں بلکہ یہ باطل نظام انہیں دیگر باطل عقائد کے مبلغین کے مساوی ٹھہراتے ہوئے، ان کے اس جزوی اور بے ضرر تبلیغ کے حق کی فراہمی کو بھی یقینی بناتے ہیں۔

اس مطالعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں تبلیغ کو اصرار کے ساتھ محض چند مخصوص اعمال اور خود ساختہ طریقہ کار کے تابع کرنا، در حقیقت سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ کسی بھی بدعت کی طرح، جو عمل بھی جو اپنی اصل اسلامی اصطلاح سے ہٹ کر استعمال کیا جائے، وہ عمل؛

اول؛ اپنی ذات میں اس ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے، جو قرآن و سنت کی صورت میں، اس عمل کے فرائض، سنتوں اور مستحبات کا تعین کرتی ہے۔ اور

دوم؛ نتیجہ کے اعتبار سے اگرچہ انفرادی فوائد کا حصول، نیت کے اخلاص اور جتنا عمل سنت کے مطابق ہو اس کے باعث ممکن ہو، مگر اجتماعی طور پر یہ برکت سے محروم اور امت کی سطح پر بے فائدہ ہوتا ہے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

الولا و البراء کی حقیقت

عقیدہ الولا والبراء سے کیا مراد ہے؟

"**عقیدہ الولاء**" سے مراد سب سے پہلے اللہ تعالی سے، اس کے بعد رسول اکرم ﷺ سے اور اس کے بعد تمام اہل ایمان سے محبت کرنا ہر مسلمان پر واجب ہوتا ہے۔ عقیدہ الولاء کی ضد "**عقیدہ البراء**" سے مراد ہر مسلمان پر **اسلام دشمن کفار** سے شدید نفرت اور بیزاری کا اظہار کرنا واجب ہونا؛ موقع ملنے پر ان کے خلاف جہاد [یعنی قتال] کرنا؛ ان کی قوت توڑنا اور ان سے ظلم کا بدلہ لینا فرض ہوتا ہے۔

- ✓ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۔۔۔۔۔ [سورۃ الفتح؛ ۲۹]
  محمد ﷺ خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ **کافروں کے حق میں سخت ہیں اور آپس میں رحم دل**۔۔۔۔۔

کیا غیر حربی یا غیر اسلام دشمن کافر سے برابری کی بنیاد پر تعلقات بھی عقیدہ الولا والبراء کے منافی ہیں؟

اللہ سبحان و تعالٰی کی نظر میں ایک کافر [حربی یا غیر حربی؛ اسلام دشمن یا غیر اسلام دشمن] کی وقعت اور حیثیت ایک چوپایہ کے برابر بھی نہیں ہے؛ کُجا کہ کسی مسلمان کے ساتھ اس کی برابری کا تصور کیا جا سکے۔

- ✓ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ [سورۃ الانعام؛ ۱۷۹] " اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے

کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ **یہ لوگ بالکل چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے**۔یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں"۔

مزید فرمایا؛

- ✓ لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ [سورة الحشر؛ ۲۰] "**اہل دوزخ اور اہل بہشت برابر نہیں**۔اہل بہشت تو کامیابی حاصل کرنے والے ہیں"۔

تعلقات کی اقسام میں؛دوستی ہی وہ پہلا تعلق ہے،جو دواشخاص کے بیچ میں،برابری کی سطح کے تعلقات کا متقاضی ہوتا ہے،تو اس کے بارے میں قرآن کا فتویٰ مندرجہ ذیل ہے [اسلام دشمن یا غیر اسلام دشمن کی قید کے بغیر]

- ✓ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ ۔۔۔۔[سورة آل عمران؛ ۲۸] "مؤمنوں کو چاہئے کہ مؤمنوں کے سوا **کافروں کو دوست نہ بنائیں** اور جو ایسا کرے گا اس سے خدا کا کچھ (عہد) نہیں۔۔۔۔"۔

مزید سوچنے کا مقام یہ ہے کہ؛جو دین ایک مسلمان اور کافر کے بیچ میں برابری کے تعلقات کو ہی ممنوع قرار دیتا ہو،وہیں کوئی کافر [اسلام دشمن یا غیر اسلام دشمن] کسی مسلمان پر "قوّام"[Position of Authority] کیسے مقرر ہو سکتا ہے؟؟؟؟یہی وہ نکتہ ہے،جس کے تحت مسلمان مرد کو تو اہل کتاب کی خواتین سے شادی کی اجازت ہے مگر مسلمان خواتین کے لیے یہ فعل حرام ہے اور عصر حاضر میں غیر ملکی شہریت کے حصول کے ناجائز ہونے کی اس سے بڑی کیا دلیل ہو گی۔[غیر ملکی شہریت کی مزید تفصیل سوال نمبر کے جواب میں مطالعہ فرمائیں]

کیا عقیدہ الولا والبراء ضروریات دین میں شامل ہے؟

قرآن مجید کی بعض سورتیں تو ساری کی ساری "عقیدہ الولاء والبراء" پر مشتمل ہیں مثلاً سورة التوبة؛ سورة الممتحنة، سورة المنافقون، سورة الكافرون اور سورة اللهب جبکہ بعض سورتوں کا بیشتر مضمون اس عقیدہ پر مشتمل ہے مثلاً سورة الانفال، سورة العنكبوت، سورة الفتح، سورة

محمد، سورۃ المجادلۃ، سورۃ الحشر وغیرہ۔ بعض اہل علم کے نزدیک عقیدہ توحید کے بعد قرآن مجید میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ الولاء و البراء ہی ہے۔ اسی طرح احادیث میں بھی اس عقیدہ کی مزید وضاحت کی گئی ہے؛

- ✓ حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قبول اسلام کے وقت میں نے بارگاہ رسالت ﷺ میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کوئی شرط ہو تو وہ مجھے بتا دیجئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ؛ فرض نماز پڑھو؛ فرض زکوٰۃ ادا کرو؛ **ہر مسلمان کی خیر خواہی کرو اور کافر سے بیزاری ظاہر کرو۔** [مسند احمد۔ جلد ہشتم۔ حدیث ۱۰۴۸]
- ✓ رسول اللہ ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ تم جانتے ہو ایمان کی کون سی شاخ زیادہ مضبوط ہے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی زیادہ جانتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا ؛ اللہ کی رضاوخوشنودی کے لئے آپس میں ایک دوسرے سے میل جول رکھنا اور **اللہ کی خوشنودی کے لئے کسی سے دوستی رکھنا اور اللہ کی رضاوخوشنودی کے لئے کسی سے بغض و نفرت رکھنا۔** [مشکوۃ شریف۔ جلد چہارم۔ ممنوع چیزوں یعنی ترک ملاقات انقطاع تعلق اور عیب جوئی کا بیان۔ حدیث ۹۴۲]

قرآن اور حدیث کے مندرجہ بالا دلائل سے اس عقیدہ کا ضروریات دین سے قطعی طور پر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

الولا والبراء کی علمائے حق نے کون کون سی صورتیں بیان کی ہیں؟

"الولاء و البراء" کی مندرجہ ذیل صورتیں علماء نے قرآن اور حدیث کے دلائل کے ساتھ ذکر کیں ہیں؛ جن میں سے کچھ مکروہ؛ کچھ حرام اور کچھ قطعی کفر ہیں۔ [طوالت کے سبب ہر مندرجہ ذیل صورت کی دلیل بیان نہیں کی جارہی ہے]

- عام دوستی؛ ان کو مددگار بنانا۔
- کفار سے محبت؛ یا کفار کی طرف مائل ہونا۔

- کفار کو دیانت دار کہنا؛ یا کفار کا عزت و احترام کرنا۔
- کافر کی خیر خواہی چاہنا؛ ان کی تعریف کرنا یا ان کے فضائل نشر کرنا۔
- کفار کے اعمال پر راضی ہونا اور ان کی مشابہت اختیار کرنا۔
- کفار کے سامنے سستی دکھانا؛ یا ان سے نرمی دکھانا۔
- کفار کو راز دار بنانا۔
- کتاب و سنت کو چھوڑ کر کفار کے پاس فیصلے لے جانا۔
- کافروں کی ان کے احکام میں اطاعت کرنا۔
- کافروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا خصوصاً جب وہ اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہوں۔
- کفار کے اداروں میں کام کرنا؛ یا کفار سے تعاون کرنا؛ یا ان کے ظلم پر مدد کرنا۔
- کفار کے کفر پر راضی؛ یا ان کے کفر پر شک؛ یا ان کی تکفیر نہ کرتا ہو؛ یا ان کو صحیح کہتا ہو۔

آج کل کے موجودہ جغرافیائی حالات کے باعث عقیدہ الولا والبراء میں کتنی لچک ہے؟

دینی معاملات حالات کے نہیں بلکہ مقاصد شریعت کے تابع ہوتے ہیں اور اس کے حلال و حرام وقتی نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہیں؛ اس تناظر میں اس سوال کا بہترین اور مفصل جواب علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی [سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۲۸] اور [سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۵۱] کی تفاسیر میں موجود ہے؛

✓ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ [سورۃ آل عمران ۔ ۲۸] نہ بناویں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر اور جو کوئی یہ کام کرے تو نہیں اس کو اللہ سے کوئی تعلق **مگر اس حالت میں کہ کرنا چاہو تم ان سے بچاؤ** اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنے سے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تفسیر عثمانی؛ یعنی جب حکومت و سلطنت، جاہ و عزت اور ہر قسم کے تقلبات [الٹ پھیر] و تصرفات [اختیار] کی زمام [لگام] اکیلے خداوند قدوس کے ہاتھ میں ہوئی، تو مسلمانوں کو جو صحیح معنی میں اِس پر یقین رکھتے ہیں، شایان نہیں کہ اپنے اسلامی

بھائیوں کی اخوت ودوستی پر اکتفانہ کر کہ **خواہ مخواہ دشمنان خدا کی موالات [اتحادیادوستی] ومدارات [دینی مصلحت کی خاطر کسی کے ساتھ نرمی برتنا] کی طرف قدم بڑھائیں**۔ خدااور رسول ﷺ کے دشمن ان کے دوست کبھی نہیں بن سکتے۔ جو اس خبط میں پڑے گا، سمجھ لو کہ خدا کی محبت وموالات سے اسے کچھ سروکار نہیں۔ ایک مسلمان کی سب امیدیں اور خوف صرف خدا وند ربّ العزت سے وابستہ ہونے چاہیں۔ اور اس کے اعتماد ووثوق اور محبت ومناصرت کے مستحق وہی لوگ ہیں، جو حق تعالیٰ سے اسی قسم کا تعلق رکھتے ہیں۔ ہاں، تدبیر وانتظام کے درجہ میں کفار کے ضرر عظیم سے اپنے ضروری بچاؤ کے پہلو اور حفاظت کی صورتیں معقول ومشروع طریقہ پر اختیار کرنا، ترکِ موالات کے حکم سے اسی طرح مستثنٰی ہیں، جیسے سورۃ انفال میں " و من یتولهم یومئذ دبره " سے "متحرفا لقتال او متحیزا الی فئة" کو مستثنٰی کیا گیا ہے۔ جس طرح وہاں "تحرف" اور "تحیز" کی حالت میں حقیقتہ "فرار من الزحف" نہیں ہوتا، محض صورۃً ہوتا ہے، یہاں بھی "الا ان تتقوا منهم تقة" کو حقیقتاً موالات نہیں فقط **صورت موالات** سمجھنا چاہیے۔ جس کو ہم مدارات کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یعنی مومن کے دل میں اصلی ڈر خدا کا ہونا چاہیے؛ کوئی ایسی بات نہ کرے جو اس کی ناراضی کا سبب ہو، مثلاً جماعت اسلام سے تجاوز کر کے، **بے ضرورت کفار کے ساتھ ظاہری یا باطنی موالات کرے، یا ضرورت کے وقت صورت موالات اختیار کرنے میں حدود شرع سے گذر جائے، یا محض موہوم وحقیر خطرات کو یقینی اور اہم خطرات ثابت کرنے لگے اور اسی قسم کی مستثنیات یا شرعی رخصتوں کو ہوائے نفس کی پیروی کا حیلہ بنالے۔**

- ✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۔۔۔۔۔ [سورۃ المائدہ۔ ۵۱] اے ایمان والوں **مت بناؤ یہود اور نصاریٰ کو دوست**۔۔۔۔۔

تفسیر عثمانی: "اولیاء" "ولی" کی جمع ہے۔ "ولی" دوست کو بھی کہتے ہیں، قریب کو بھی، ناصر اور مددگار کو بھی۔ غرض یہ ہے کہ "یہود ونصاری" بلکہ **تمام کفار سے** جیسا کہ [سورۃ آل عمران] میں تصریح کی گئی ہے مسلمان دوستانہ تعلقات قائم نہ کریں۔ اس موقع پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ موالات، مروت وحسن سلوک، مصالحت، رواداری اور عدل وانصاف یہ سب چیزیں الگ الگ ہیں۔ اہل اسلام اگر مصلحت سمجھیں تو ہر کافر سے **صلح اور عہد وپیمان** مشروع طریقہ پر کر سکتے ہیں " و ان جنحوا للسلم فاجنح لها و توکل علی الله — سورۃ انفال"؛ **عدل وانصاف** کا حکم، مسلم وکافر ہر فرد وبشر کے حق میں ہے۔ **مروت وحسن سلوک اور رواداری** کا برتاو ان کفار کے ساتھ ہو سکتا ہے جو جماعت اسلام کے مقابلہ میں دشمنی اور عناد کا مظاہرہ نہ کریں جیسا [سورۃ ممتحنہ] میں تصریح ہے۔ باقی **موالات** یعنی دوستانہ اعتماد اور برادرانہ

مناصرت و معاونت، تو کسی مسلمان کا حق نہیں کہ یہ تعلق کسی غیر مسلم سے قائم کرے۔ البتہ صوری موالات جو "الا ان تتقوا منھم تقٰۃ" کے تحت داخل ہو اور عام تعاون، جس کا اسلام اور مسلمانوں کی پوزیشن پر کوئی برا اثر نہ پڑے اس کی اجازت ہے۔

"مُدَاہَنَت" اور "مُدَارات" جیسی مشکل اصطلاحات سے کیا مراد ہے؟

شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "دین کی حفاظت اور ظالموں کے ظلم سے بچنے کے لیے جو نرمی کی جائے، وہ **مُدَارات** ہے اور ذاتی منفعت، طلبِ دنیا اور لوگوں سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے دین کے معاملے میں جو نرمی کی جائے، وہ **مُدَاہَنَت** ہے۔" [أشِعّةُ اللّمعات، ج:۴، ص:۱۷۴]۔

علامہ علی القاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "مُدَاہَنَت ممنوع ہے اور مُدَارات مطلوب ہے، شریعت کی رُو سے مُدَاہَنَت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص برائی کو دیکھے اور اس کو روکنے پر قادر بھی ہو، لیکن برائی کرنے والے، یا کسی اور کی جانب داری، یا کسی خوف، یا طمع کے سبب، یا دینی بے حمیّتی کی وجہ سے، اس برائی کو نہ روکے۔ مُدَارات یہ ہے کہ اپنی جان، یا مال، یا عزت کے تحفظ کی خاطر اور متوقع شر اور ضرر سے بچنے کے لیے خاموش رہے۔ الغرض کسی باطل کام میں بے دینوں کی حمایت کرنا **مُدَاہَنَت** ہے اور دین داروں کے حق کے تحفظ کی خاطر نرمی کرنا **مُدَارَات** ہے۔" [مرقاۃ المفاتیح، ج:۹، ص:۳۳۱]۔

کیا کافر ممالک میں غیر مستقل یا مستقل سکونت عقیدہ الولا والبراء کے منافی ہے؟

دورِ حاضر کا یہ وہ مسئلہ ہے جس کے متعلق علمائے حق کی آرا سے پہلے اس کی اہمیت اور سنگینی کے احساس کے لیے مندرجہ ذیل احادیث کا مطالعہ بہت ضروری ہے؛

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹا لشکر قبیلہ خثعم کی طرف بھیجا پس اُن میں سے چند لوگوں نے (جو خود تو مسلمان ہو چکے تھے مگر کافروں کے ساتھ رہتے تھے) اپنے آپ کو سجدہ کر کے بچانا چاہا، لیکن لوگوں نے ان کو آگے بڑھ کر قتل کر دیا۔ جب یہ بات جناب نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کے ورثاء کو نصف دیت دلائی (اور آدھی دیت کافروں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ساقط کر دی) اور فرمایا "**میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان رہے**"۔ لوگوں نے

پوچھا"یارسول اللہ ﷺ یہ کیوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا"اس لئے کہ اسلام اور کفر کی آگ ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتی"۔[سنن ابوداؤد۔ جلد دوم۔ جہاد کا بیان۔ حدیث ۸۸۰]

- ✓ آپ ﷺ نے فرمایا"**مشرکین کے ساتھ رہائش نہ رکھو** اور نہ ان کے ساتھ مجلس رکھو کیونکہ جو شخص ان کے ساتھ مقیم ہوا، یا ان کی مجلس اختیار کی، وہ انہی کی طرح ہو جائے گا"۔[جامع ترمذی۔ جلد اول۔ جہاد کا بیان۔ حدیث ۱۶۷۲]
- ✓ مراسیل ابوداؤد عن المکحول میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛"**اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو**"[تہذیب السنن لابن قیم ص ۴۳۷ ج ۳]

مندرجہ بالا احادیث کی بنیاد پر علماء نے کافر ممالک کے سفر اور رہائش کے لیے کچھ ضروری شرائط بیان کیں ہیں؛

أ. انسان کے پاس اتنا علم ہو کہ جس سے شکوک وشبہات دفع کر سکے۔

ب. اس کے پاس اتنی دین داری ہو جو اسے نفسانی خواہشات سے روک سکے۔

ت. وہاں تک سفر کی ضرورت ہو۔

اور غیر مستقل یا مستقل اقامت کے لیے ان تین شرائط کے علاوہ دو مزید بنیادی اور لازمی شرطیں بیان کی ہیں؛

ث. **شرط اول؛** قیام کرنے والا اپنی دین داری سے مطمئن ہو؛ اس طرح کہ اس کے پاس علم، ایمان اور عظیمت کی ایسی قوت ہو جس کی وجہ سے اس کو اطمینان ہو کہ وہ اپنے دین پر ثابت قدم رہ جائے گا، انحراف اور گمراہی سے بچ جائے گا، کافروں سے دشمنی اور ان سے بغض کو اپنے دل میں زندہ رکھے گا اور ان سے دوستی اور محبت کرنے سے دور رہے گا، کیونکہ ان سے دوستی اور محبت قرآن کریم کے مطابق ایمان کے منافی ہے۔

- ✓ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۔۔۔۔۔[سورة المجادلة؛ ۲۲] "جو لوگ خدا پر

اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے **دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھوگے**۔ خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں۔۔۔۔"۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" آدمی اس کے ساتھ ہوگا **جس سے محبت کرتا ہے**"[صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ ادب کا بیان۔ حدیث ۱۱۲۳]

ج. **شرط دوم؛** اسے اپنی دین داری کے اظہار پر پوری قدرت حاصل ہو؛ شعائر اسلام آزادی کے ساتھ بغیر کسی روک ٹوک کے ادا کر سکتا ہو؛ نماز؛ جماعت اور جمعہ قائم کرنے پر اس پر پابندی عائد نہ کی جاتی ہو؛ زکوۃ؛ روزہ؛ حج؛ پردہ وغیرہ جیسے اسلامی شعائر سے اسے روکا نہ جاتا ہو؛ شخصی قوانین کے اطلاق پر کوئی پابندی نہ ہو مثلاً وراثت؛ نکاح؛ طلاق و نان نفقہ وغیرہ۔ اگر قیام کرنے والا یہ ساری چیزیں نہ کر پاتا ہو تو اقامت جائز نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم کے مطابق اب ہجرت واجب ہے۔

- ✓ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا [سورۃ النساء؛ ۹۷] "اور جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں جب فرشتے اُن کی جان قبض کرنے لگتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے وہ کہتے ہیں کہ **ہم ملک میں عاجز و ناتواں تھے** فرشتے کہتے ہیں کیا خدا کا ملک فراغ نہیں تھا کہ تم اس میں **ہجرت کر جاتے** ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے"۔

کسی مومن کی طبیعت کیسے گوارا کرے گی کہ وہ کسی کافر ملک میں مستقل یا غیر مستقل سکونت بغیر کسی انتہائی شدید مجبوری کے اختیار کرے، جہاں "شعائرِ کفر" علی الاعلان ادا کیے جاتے ہوں۔ جہاں تک مستقل سکونت کا مسئلہ ہے، اس کا تعلق عقیدہ الولا والبراء سے زیادہ عقیدہ توحید کے ارکان کا انکار اور طاغوت کے اثبات سے ہے؛ یعنی کفر سے ہے۔ کیونکہ دور جدید میں کسی بھی ملک کی شہریت کا حصول اس ملک کی وفا داری کے حلف ساتھ مشروط ہے؛ اور چند مشہور کافر ممالک کے حلفوں کی عبارات میں سے اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں؛

امریکی شہریت کا حلف؛

- [عقیدہ توحید کی کُلی نفی]that I **absolutely and entirely renounce and abjure** [بالکل اور مکمل طور پر ترک کر کے اور دستبردار] all **allegiance and fidelity** [اطاعت اور وفا] to any foreign prince, potentate, state, or **sovereignty**[خود مختار قوت]_ of whom or which I have heretofore been a subject or citizen;
- [طاغوت کی سرپرستی کا اِقرار؛عقیدہ توحید کے ارکان "قبول، اطاعت، صدق اور اخلاص" کارڈ]that I will support [تھامنا] and defend [حفاظت کرنا] the constitution and laws of the United States of America.

کنیڈین شہریت کا حلف؛

- [عقیدہ توحید کے ارکان "قبول، اطاعت، صدق اور اخلاص" کارڈ]*that I will be faithful and **bear true allegiance** [دل کی گہرائی سے حقیقی وفاداری واطاعت] to her Majesty Queen Elizabeth the second Queen of Canada her heirs and successors.*
- [طاغوت کی سرپرستی کا اِقرار؛عقیدہ توحید کے ارکان "قبول، اطاعت، صدق اور اخلاص" کارڈ]*I will **faithfully observe** [وفاداری کے ساتھ تسلیم کرنا] the laws of Canada.*

برطانوی شہریت کا حلف؛

Oath:

- [عقیدہ توحید کے ارکان "قبول، اطاعت، صدق اور اخلاص" کارڈ]*that I will be faithful and **bear true allegiance** [دل کی گہرائی سے حقیقی وفاداری واطاعت] to her Majesty Queen Elizabeth the second Queen of Canada her heirs and successors.*

Pledge:

- [عقیدہ توحید کے رکن "اخلاص" کارڈ]I will give my **loyalty** *[وفاداری]*to the United Kingdom.
- [طاغوت کی سرپرستی کا اِقرار؛عقیدہ توحید کے ارکان "قبول، اطاعت، صدق اور اخلاص" کارڈ]*I will **observe** [تسلیم کرنا] its laws faithfully [ایمانداری سے].*

آسٹریلین شہریت کا حلف؛

You can choose between two versions of the Pledge, one that mentions God and one that does not.

- [عقیدہ توحید کے رکن "اخلاص" کا رد]I **pledge** [حتمی وعدہ]my **loyalty** [وفاداری] to Australia.
- [طاغوت کی سرپرستی کا اِقرار؛ عقیدہ توحید کے ارکان "قبول، اطاعت، صدق اور اخلاص" کا رد]Whose laws I will **uphold** [برقرار رکھنا] and **obey** [حکم ماننا].

کیا قرآن کریم، دل میں ایمان ہوتے ہوئے کفریہ کلمات کی ادائیگی کی، اجازت نہیں دیتا ہے؟

✓ مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ [سورة النحل؛ ١٠٦] "جو شخص ایمان لانے کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے وہ نہیں **جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے** اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ بلکہ وہ جو (دل سے اور) دل کھول کر کفر کرے۔ تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے۔ اور ان کو بڑا سخت عذاب ہوگا"۔

قرآن پاک میں کفریہ کلمات کی زبان سے ادائیگی کی رخصت مندرجہ بالا آیت کی روشنی میں موجود تو ہے مگر اس آیت کا سببِ نزول حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ہیں؛ جنہوں نے کفار کے ہاتھوں اپنے والدین کی شہادت کے بعد، بے تحاشا جسمانی تشدد کے نتیجے میں زبردستی، کسی دنیاوی فائدہ کے حصول کے نظریہ کے بغیر، زبان سے کفریہ کلمات کو ادا کیا؛ تو دلیل کی بنیاد پر تو صرف اس شخص کو مندرجہ بالا حلفوں کی عبارات کی زبان سے ادائیگی کی رخصت ہے جو حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی مانند جبر و اکراہ کے موانع کفر کے ماتحت ہو۔ ثانیاً اوپر والی آیت کے اطلاق کے حدود و قعود کو اللہ سبحان و تعالیٰ نے اس کی اگلی ہی آیت میں خود بیان فرمادیا ہے، جس کی روشنی میں ہر مسلمان اس سوال کا جواب خود اخذ کر سکتا ہے؛

✓ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ ٱسْتَحَبُّوا۟ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا عَلَى ٱلْءَاخِرَةِ وَأَنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْكَٰفِرِينَ [سورة النحل؛ ١٠٧] "یہ اس لئے کہ انہوں نے **دنیا کی زندگی** کو آخرت کے مقابلے میں عزیز رکھا۔ اور اس لئے خدا کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا"

اب ہر قاری دل پر ہاتھ رکھ نیک نیتی سے اپنے نفس سے پوچھے کہ کیا ہمارے مسلمان بہن اور بھائی؛ شہریت کے حلف کی صورت میں کفریہ کلمات، آخرت بچانے کی نیت سے ادا کرتے ہیں یا دنیا کمانے کی نیت سے ؟؟؟

مزید بر آں مندرجہ ذیل حدیث بھی اہل دل والوں کے لیے، اس مسئلہ کی سنگینی کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے؛

- ✓ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب کرے اور وہ اِس بات کو جانتا بھی ہو تو وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتا ہے اور **جو شخص کسی ایسی قوم میں سے ہونے کا دعویٰ کرے جس میں اس کا کوئی قرابت دار نہ ہو** تو اس کا ٹھکانہ جہنم میں ہے" [صحیح بخاری۔ جلد دوم۔ انبیاء علیہم السلام کا بیان۔ حدیث ۷۶۴]

اس فعل کے مرتکب افراد کی اکثریت کا موقف اس سلسلے میں ہم آہنگ ہے کہ "ہم نے دل سے یہ حلف تو ادا نہیں کیا ہے"؛ ان تمام افراد سے میرا مودبانہ سوال ہے کہ "کیا آپ نے دل سے کلمہ توحید یعنی "لا الہ الا اللہ" ادا کیا ہے ؟؟؟" کیونکہ جس نے دل سے اس کلمہ توحید کو ادا کیا ہو، اس کی زبان، کسی بھی نوعیت کے دنیاوی نفع کے حصول کی طمع میں، اس کی نفی کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

سورۃ التوبہ آیت نمبر ۲۹ کی عملی شکل
بمطابق اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم
بحوالہ تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

ارشاد الٰہی ہے [حتی یعطوا الجزیہ] یعنی اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو جزیہ دیں، [عن ید "اپنے ہاتھ سے"] یعنی مقہور اور مغلوب ہو کر، [وھم صاغرون] یعنی ذلیل وخوار اور رسوا ہو کر۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ذمہ کی عزت کرنا جائز نہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ انہیں مسلمانوں پر کوئی فوقیت دی جائے، بلکہ وہ تو ذلیل و حقیر اور بد بخت ہیں؛ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل نہ کرو اور جب رستے میں ان میں سے کسی سے ملاقات ہو، تو اسے تنگ حصے کی

طرف مجبور کردو"۔ یہی وجہ ہے، کہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے توہین و تذلیل کی تمام معروف شرطیں ان پر عائد کردی تھیں۔ آئمہ حفاظ نے عبد الرحمان بن غنم اشعری کی روایت کو بیان کیا ہے، کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے عیسائیوں سے مصالحت کی، تو میں نے یہ دستاویز لکھی تھی؛

بسم الله الرحمان الرحيم

"یہ امیر المومنین، اللہ کے بندے عمر رضی اللہ عنہ کے لیے "فلاں فلاں شہر" کے نصاریٰ کی طرف سے معاہدہ ہے، کہ جب تم ہمارے پاس آئے، تو ہم نے تم سے، اپنی جانوں، اولادوں، مالوں اور اہل ملت کے لیے امن طلب کیا اور تم سے یہ شرط طے کی، کہ ہم اپنے شہر اور اس کے گردوپیش میں کوئی گرجا، کنیسہ، نہ کسی راہب کی خانقاہ بنائیں گے، نہ کسی خراب گرجاوغیرہ کی مرمت ہی کریں گے اور مسلمان جہاں رہائش پذیر ہیں، وہاں نئے بھی نہیں بنائیں گے اور دن ہو یا رات، ہم کسی وقت بھی اپنے کنیسوں میں داخل ہونے والے کسی مسلمان کو منع نہیں کریں گے، مسافروں اور راہ چلتے لوگوں کے لیے، ان کے دروازوں کو کھلا رکھیں گے، جو مسلمان ہمارے پاس آئے گا، ہم تین دن تک اس کی مہمان نوازی کریں گے، ہم اپنے گرجوں گھروں میں کسی جاسوس کو جگہ نہیں دیں گے، مسلمانوں سے دھوکے فریب کی کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔

ہم اپنی اولاد کو قرآن نہیں سکھائیں گے، شرک کا اظہار نہیں کریں گے، نہ کسی کو اس کی دعوت دیں گے، اگر ہمارے رشتہ داروں میں سے کوئی اسلام کو قبول کرنا چاہیے گا تو ہم اس کو منع نہیں کریں گے، ہم مسلمانوں کی عزت کریں گے، جب وہ بیٹھنا چاہیں گے تو اپنی مجلسوں سے ان کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے، ہم ٹوپی، عمامہ، جوتوں اور بالوں کے سٹائل وغیرہ، کسی چیز میں بھی مسلمانوں کی مشابہت اختیار نہیں کریں گے، ہم ان کی زبان نہیں بولیں گے، ہم ان کی کنیتیں نہیں رکھیں گے، زین والے گھوڑے پر سوار نہیں ہوں گے، تلوار نہیں لٹکائیں گے، کوئی بھی اسلحہ نہیں لیں گے اور نہ اسے اپنے ساتھ رکھیں گے، اپنی انگوٹھیوں پر عربی میں نقش نہیں کرائیں گے، شرابیں نہیں بیچیں گے، اپنے سروں کے اگلے بالوں کو کٹوا دیں گے، جہاں کہیں بھی ہوں گے صفائی کا خیال رکھیں گے، زُنّار اپنی کمروں پر ضرور لٹکائے رکھیں گے، صلیب کا نشان اپنے گرجوں پر ظاہر نہیں کریں گے، اپنی صلیبوں اور کتابوں کو مسلمانوں کے راستوں اور بازاروں میں ظاہر نہیں کریں گے، اپنے گرجوں میں ناقوس بہت آہستہ آواز میں بجائیں گے، مسلمانوں کی موجودگی میں ہم اونچی آواز سے اپنی کتابوں کو نہیں پڑھیں گے۔

ہم اپنے مذہبی شعار، مثلاً شَعَانِین اور بَاعُوت راستوں میں انجام نہیں دیں گے، ہم اپنے مُردوں پر اونچی آواز میں بین نہیں کریں گے، اور نہ ان کے ساتھ مسلمانوں کے رستوں اور بازاروں میں آگ لے کر چلیں گے۔ قبرستان میں مسلمانوں کے پڑوس میں اپنے مُردوں کو دفن نہیں کریں گے، مسلمانوں کے حصہ میں آئے ہوئے غلام ہم نہیں لیں گے، ہم مسلمانوں کی خیر خواہی تو کرتے رہیں گے لیکن ان کے گھروں میں نہیں جھانکیں گے۔"

راوی کا بیان ہے، کہ جب میں یہ معاہدہ لکھ کر حضرت عمر فاروق ؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے اس میں یہ اضافہ بھی فرما دیا؛"ہم کسی بھی مسلمان کو نہیں ماریں گے، ہم تمھاری طرف سے اپنے لیے اور اپنے اہل قبلہ وملت کے لیے ان شرائط کو قبول کر کے امان کو قبول کرتے ہیں۔ اگر ہم نے ان میں سے کسی شرط کی خلاف ورزی کی، جو ہم نے لگائی ہیں اور اپنے اوپر لاگو کی ہیں، تو پھر ہم سے آپ کا ذمہ دور ہو جائے گا اور ہم اس سزا کے مستحق ہوں گے جو عہد شکنی کرنے والے، معاندین اور اختلاف کو بڑھانے والے کو ملتی ہے۔"

لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله محمد رسول الله

اللهم صل علی سیدنا محمد و علی اٰلہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

جہاد فی سبیل اللہ کی حقیقت

اس مضمون کو طوالت کی باعث دو مضامین میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مضمون اول یعنی مضمون ہذا کا مقصد ان حضرات کو جن میں حق کی پہچان کی اہلیت ہے، دین میں جہاد فی سبیل اللہ کے اصل مقام سے روشناس کرانا ہے۔ مضمون دوم کا تعلق عمومی حلقہ جات میں جہاد کے متعلق ان عمومی اعتراضات کے متعلق ہے جن کی بدولت ہماری اکثریت اس فرض عین کو ساقط قرار دینے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہے۔

جہاد کی فرضیت اور افضلیت کے موضوع پر قرآن اور احادیث کے دلائل سے پُر سلف و خلف کے علمائے حق [خصوصاً متقدمین میں شیخ ابن النحاس رحمہ اللہ کی کتاب "مشارع الأشواق إلى مصارع العشاق"{اردو ترجمہ "فضائل جہاد"۔ مترجم؛ مولانا مسعود اظہر حفظہ اللہ}اور عصر حاضر میں مولانا مسعود اظہر حفظہ اللہ کی تفسیر آیات جہاد "فتح الجواد"] نے اتنی تفصیل اپنی کتابوں میں جمع کر دی ہیں کہ اہل تحقیق کی تشفی کے لیے کافی ہے۔

کیا اسلام میں جہاد فی سبیل اللہ کوئی ظاہری عمل ہے یا تقوٰی یا تزکیہ نفس وغیرہ کی طرح ایک باطنی امر؟

اسلامی شریعت نے "صلاۃ"؛"صیام"؛"زکوۃ"اور"حج"وغیرہ جیسے الفاظ، جن کا تعلق ظاہری عبادات سے ہے، ان کو نہ صرف ان کے لغوی معنوں سے منتقل کر کے شرعی معنی عطا کیے، جو اس شرعی اصطلاح کا دینی مقصد بیان کرتے ہیں، بلکہ ان مخصوص اعمال کو بھی روز روشن کی طرح بیان کیا جو ان اصطلاحات کو ایک ظاہری شکل عطا کرتے ہیں۔

[مثلاً شرعی اصطلاح میں لفظ"صلاۃ"ایک مخصوص طریقے پر اللہ تعالی کے لیے انجام دی جانے والی اس عبادت کا نام ہے، جو مخصوص و معلوم افعال اور اقوال پر مشتمل ہوتی ہے، اور اس کا آغاز تکبیر تحریمہ سے ہوتا ہے، اور اختتام سلام پھیرنے سے۔]

اسی طرح اسلامی شریعت نے "جہاد فی سبیل اللہ" جیسی ظاہری عبادت کو بھی ایک معین اصطلاحی معنی عطا کیے ہیں، جو ان ظاہری اعمال کے مجموعہ پر محیط ہے جن کا تعلق "**کفر کے مد مقابل اللہ کے دین کی سربلندی کی**

کوشش" سے ہے۔ اور یہی معنی ہمیشہ سے مسلمان معاشروں کے خواص و عوام میں عرف عام رہے ہیں، حتّٰی کہ ہر زمانہ کی طرح ہمارے زمانہ کا کافر و منافق بھی" جہاد فی سبیل اللہ" کے انہی اصطلاحی اور عُرفی معنوں کا معترف ہے۔

- ✓ حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے نبی ﷺ کی خدمت حاضر ہو کر عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ ایک آدمی غنیمت حاصل کرنے کے لئے لڑتا ہے دوسرا آدمی ناموری اور شہرت کے لئے لڑتا ہے تیسرا آدمی جو اپنی شجاعت دکھانے کے لئے لڑتا ہے ان میں سے کون ہے جو اللہ کے راستے میں لڑنے والا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **جو اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لئے لڑتا ہے وہی اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا ہے**۔ [صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ امارت اور خلافت کا بیان۔ حدیث ۴۲۲]

جہاد فی سبیل اللہ کا **کم از کم تقاضا**، ہر دینی عبادت کی طرح، قلب میں اس کی نیت اور اس کی **چوٹی** کفار کے ساتھ قتال فی سبیل اللہ کے نتیجے میں شہادت فی سبیل اللہ والی موت ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے بیچ میں ہر وہ ظاہری عمل، جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح میں شامل ہے، جو اس کی چوٹی کے حصول، یعنی شہادت فی سبیل اللہ میں مددگار ہو؛ چاہے اس کا تعلق جسم سے ہو؛ مال سے ہو یا زبان [یا قلم] سے ہو۔

- ✓ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص جہاد کے بغیر مر جائے اور اس کے **دل میں جہاد کی خواہش** بھی نہ ہو تو وہ منافقت کی حالت پر مرا"۔ [المستدرک۔ جلد ۲۔ کتاب الجہاد۔ حدیث ۲۴۱۹]
- ✓ سیدنا عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: "اے اللہ کے رسول ﷺ! اسلام کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ کہ تیرا دل اللہ تعالیٰ کے لیے مطیع ہو جائے اور دوسرے مسلمان تیری زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔" اس نے کہا: "کون سے **افضل اسلام** ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ایمان۔" اس نے کہا: "ایمان کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کہ اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، رسولوں پر اور موت کے بعد دوبارہ اٹھنے پر ایمان لائے۔" اس نے کہا: "**افضل ایمان** کون سا ہے؟۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہجرت۔" اس نے کہا: "ہجرت کیا ہے؟۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "برائی کو ترک کر دینا۔" اس نے کہا: "کون سی **افضل ہجرت** ہے؟۔" آپ ﷺ

نے فرمایا؛" جہاد۔ " اس نے کہا؛" جہاد کیا ہے ؟" آپ ﷺ نے فرمایا؛" جب کافروں سے مقابلہ ہو تو ان سے قتال کرنا۔ " اس نے کہا؛" کون سا **افضل جہاد** ہے ؟۔ " آپ ﷺ نے فرمایا؛" جس کے گھوڑے کی کونچیں کاٹ دی جائیں اور **خود اس کا خون بہا دیا** جائے۔ " پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛" پھر دو عمل ہے، وہ افضل ترین ہیں اور اِلّا یہ کہ کوئی آدمی ان ہی دو پر عمل کرے، حج مبرور یا عمرہ۔ [مسند احمد ۔ جلد ۱ ۔ ایمان اور اسلام کی کتاب ۔ حدیث ۱۷]

"**اِلّا یہ کہ کوئی آدمی ان ہی دو پر عمل کرے، حج مبرور یا عمرہ**" کے مخاطب امت کے کمزور، معذور، بچے، ضعیف اور خواتین ہیں جو مندرجہ بالا حدیث میں بیان کردہ جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی قتال فی سبیل اللہ کے شرعی طور پر مکلف نہیں ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" بوڑھے، بچے، کمزور اور عورت کا جہاد حج اور عمرہ کرنا ہے"۔ [سنن النسائی ؛ ۲۶۲۷]

- ✓ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا؛" مشرکوں کے ساتھ اپنی **جان، مال اور اپنی زبانوں** کے ذریعے جہاد کرو۔ " [المستدرک ۔ جلد ۲ ۔ کتاب الجہاد ۔ حدیث ۲۴۲۷]

مدینہ منورہ میں نازل شدہ قرآن کا تقریباً ایک تہائی حصہ جہاد فی سبیل اللہ کی عملی شکل سے متعلق، مختلف موضوعات پر مشتمل ہے۔ اور اب اگر کوئی عالم فقط مکہ مکرمہ میں نازل شدہ پانچ آیات ہی کو جہاد فی سبیل اللہ جیسی دینی اصطلاح کا اصل ماخذ قرار دے، تو اس کو علمیت نہیں بلکہ کم علمی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ؛ جہاد فی سبیل اللہ کا واحد ہدف اور مطلوب "کفر کے مد مقابل اللہ کے دین کی سربلندی کی کوشش" اور اس جہاد کے نتیجے میں ہونے والے قتال فی سبیل اللہ کا ہدف، زمین پر بسنے والا ہر کافر نہیں، بلکہ فقط کفر کی وہ طاقتیں ہیں جو اس ہدف کے حصول میں رکاوٹ ہیں۔ چاہے وہ انفرادی آئمہ کفار کی شکل میں ہوں یا ایک کفریہ نظام حکومت کی شکل میں۔ اسی رکاوٹ کو قرآن "**فتنہ**" سے تشبیہ دیتے ہوئے، کفر کی طاقتوں سے قتال کا حکم دیتا ہے۔

- ✓ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ [سورۃ البقرۃ؛۱۹۳]" اور ان سے اس وقت تک **لڑتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے** اور (ملک میں) خدا ہی کا دین ہو جائے اور اگر وہ (فساد سے) باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں (کرنی چاہیئے)"۔

✓ وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ [سورة التوبة ؛ ۱۲] "اور اگر عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین میں طعنے کرنے لگیں تو **ان کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو** (یہ بے ایمان لوگ ہیں اور) ان کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ عجب نہیں کہ (اپنی حرکات سے) باز آجائیں"۔

کیا جہاد فی سبیل اللہ بذات خود کوئی عبادت ہے یا کسی اور بڑی عبادت کے حصول کا ذریعہ؟

اگر قرآن کی ساڑھے پانچ سو [۵۵۰] سے زیادہ آیات؛ رسول اللہ ﷺ سے منقول سیکڑوں احادیث؛ رسول اللہ ﷺ کے اپنے ستائیس غزوات؛ ستر سے زیادہ تشکیل کردہ سرایہ؛ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم؛ صحابہ رضی اللہ عنہم؛ تابعین رحمۃ اللہ علیہم؛ تبع تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور سلف وخلف کے علمائے حق رحمۃ اللہ علیہم کا عمل متواتر؛ احادیث، فقہ اور سیرت کی کتابوں میں جہاد کے عنوان سے مستقل ابواب بھی اگر جہاد فی سبیل اللہ کو عبادت کا مقام نہیں دلا سکتے، تو پھر دین میں دلائل کی کثرت کی بنیاد پر نماز کے علاوہ کسی اور شعار کو عبادت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور اگر جہاد محض کسی اور بڑی عبادت کے حصول کا ذریعہ ہوتا، تو اسی قرین کے مطابق قرآن واحادیث وضو کی فضلیت اور مسائل سے تو بھرے ہوئے ہوتے مگر جس مقصد کے حصول کے لیے وضو فرض ہے یعنی "نماز" اس کا ذکر شاذونادر ہوتا۔

دین میں تمام عبادات کا ہدف ومقصود انفرادی، باہمی یا اجتماعی سطح پر اللہ سبحان وتعالٰی کی کبریائی کا بیان اور اس کے دین کی سربلندی ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ اسی سربلندی کے حصول کی عملی کوشش۔ جہاد فی سبیل اللہ کا شمار بھی چونکہ عبادات میں ہوتا ہے، اسی لیے دین اسلام میں دیگر عبادات کی قبولیت کی شرائط کی طرح، اس عبادت کے لیے بھی **باطن میں نیت کا اخلاص اور ظاہر میں اس عبادت کا قرآن وسنت کے تابع ہونا** لازم ہے نا کہ اپنی اپنی انفرادی دینی یا دنیاوی جد وجہد کو جہاد قرار دینا۔

کیا جہاد فی سبیل اللہ فرض ہے؛ واجب ہے؛ سنت ہے یا نفل عبادت ہے؟

✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ [سورة البقرة؛۱۸۳] "مومنو! **تم پر روزے فرض** کئے گئے ہیں۔ جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم پرہیز گار بنو۔"

✓ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ [سورة البقرة:۲۱۶]

"[مسلمانوں] **تم پر** [خدا کے رستے میں] **لڑنا فرض** کر دیا گیا ہے وہ تمہیں ناگوار تو ہو گا مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے مضر ہو۔ اور [ان باتوں کو] خدا ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

قرآن میں جس "**کُتِبَ**" کے صیغے نے "روزہ" ہم پر فرض کیا، اسی صیغے نے ہماری ناپسندیدگی کے باوجود ہم پر "لڑنا" یعنی قتال فی سبیل اللہ کو بھی فرض کیا۔ دین کا واضح اصول ہے، جو عمل فرض کی ادائیگی کے لازم ہو وہ بھی فرض کے درجہ میں ہوتا ہے، مثلاً نماز کے لیے پاکی لازم ہے تو اس پاکی کے حصول کے لیے وضو یا غسل بھی فرض قرار پائے گا۔ اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی "قتال فی سبیل اللہ" کو فرض قرار دے کر ہر اس عمل کو فرض کے درجہ میں قرار دے دیا، جو اس چوٹی کے حصول کے لیے لازم ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ نماز، روزہ، زکوۃ یا حج انفرادی سطح پر فرض عین ہے، جبکہ جہاد فی سبیل اللہ [بمعنی قتال فی سبیل اللہ] اجتماعی یعنی ریاست کی سطح پر تبلیغ دین کی نیت سے تو فرض عین ہے، مگر انفرادی سطح پر حالات کی مناسبت سے کبھی فرض عین [دفاعی جہاد] اور کبھی فرض کفایہ [اقدامی جہاد] ہوتا ہے۔

کیا جہاد فی سبیل اللہ کا تعلق ضروریات دین سے ہے؟

نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کی طرح جہاد فی سبیل اللہ کا شمار بھی ضروریات دین میں ہوتا ہے؛ تو چنانچہ علمائے سلف و خلف کے مطابق، ضروریات دین ہونے کے بنا پر، اس کی فرضیت کا علم اور اقرار لازم اور اس کی فرضیت سے لاعلمی یا انکار کفر ہے اور اس کو بلا عذر عملی طور پر ترک کرنے والا فاسق و فاجر ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے مطابق تزکیہ نفس یا ذکر اللہ جہاد سے افضل نہیں ہیں؟

اول ذکر؛ دین میں جن اعمال کا فرض یا واجب ہونا ثابت ہو، ان میں افضلیت کی بحث انتہائی عجیب لگتی ہے۔ مثلاً نماز فرض ہے اور روزہ بھی؛ اب اگر کوئی عالم نماز کی روزہ پر یا روزہ کی نماز پر افضلیت ثابت کرنے لگے تو

یہ ایک عبس کام ہے۔ اسی مناسبت سے، اگر غیر فرض اعمال کو فرض اعمال پر افضلیت دی جائے تو یہ اوپر بیان کی گئی بات سے بھی زیادہ عبس اور قابل ردّ ہے۔

کیا تزکیہ نفس اور ذکر اللہ کی کوئی شکل نماز، روزہ، حج یا جہاد کے علاوہ بھی دین میں فرض کی صورت میں رائج ہے؟

- ✓ إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي [سورة طه ؛ ۱۴] "بے شک میں ہی خدا ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری عبادت کرو اور **میری یاد کے لئے نماز** پڑھا کرو۔"
- ✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ [سورة البقرة ؛ ۱۸۳] "مومنو! تم پر **روزے** فرض کئے گئے ہیں۔ جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے **تاکہ تم پرہیزگار بنو۔**"
- ✓ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ ۔۔۔۔۔ [سورة البقرة ؛ ۲۰۳] "اور [**قیام منیٰ** کے] دنوں میں [جو] گنتی کے [دن میں] **خدا کو یاد کرو**۔۔۔۔۔"
- ✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ [سورة الانفال ؛ ۴۵] "مومنو! جب [کفار کی] کسی جماعت سے تمہارا **مقابلہ** ہو تو ثابت قدم رہو اور **خدا کو بہت یاد کرو** تاکہ مراد حاصل کرو۔"

دل پر ہاتھ رکھ کر، تنہائی میں ہر مسلمان سوچے، کہ ایک فاسق اور فاجر مسلمان کے لیے بھی، تزکیہ نفس اور ذکر اللہ میں اخلاص کے حصول کے لیے، مندرجہ بالا کون سی عبادت اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اب اگر کوئی عالم، جہاد؛ قتال اور شہادت فی سبیل اللہ کے فضائل اور افضلیت کی سیکڑوں احادیث کے مدمقابل فقط ان چند احادیث کو تاویل باطلہ سے اس طرح پیش کرے کہ جس سے عام مسلمان تزکیہ نفس یا ذکر اللہ کو جہاد اور قتال جیسے فرض کو ساقط قرار دینے کا سبب قرار دے سکے، تو یہ علمیت نہیں بلکہ فتنہ پروری ہے۔ کیونکہ اگر کوئی مسلمان جہاد فی سبیل اللہ میں اللہ کی محبوب ترین ہستی ﷺ کے دندان مبارک کی شہادت؛ رخسار مبارک کے زخم؛ عزیز ترین چچا، منہ بولے بیٹے اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادتوں کو "جہاد اصغر"

اور اپنے زعم میں اپنے گھر یا مسجد کے آرام میں بیٹھ کر، خود ساختہ تزکیہ نفس اور ذکر اللہ کو "جہاد اکبر" سمجھتا ہے، تو اس کو فوراً اپنے ایمان کی تجدید کر لینی چاہیے۔ مزید بر آں جن احادیث میں ذکر کی افضلیت کا بیان موجود ہے؛ اس ذکر کے متعلق امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ، جو تصوف کے میدان میں ایک امام کی حیثیت رکھتے ہیں، اپنی کتاب [اکسیر ہدایت اردو ترجمہ کیمیائے سعادت] میں فرماتے ہیں؛

"ذکر سب عبادتوں کا خلاصہ ہے اور **ذکر حقیقی** یہ ہے کہ اوامر و نواہی پیش آنے کے وقت خدا کو یاد کرے اور گناہ سے ہاتھ کھینچے، حکم الٰہی بجالائے۔ اگر ذکر اسے اس بات پر نہ لائے، تو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ذکر سُخن نفس اور بے حقیقت تھا۔"

یقیناً اس "ذکر حقیقی" میں مصروف مسلمان، اللہ کے قائم کردہ فرائض بشمول جہاد فی سبیل اللہ کی مخالفت نہیں، بلکہ حمایتی اور مبلغ کے طور پر معاشرہ میں نظر آئے گا۔

کیا رسول اللہ ﷺ کے تمام جہاد دفاعی نہیں تھے؟

لغوی، اصطلاحی یا عُرفی معنی میں دفاعی جنگ کی تعریف کسی علاقہ پر دشمن کے حملے کی صورت میں مدافعت [دفع کرنا، دفعیہ، دفاع، روک، بچاؤ، مزاحمت] ہے اور اقدامی جنگ کی تعریف اپنے علاقہ سے نکل کر دشمن کے علاقے پر حملہ کرنا ہے؛ تو رسول اللہ ﷺ کے ستائیس غزوات اور ستر کے قریب تشکیل کردہ سرایوں کے انتہائی سرسری مطالعہ سے ہی اس دعوی کی کمزوری ثابت ہو جاتی ہے۔

کیا جہاد فی سبیل اللہ صرف ریاست قرار نہیں دے سکتی ہے؟

✓ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ [سورة التوبه؛ ۲۹] جو اہل کتاب میں سے خدا پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر [یقین رکھتے ہیں] اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو خدا اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں **ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔**

تبلیغ دین کی نیت سے اقدامی جہاد کی فرضیت کے بعد، اسلام کے اولین دور میں رسول اللہ ﷺ اور خلیفہ اول سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اقدامی جہاد کے لیے افرادی قوت کی ضرورت کو مسلمان معاشرہ میں منادی کے ذریعے پوری فرمایا کرتے تھے۔ اسلام میں فوج کا ادارہ خلیفہ دوم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مرہون منت ہے، جس کا بنیادی مقصد اقدامی جہاد [بمعنی قتال] جو ریاست پر فرض عین تھا [اور ہے]، اس کی مسلسل ادائیگی ہو سکے اور امت کے کندھوں سے اس فرض کفایہ کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے۔ یقیناً اس صورت میں اقدامی جہاد چونکہ ریاست ہی کی ذمہ داری ہے تو اس کا حق بھی ہے کہ وہ کفار کے جس تابع علاقہ پر چاہے اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا مقام قرار دے۔

اقدامی جہاد کے بالمقابل قرآن و حدیث کے نقلی دلائل اور اجماع امت سے ثابت ہے، کہ کافر اگر کسی بھی مسلمان علاقہ پر حملہ کر دے، تو اس علاقہ کے لڑائی کے اہل مسلمانوں پر اجتماعی طور پر دفاعی جہاد [بمعنی قتال] فرض عین ہو جاتا ہے اور اگر ان میں سے کوئی انفرادی طور پر راہ فرار اختیار کرتا ہے تو مندرجہ ذیل آیت کے مطابق گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے؛

- ✓ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ [سورۃ الانفال؛۱۶] "اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا کہ لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے [یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے] یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے۔ **ان سے پیٹھ پھیرے گا تو [سمجھو کہ] وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا** اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔"

اگر اس مسلمان علاقہ کے لوگوں کی افرادی قوت، کفار سے مقابلہ کے لیے ناکافی ہو، تو اس فرض کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے مشرق و مغرب؛ شمال و جنوب کے تمام علاقوں میں رہنے والے تمام مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، جب تک کہ کافر کو شکست نہ ہو جائے اور مسلمان علاقہ اس کے تسلط سے آزاد نہ ہو جائے۔ چونکہ دفاعی جہاد انفرادی سطح پر فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے تو اس میں شرکت کے لیے ریاست تو کُجا والدین کی اجازت کی بھی ضروری نہیں ہے برخلاف اقدامی جہاد کے جس کے فرض کفایہ ہونے کے سبب

والدین کا حق مقدم ہے۔[اس صورت میں بھی جہاد سے رخصت کے لیے امیر جہاد کی اجازت لازم ہے؛جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے]

عصر حاضر میں مسلمان ممالک کی افواج کا مقصد نہ تو اقدامی جہاد ہے اور نہ ہی دفاعی جہاد، بلکہ مسلمان ممالک میں اس ادارہ کا بنیادی مقصد، فقط قومیت کی بنیاد پر قائم اپنے اپنے ملک کی جغرافیائی اور خود ساختہ نظریاتی سرحدوں کا دفاع ہے۔اسی غیر اسلامی مقصد کے سبب، پوری امت اقدامی جہاد جیسے فرض کفایہ کے ساقط ہونے کی وجہ سے بحیثیت مجموعی اللہ کے دربار میں گناہ گار ہے۔مزید براں فلسطین؛سوڈان؛صومالیہ؛کشمیر؛ افغانستان؛ہندوستان؛اسپین؛وسط ایشیا وغیرہ جیسے مسلمان علاقوں پر کفار کے تسلط کے سبب نہ صرف مسلمان ممالک کی افواج بلکہ ہر وہ مسلمان جو دفاعی جہاد سے غافل ہے، وہ اسی طرح فرض عین سے غفلت کا مرتکب ہورہا ہے جیسے کہ کوئی تارک نماز یا تارک روزہ یا تارک حج۔

کیا عصر حاضر میں بین الاقوامی معاہدوں کی پاسداری اقدامی یا دفاعی جہاد سے زیادہ ضروری نہیں ہیں؟

اقوام متحدہ کی رکنیت، جہاں فیصلے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بجائے "ویٹو" یعنی طاغوت کی سرپرستی کے اقرار کی صورت میں، کفار کے پاس موجود ہو، تو اس کی شرعی حیثیت کے متعلق تو علمائے حق ہی بیان فرما سکتے ہیں اور مزید اس ادارہ کے فیصلوں کی پاسداری کی بنیاد پر اقدامی جہاد کے فریضہ کو ترک کرنے کی شرعی حیثیت کا بیان بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ مگر جہاں تک سوال دفاعی جہاد کا ہے، تو قرآن، احادیث اور سیرت رسول ﷺ اس مسئلہ پر روز روشن کی طرح واضح ہیں کہ کفار کی طرف سے مسلمانوں کو کسی بھی قسم کے جانی ومالی نقصان کی کوشش کی صورت میں ہر قسم کا معاہدہ کالعدم ہو جاتا ہے۔ حتّٰی کہ یہ اصول کفار پر بھی اتنا واضح تھا کہ مدینہ منورہ میں موجود یہود کے قبائل نے جانی ومالی سزاؤں اور شہر سے بے دخلی کے حکم کے وقت بھی میثاق مدینہ کو مسلمانوں پر امن کی حجت کے طور پر پیش نہیں کیا اور نہ ہی مشرکین مکہ نے صلح حدیبیہ کے معاہدہ کو فتح مکہ کے وقت رسول اللہ ﷺ پر پیش کیا۔

کیا کفار کے برابر فوجی، اقتصادی اور معاشی ترقی کے حصول کے بغیر ان کے ساتھ جہاد بیوقوفی نہیں ہے؟

- ✓ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ۔۔۔۔۔ [سورۃ الانفال؛ ۶۰] "اور **جہاں تک ہوسکے** [فوج کی جمعیت کے] زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے [مقابلے کے] لیے مستعد رہو۔۔۔۔۔"

مندرجہ بالا آیت فقط مسلمان کو اپنی استطاعت کے مطابق تیاری کا حکم دے رہی ہے نہ کہ کفار کی ظاہری طاقت کے برابر؛ کیونکہ فتح وشکست کا اصل اور واحد سبب، اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت میں خود ہی بیان کیا ہے؛

- ✓ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ [سورۃ آل عمران؛ ۱۶۰] "اور **خدا تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا**۔ اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ہے کہ تمہاری مدد کرے اور مومنوں کو چاہیئے کہ خدا ہی پر بھروسا رکھیں"۔

مزید براں جس دین میں کامیابی کا اصل معیار دنیاوی نہیں بلکہ اخروی ہو اور جہاں ایک کانٹا چبھنے کے برابر کی تکلیف بھی آخرت میں ایک مسلمان کے لیے آسانی کا باعث بنے گی؛

- ✓ حضرت عائشہ ؓ زوجہ نبی ﷺ کہتی ہیں کہ آپ ﷺ نے بیان کیا کہ کوئی مصیبت بھی مسلمان کو نہیں پہنچتی، مگر اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، یہاں تک کہ کانٹا بھی جو اس کے جسم میں چبھے۔ [صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ بیماریوں کا بیان۔ حدیث ۶۱۸]

تو وہیں مندرجہ ذیل حدیث کفار اور ان کے اتحادیوں کی مایوسی میں مزید اضافہ کا باعث ہے۔

- ✓ حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس غزوہ یا لشکر کے لوگ جہاد کریں پھر وہ مال غنیمت حاصل کر کے سلامتی سے واپس آجائیں تو انہیں ثواب کا دو تہائی حصہ اسی وقت مل جاتا ہے اور جس غزوہ یا لشکر کے لوگ **خالی واپس آئیں اور نقصان اٹھائیں** تو ان کا اجر وثواب پورا پورا باقی رہ جاتا ہے۔ [صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ امارت اور خلافت کا بیان۔ حدیث ۴۲۹]

کیا مسلمان ممالک میں حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد جائز ہے؟

- ✓ حضرت جابر ؓ سے مروی ہے کہ "۔۔۔۔۔ حضرت عمر ؓ نے یہ بات سن لی وہ نبی ﷺ کے پاس آکر کہنے لگے کہ یارسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اڑادوں نبی ﷺ نے فرمایا عمر ؓ رہنے دو کہیں لوگ یہ باتیں نہ کرنے لگیں کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کروادیتے ہیں۔" [مسند احمد۔ جلد ششم۔ حدیث ۱۰۹۳]

اگرچہ قرآن میں منافقین سے قتال کی اجازت [سورۃ التوبۃ آیت ۵۲] اور [سورۃ الاحزاب آیت ۶۰ — ۶۲] کی روشنی میں موجود ہے مگر مسلمان ممالک کی حکومتوں کو اعتقادی منافق یا مرتد قرار دے کے ان کے خلاف مسلح جدوجہد میری ذاتی رائے کے مطابق ناجائز اور غیر مفید ہے اور اس آرا کی بنیاد سیرت رسول ﷺ اور مندرجہ بالا حدیث ہے جو دو حکمتوں کی مظہر ہے؛ اول ذکر، اس عمل سے عام عوام، جن کو حقائق تک رسائی نہیں ہوتی، وہ معاملات کی ظاہری شکل کی بنیاد پر اسلامی احکامات سے بدظن ہو جاتے ہیں اور مجاہدین اسلام کو جہاد فی سبیل اللہ کے راستے میں جو اخلاقی حمایت درکار ہوتی ہے، وہ اس سے محروم ہو جاتے ہیں۔ دوم ایسا عمل، ظاہری طور پر ایک رَدّ عمل کی طور پر نظر آنے کی وجہ سے فی سبیل اللہ سے بعید اور فی سبیل نفسہٖ سے قریب معلوم ہوتا ہے۔ مزید براں قرآن کے فتوی کے مطابق کفار ہر اس شخص کا دشمن ہے جس پر فقط مسلمان ہونے کا ٹھپا ہو [وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ [سورۃ البقرۃ؛۱۲۰] "اور تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی، یہاں تک کہ تم ان کے مذہب کی پیروی اختیار کرلو۔"] تو مسلمان معاشروں میں قتل وغارت، اس کے مقاصد کے حصول کے لیے انتہائی فائدہ مند ہے اور ایسی صورت میں مجاہدین اسلام اپنے ہی دشمنوں کے مددگار نظر آئیں گے۔

[اس تجزیہ سے میری مراد قطعی یہ نہیں ہے کہ میں کسی بھی دہشت گردانہ کاروائی کے پیچھے مجاہدین اسلام کا ہاتھ سمجھتا ہوں بلکہ میری مراد یہ ہے کہ اگر کوئی اس طرح کی کاروائی کی جائے تو اس سے جہاد فی سبیل اللہ کے مقصد کو فائدہ نہیں بلکہ فقط نقصان پہنچتا ہے، کیونکہ اگر اس میں کسی فائدہ کی امید ہوتی تو رسول اللہ ﷺ جن کے نزدیک اعتقادی منافقین کا کفر وحی کی بنیاد پر قطعی تھا اور سربراہ مملکت کی حیثیت میں وہ ہر قسم کی سزا پر عملدرامد کرانے پر قادر بھی تھے، وہ اس عمل سے اجتناب نہ کرتے، جبکہ آج ان دونوں عناصر کی موجودگی کا دعویٰ مجاہدین اسلام نہیں کرسکتے]

جہاد فی سبیل اللہ کے خلاف بند شیں اور مجاہدین فی سبیل اللہ کے خلاف اسلامی ممالک میں گرفتاریوں اور سزاؤں کی صورت میں سخت کریک ڈاؤن، ایک پُر فِتن دور کی نشاندہی کرتا ہے اور اس طرح کے کسی بھی فتنہ کے دور میں ایک مجاہد کو اللہ سے عافیت طلب کرتے ہوئے، اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف رہنا چاہیے اور اگر بالفرض، اللہ کو آزمائش مطلوب ہے، تو ہر اس مجاہد کے لیے، جو اپنے اعمال کے اجر کا فقط اللہ سبحان و تعالیٰ سے امیدوار ہے، رسول اللہ ﷺ کی مندرجہ ذیل حدیث مشعل راہ ہے۔

- ✓ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے قریب فتنے ہوں گے سیاہ تاریک شب کے حصوں کے مانند، ان فتنوں میں مرد صبح ایمان کی حالت میں کرے گا، تو شام کفر کی حالت میں اور کوئی شام ایمان کی حالت میں کرے گا، تو صبح کفر کی حالت میں۔ ان فتنوں میں بیٹھنے والا، کھڑے ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا، چلنے والے سے اور چلنے والا، دوڑنے والے سے بہتر ہو گا۔ [اس وقت] اپنی کمانیں توڑ دینا اور کمانوں کے چلے کاٹ دینا، اپنی تلواریں پتھروں پر مار کر کند کر لینا۔ اگر تم میں سے کسی کے پاس کوئی گھس آئے اور [مارنے لگے] تو وہ **سیدنا آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں [ہابیل اور قابیل] میں سے بہتر کی طرح ہو جائے**۔ [سنن ابن ماجہ۔ جلد سوم۔ فتنوں کا بیان۔ حدیث ۸۴۱]

اس حدیث میں "[اس وقت] اپنی کمانیں توڑ دینا اور کمانوں کے چلے کاٹ دینا، اپنی تلواریں پتھروں پر مار کر کند کر لینا" سے مراد کفار سے جہاد فی سبیل اللہ [بمعنی قتال فی سبیل اللہ] کو روکنا نہیں ہے، کیونکہ کفار سے جہاد فی سبیل اللہ [بمعنی قتال فی سبیل اللہ] تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول یا قیامت تک جاری رہنے کی بشارت خود متعدد صحیح احادیث میں موجود ہے جیسا کہ اس سے اگلے سوال کے جواب میں مذکور ہے۔ بلکہ اس حدیث میں تو مسلمانوں کی باہم ظلم و زیادتیوں کا ذکر ہے؛ جس کی سنگینی مندرجہ ذیل حدیث سے واضح ہے۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب **دو مسلمان باہم** ایک دوسرے سے اپنی تلواروں سے لڑائی جنگ کریں گے تو **قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے**"، میں [ابو بکرہ رضی اللہ عنہ] نے عرض کیا، یا آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ "یہ تو قاتل ہے، مگر مقتول کا کیا قصور ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "کیونکہ اس نے بھی اپنے ساتھی کے قتل کا ارادہ کیا تھا"۔ [صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ فتنوں کا بیان ۔ حدیث ۲۷۵۱]

کیا آج تمام جہادی تنظیمیں باطل کی علم بردار اور فساد فی الارض کا باعث ہیں؟

- ✓ حضرت عمران بن حصین ؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا "میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ **حق پر قائم** رہے گا اور اپنے مخالفین پر غالب رہے گا، یہاں تک کہ ان کا آخری حصہ دجال سے **قتال کرے گا**"۔ [مسند احمد۔ جلد نہم۔ حدیث ۱۴۷]
- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے گا جو **حق کی خاطر** لڑتا رہے گا۔ یہاں تک کہ آخر میں ایک گروہ دجال سے **قتال کرے گا**"۔ [سنن ابوداؤد۔ جلد دوم۔ جہاد کا بیان۔ حدیث ۷۱۹]
- ✓ حضرت انس بن مالک ؓ روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تین باتیں ایمان کی جڑ اور بنیاد ہیں، اول یہ کہ جو شخص لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا قائل ہو، اپنے ہاتھ اور زبان کو ان سے بچانا، کسی کو گناہ کی بناء پر اس کی تکفیر نہ کرنا یعنی کسی عمل کی بناء پر اس کو دائرہ اسلام سے خارج نہ سمجھنا، دوسرے جہاد جاری ہے میری بعثت کے وقت سے جہاں تک کہ میری امت کا آخری شخص **قتال کرے گا** دجال سے اور [یاد رکھو] جہاد کو کوئی چیز **باطل نہیں کر سکتی** نہ ظالم کا ظلم اور نہ عادل کا عدل، تیسرے تقدیر پر ایمان رکھنا۔ [سنن ابوداؤد۔ جلد دوم۔ جہاد کا بیان۔ حدیث ۷۶۷]
- ✓ حضرت جابر بن عبد اللہ ؓ سے سنا وہ فرماتے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ **حق کی خاطر لڑتا رہے گا** اور قیامت تک غالب رہے گا۔۔۔۔۔" [صحیح المسلم۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۳۹۵]

مندرجہ بالا احادیث کے مطالعے سے دو باتیں قطعی علم کے ذریعے یقین کے درجے کو پہنچتی ہیں؛ **اول** یہ کہ چاہے انفرادی سطح ہو؛ سول سوسائٹی کی سطح ہو یا حکومتی ایوان اور اس کے ذیلی اداروں کی سطح ہو؛ تمام تر ناپسندیدگی اور پابندیوں کے باوجود دین میں "جہاد فی سبیل اللہ" بمعنی [قتال فی سبیل اللہ] کم از کم دجال کے خاتمے تک تو ضرور برقرار رہے گا اور **دوم** کہ یہ "جہاد فی سبیل اللہ" بمعنی [قتال فی سبیل اللہ] ہر دور میں ایک واضح حق کی صورت میں قائم رہتے ہوئے مندرجہ ذیل آیت کی زندہ تفسیر رہے گا۔

✓ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ [سورۃ آل عمران؛ ۱۴۱]"اور یہ بھی مقصود تھا کہ خدا **ایمان والوں کو خالص** [مومن] بنادے اور کافروں کو نابود کر دے"

اب آج جو شخص ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکتے ہوئے خدا نخواستہ تمام جہادی تحریکوں اور تنظیموں کو باطل اور فساد فی الارض کا سبب گردانتا ہے تو یقیناً وہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی جہالت کے سبب جھٹلاتا ہے [نعوذ باللہ من ذالك] یالاعلمی کے سبب کم از کم مندرجہ ذیل آیت کا مصداق تو بنتا ہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے آواز بلند کرنے کا نتیجہ بیان کر رہی ہے۔

✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ [سورۃ الحجرات؛ ۲]" اے اہل ایمان! اپنی آوازیں **پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو** اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو (اس طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو) کہ **تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں** اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔"

آج میڈیا، حکومتی ایوان اور اس کے ذیلی ادارے اپنے ظاہری اعمال کے سبب [بحث سے بچتے ہوئے] اگر منافق نہیں تو کم از کم فاسق و فاجر کے لقب کے تو قابل ہیں؛ تو ان مصادر سے جو خبر بھی اس سلسلہ میں پہنچے، تو اگر انسان کی استطاعت ہے تو اس کی تحقیق کرلے ورنہ اپنے تمام نیک اعمال ضائع ہونے کے خوف سے کم از کم خاموشی اختیار رکھے۔ [اور جہاں تک کفر کے میڈیا، حکومتی ایوانوں اور اس کے ذیلی اداروں کا تعلق ہے تو ان شرعی معاملات میں ان کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔]

✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا ـــــ [سورۃ الحجرات؛ ۶]"مومنو! اگر کوئی **بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر** لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔۔۔۔۔" اور اگر تحقیق کی استطاعت نہیں مگر حق کی جانکاری کا جذبہ ہے تو ان علمائے حق سے رجوع کرے جو اگر عملی نہیں تو کم از کم قولی طور پر جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف ہیں۔ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ

الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ۔۔۔۔۔ [سورۃ النساء؛۸۳]"اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اس کو پیغمبر اور اختیار والے کے پاس پہنچاتے تو **تحقیق کرنے والے** اس کی تحقیق کر لیتے۔۔۔۔"

اور یقیناً اولین ذمہ داری علماء کی ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ جیسے مقدس فریضہ، جس کو احادیث میں دین کی چوٹی قرار دیا گیا ہو، اس عمل کو اور جہاد کی اصطلاح کے تقدس کو بحال اور اس کی حفاظت کرتے ہوئے عوام میں جہاد کے اصل مقاصد؛ اس کے فضائل؛ عصر حاضر میں اس کی ضرورت اور دنیا و آخرت میں اس کے فوائد کو اپنے خطبات کا مستقل حصہ بنائیں تا کہ اس عظیم دینی اصطلاح کا، جو ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت، تحقیر آمیز استعمال جاری ہے [یعنی مچھروں، گندگی کے ڈھیروں، جہالت، کرپشن، باطل نظاموں کے نفاذ وغیرہ کے ساتھ]، اس کو روکا جا سکے اور دین کی باقی اصطلاحات مثلاً صلاۃ، صیام، زکوٰۃ، حج وغیرہ کی طرح جہاد کو بھی فقط دین کے متعین کردہ شرعی اصطلاحی معنوں میں ہی استعمال کیا جائے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

جہاد فی سبیل اللہ پر عمومی اعتراضات کی حقیقت

عصر حاضر میں دین کے متعدد اعمال میں سے، کفار اور منافقین نے جس عمل کو عام مسلمانوں کی نظر میں بے توقیر کرنے کی سب سے زیادہ کوشش کی ہے اور اس میں ہر قسم کے وسائل کا استعمال کیا ہے، وہ جہاد فی سبیل اللہ ["کفر کے مدمقابل اللہ کے دین کی سربلندی کی کوشش"] ہے۔ اسلام دشمن قوتوں کی کامیابی کا اندازہ فقط اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج معاشرہ میں اکثریت اس دینی فریضہ بلکہ دین کی چوٹی کے عمل کو مسواک جیسی سنت مطہرہ جتنی اہمیت بھی نہیں دیتا۔

عوامی حلقوں میں اس فریضہ پر اٹھائے جانے والے اعتراضات کو اگر مرتب کیا جائے تو کم و بیش ایک ہی مشترکہ نقطہ نظر کی ترجمانی نظر آتی ہے، جبکہ علمی حلقوں میں بھی فقط چند ہی قابل ذکر اعتراضات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

اس مضمون میں ان عمومی اعتراضات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تعلق عوامی حلقوں سے نہ کہ علمی حلقوں سے۔ ان اعتراضات پر غور کرنے سے پہلے قارئین کی دلچسپی کے لیے دین کی چوٹی "جہاد فی سبیل اللہ" اور اسلام کے رکن عظیم "نماز" کا مندرجہ ذیل علمی اور عملی مماثلت پیش خدمت ہے؛

أ. قرآن حکیم میں نماز [تقریباً ۷۰۰ آیات میں] اور جہاد فی سبیل اللہ [تقریباً ۵۵۰ آیات میں] کا ذکر، باقی تمام اعمال کے ذکر سے بہت زیادہ ہے۔

ب. نماز اور جہاد فی سبیل اللہ دونوں ضروریات دین میں سے ہیں۔ ان کی فرضیت کا علم اور اقرار لازم اور ان کی فرضیت سے لا علمی یا انکار کفر ہے اور ان اعمال کو بلا عذر عملی طور پر ترک کرنے والا فاسق و فاجر ہے۔

ت. نماز اور جہاد فی سبیل اللہ کے مرکزی امام کا حکمران وقت ہونا لازم نہیں، اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے مدنی دور اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں یہ دونوں منصب حکمران وقت کے پاس تھے۔

ث. نماز اور جہاد فی سبیل اللہ ہر فاسق اور فاجر امام کے پیچھے بھی قابل ادا ہے۔

ج. نماز اور جہاد فی سبیل اللہ کے فرض کی ادائیگی کے لیے مقتدی کا اور مجاہد کا اپنے امام کے عقائد کے ساتھ کلی ہم آہنگی کی شرط نہیں ہے اور نہ ہی اس پر ان کی تحقیق لازم ہے۔ [اگر امام کفریہ بدعتی عقائد کا حامل ہو اور ان کا پرچار کرتا ہو تو ایسے امام کے پیچھے نہ نماز جائز ہے اور نہ ہی جہاد فی سبیل اللہ]

ح. نماز میں مقتدی اور جہاد فی سبیل اللہ میں مجاہد دونوں قرآن اور حدیث کے دائرہ میں رہتے ہوئے امام کی اتباع کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔

خ. نماز اور جہاد فی سبیل اللہ کے امام کے لیے اجرت جائز ہے۔

د. جس طرح قرآن اور حدیث کے مطابق منافقین کی واضح نشانیوں میں سے ایک نماز کی ادائیگی میں سستی بیان کی گئی ہے خصوصاً فجر اور عشاء کی نماز میں، اسی طرح قرآن اور احادیث میں جہاد فی سبیل اللہ میں سستی اور عملی دوری کو بھی منافقت کی واضح نشانی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ذ. نماز اور جہاد فی سبیل اللہ میں دونوں طرح کے فرض موجود ہیں، یعنی فرض عین اور فرض کفایہ۔

ر. صرف ان ہی دونوں عبادتوں میں صف بندی کا تصور ہے جو کہ اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل ہے۔

ز. اور سب سے اہم ترین مماثلت کہ یہ دونوں عبادات **کُل وقتی** ہیں، نا کہ **جُز وقتی**۔

پیشتر اس سے کہ ہم ان انفرادی اعتراضات کا جائزہ لیں؛ ایک اہم ترین پہلو جو ان تمام اعتراضات میں مشترک ہے، اس کا تعلق معترض کے عمومی کلام سے ہے، یعنی عمومی طور پر وہ تمام جہادی تنظیموں اور

مجاہدین کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہوئے اپنا اعتراض بیان کرتا ہے۔ یہ انداز خطابت مندرجہ ذیل دو وجوہات کی وجہ سے اس کے اپنے ایمان کے لیے انتہائی بڑا خطرہ ہے۔

پہلی وجہ، رسول اللہ ﷺ سے منصوب متعدد صحیح احادیث میں مسلمانوں کے ایک گروہ کا ذکر ہے، جو مسلسل جہاد پر قائم رہے گا یہاں تک کہ وہ گروہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر دجال کے خلاف جہاد کرے گا۔ ایسی صورت میں تمام جہادی تنظیموں اور تمام مجاہدین کو وجہ فساد قرار دینا ہی معترض کا لاعلمی کے باعث رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کے زمرہ میں آئے گا، جو انتہائی نازک اور آخرت کے حساب سے بہت خطرناک معاملہ ہے۔

دوسری وجہ، سورۃ النور میں بیان کیے گئے واقعہ اِفک اور اس کے نتیجہ میں نازل شدہ احکامات ہیں۔ واقعہ اِفک مومن مسلمانوں کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی بہت بڑا امتحان تھا۔ آج کل کے الیکٹرونک اور سوشل میڈیا پر حقیقی جہاد کو بھی جس طرح فساد کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے، منافقین کی طرف سے بھی اس واقعہ کی ظاہری شکل کی ترویج اتنی سنگین نوعیت کی تھی کہ رسول اللہ ﷺ بھی ہماری ماں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متردد ہو گئے۔ مگر اللہ سبحان و تعالیٰ نے اس واقعہ کے نتیجہ میں جو حکم نازل کیا، اس میں مسلمانوں کی عزت پر بہتان لگانے کی صورت میں چار گواہوں کو پیش کرنے کی کلی ذمہ داری، الزام لگانے والے پر ڈال دی گئی اور ناکامی کی صورت میں اس پر ۸۰ کوڑوں کی حد نافذ کر دی اور باقی مسلمانوں کو انتہائی سخت تنبیہ کی کہ وہ کسی بھی مسلمان کی عزت پر حملہ کو ہلکی بات نہ سمجھیں اور نہ ہی اس کی اشاعت میں حصہ لیں۔ چنانچہ ایسی صورت میں تمام جہادی تنظیموں اور تمام مجاہدین کو وجہ فساد قرار دینے کا مطلب اس گروہ پر بھی بہتان باندھنا یا اس کی اشاعت میں اپنا حصہ ڈالنا ہے جس کا ذکر "طائفہ منصورہ" کے طور پر کیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں اللہ کی ناراضگی اور اس کے عذاب کی وعید کا مستحق بننا ہے۔ مزید قرآن کی مندرجہ ذیل آیت کے مطابق بے تحقیق بات کرنا یا اس کی اندھا دھن پیروی کرنا، آخرت میں اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

✓ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا [سورۃ الاسراء:۳۶]" اور [اے بندے] **جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ**۔ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب [جوارح] سے ضرور باز پرس ہو گی"

اہم نقطہ: یہاں یہ بات مد نظر رہے کہ اس مضمون میں موجود جوابات سے انفرادی رویّوں اور کوتاہیوں کی نفی مراد نہیں ہے۔ جس طرح ایک مسجد کی صف میں ہر عقیدہ اور نیت کا نمازی موجود ہوتا ہے اسی طرح مجاہدین کی صفوں میں بھی ہر قسم کے افراد موجود ہیں۔ مگر جس طرح رسول اللہ ﷺ سے مروی حدیث کے مطابق جو بھی مسلمان باقاعدگی سے مسجد میں نماز ادا کرتا ہو تو دوسرے مسلمانوں کو اس کے ایمان کی گواہی دینے کا حکم ہے [مسند احمد۔ جلد پنجم۔ حدیث ۲۶۴] اسی طرح جو مجاہد اپنی تنظیم کے اندر سمع اور اطاعت کے اصولوں پر عمل پیرا ہو، تو اس کے بارے میں بھی ہمیشہ حسن ظن سے کام لینا چاہیے۔

میں جانتا ہوں کہ تمام جہادی تنظیمیں مقامی یا غیر ملکی ایجنسیوں کی آلہ کار ہیں!!!!!

جو جہادی تنظیم حقیقی جہاد میں مصروف ہے، جس کے دو بنیادی ظاہری عنصر ہوں؛ اعلانیہ طور پر اس جہاد کا مرکز نگاہ **"کفار کے خلاف ہونا"** اور اس تنظیم کا اپنے **"ظاہری اعمال میں قرآن و سنت کے تابع ہونا"**؛ تو کسی بھی مقامی یا غیر ملکی ایجنسی کا ایسی تنظیم کی ظاہری و باطنی پشت پناہی اللہ کی نصرت کے زمرہ میں آتی ہے؛ جیسا کہ اللہ سبحان و تعالیٰ نے فرعون کو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کے لیے منتخب فرمایا۔ اللہ سب سے بہترین چال چلنے والا ہے اور اس دین کی نصرت کے لیے وہ فاسق، فاجر، منافق حتّٰی کہ کافر سے بھی کام لے لیتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے واضح ہے، مگر قیامت میں اس نصرت کا فائدہ صرف ان مسلمانوں کے نصیب میں ہو گا جن کو جہاد فی سبیل اللہ میں نیت کا اخلاص نصیب ہو گا۔

میں جانتا ہوں کہ یہ جہاد صرف دنیاوی فائدہ کے حصول کے لیے ہے!!!!!

اگر مجاہدین واقعی جہاد صرف دنیاوی فائدہ کے حصول کے لیے کر رہے ہوتے اور فی الحقیقت ان کو دنیاوی فائدہ نصیب بھی ہو رہا ہوتا، تو رسول اللہ ﷺ کے دور کی طرح، عصر حاضر کے منافق بھی اس بہتی گنگا میں ضرور ہاتھ دھو رہے ہوتے، جیسا کہ ماضی قریب میں روس کے خلاف جہاد میں اس حصول فوائد کی ہر سطح پر مثالیں موجود ہیں۔ بہر کیف، اگر دنیاوی فائدہ، دینی فائدہ کے تحت نصیب ہو رہا ہو تو وہ اللہ کا فضل قرار پاتا

ہے اور خصوصاً جہاد کے نتیجے میں حاصل شدہ مال غنیمت تو قرآن اور حدیث کے مطابق پاک ترین اور افضل ترین رزق ہے اور اگر اس اعتراض سے مراد مقامی اور غیر ملکی اداروں سے یا عام عوام سے فنڈ کی صورت میں مال کے حصول سے متعلق ہے تو وہ جہادی تنظیم جس کے خصائص کا ذکر اعتراض نمبر ا کے جواب کے ضمن میں کیا گیا ہے، تو ان کے لیے ان دنیاوی وسائل کی حیثیت اللہ کی نصرت کی سی ہے۔

پہلے دونوں اعتراضات اگر واقعی قرآن، حدیث یا ابواب فقہ کی رو سے شرعی جہاد کی حیثیت کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتے تو یقیناً یہی دونوں اعتراضات ان مساجد پر بھی چسپاں کیے جاسکتے ہیں جو اسلامی یا غیر اسلامی حکومتوں یا اداروں یا عام عوام سے فنڈ کے زیر سایہ تعمیر کی گئیں یا اپنے روزمرہ کے معاملات چلا رہیں ہیں؛ اور ان امام مساجد پر بھی یہی اعتراضات اٹھائے جاسکتے ہیں جو اسلامی یا غیر اسلامی حکومتوں یا اداروں یا عام عوام سے فنڈ کے ذریعے اجرت گزار رہیں۔ اگر امام اور مقتدی کی نماز کی فرضیت کی ادائیگی کا تعلق محض انفرادی طور پر ان کی نیت کے **اخلاص اور اجتماعی طور پر ظاہر میں قرآن وسنت کے تابع** ہونا ہے تو جہاد کی فرضیت کی ادائیگی بھی ان ہی دونوں شرائط سے مشروط ہے۔

مسلمانوں کو مارنا کون سا جہاد ہے؟

اس اعتراض کو اگر حقیقی جہاد میں مصروف جہادی تنظیموں کی تلاش کے ضمن میں استعمال کیا جائے تو یقیناً یہ اعتراض ایک طالب حق کے لیے واضح نشانی ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر واضح رہے کہ اس تلاش اور تحقیق کا طریقہ کار قرآن وسنت کے تابع ہو یعنی سورۃ الحجرات کی آیت نمبر[٦] کے مطابق کسی کافر و منافق تو کجا کسی فاسق کی بھی پھیلائی ہوئی خبروں کو بغیر مستند ذرائع سے تصدیق کیے تسلیم نہ کیا جائے اور چونکہ یہ ایک دینی معاملہ ہے اس لیے مستند ذرائع کا تعلق بھی اس دینی طبقہ سے ہونا لازم ہے جو جہادی امور پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آج اس الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کے دور میں صرف اس معلومات کو حق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو پیش کرنے والوں کے مقاصد کے حصول کے لیے لازم ہو حتّٰی کہ وہ اپنی مذموم کاروائیوں کو بھی اسی الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کے زور پر مجاہدین کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔

موجودہ حالات میں جہاد اور دہشت گردی میں کوئی فرق نہیں ہے؟

اسلام کی اصطلاحات زمانہ کے نشیب و فراز سے آزاد ہیں۔ جہاد اور دہشت گردی میں آج بھی وہی فرق ہے جو حق اور باطل میں ہے، جو دن اور رات میں ہے، جو حلال اور حرام میں ہے، جو اللہ کی اطاعت اور اس کی نافرمانی میں ہے، اور ایک کی پہچان سے آپ دوسرے عمل کو بآسانی پہچان سکتے ہیں۔ اگر آپ جہاد فی سبیل اللہ کے فریضہ کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں سمجھ گئے تو اس کے مخالف عمل یعنی دہشت گردی کی پہچان اور سمجھ بھی آپ نے حاصل کرلی۔ اس مسئلہ کی سمجھ فقط ان مسلمانوں کو نہیں آسکتی جو دوسرے عذر کو پہلے فریضہ کی ادائیگی سے بچاؤ کے جواز کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اقدامی یا دفاعی جہاد کے لیے کم از کم ریاست یا حکومت کی اجازت تو لازمی ہے؟

جہاد فی سبیل اللہ کی فرضیت کی چھ شرائط ہیں [اسلام، بلوغ، عاقل ہونا، مرد ہونا، آزاد ہونا، مالی وجسمانی قدرت ہونا]۔ مزید برآں جہاد فی سبیل اللہ شاید وہ واحد امر ہے جس کے مسائل میں فقہاء کرام کا فروعی اختلاف نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر خلیفہ، حکمران وقت، ریاست یا حکومت کی اجازت لازمی یا کم از کم ثانوی نوعیت کی شرط ہی کی سی ہوتی تو اس کا ذکر جہاد فی سبیل اللہ کے مسائل کے بیان میں لازماً ہوتا۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس نظر آتی ہے؛

- اگر امام موجود نہ ہو تو جہاد کو موخر نہیں کیا جائے گا کیونکہ موخر کرنے سے اس کے مصالح اور مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ [المغنی ۱۰/۳۴۷؛ امام ابو قدامہ المقدسی؛ فقہی مذہب۔ حنبلی]

مندرجہ بالا فتویٰ اقدامی جہاد سے متعلق ہے جو بالاتفاق فرض کفایہ ہے۔ دفاعی جہاد جو کہ فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے اس میں تو بطریق اولیٰ یہی حکم ہوگا۔

- اگر دشمن حملہ آور ہو جائے تو ہر ایک نکلے گا اگرچہ بلا اجازت ہو۔ [الدر مختار]

جن نصوص میں "امیر" کے بغیر جہاد کی ممانعت اور کراہت مذکور ہے ان کا محل "امیر جہاد" ہے۔یعنی مسلمانوں کا کوئی لشکر اس حال میں کفار کے خلاف نہ لڑے کہ ان پر کوئی "امیر" موجود نہ ہو بلکہ اگر دوران جنگ "امیر" شہید ہو جائے تو اسی وقت نیا "امیر" مقرر کیا جائے اور اس کے لیے لازم نہیں کہ ریاست مقرر کرے؛ جیسا کہ غزوہ موتہ کے موقع پر۔

عصر حاضر میں مخالفین جہاد عموماً تین متضاد باتیں فرماتے ہیں؛

أ. جہاد ریاست کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا، ریاست کا کام ہے وہ جہاد کا فیصلہ کرے، پرائیویٹ جہاد ناجائز ہے۔

ب. ریاستی ادارے مجاہدین کی خفیہ سرپرستی بند کریں یا مجاہدین کو یہ طعنہ کا وہ ریاستی اداروں کی ایماء پر جہاد کرتے ہیں۔

ت. ریاست سیکولر ہونی چاہیے، اس کا مذہبی معاملات سے ہر گز واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ مذہب ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔

ان میں اگر پہلی بات درست ہے تو تیسری غلط ہے۔ دوسری درست ہے تو پہلا اعتراض ختم ہو گیا اور اگر تیسری بات درست ہے تو پہلی غلط ہے۔

یہ ساری جہادی تنظیمیں ایک امیر کے نیچے کیوں نہیں جمع ہو جاتی؟

اگرچہ یہ جہاد فی سبیل اللہ کی شرط نہیں ہے مگر انشاء اللہ جس طرح امام مہدی علیہ السلام کی خلافت علی منہاج النبوۃ میں مسلمان ایک حکومتی نظام کے تحت قرون اولٰی کی طرح اپنی نمازوں میں ایک امام کے نیچے متحد ہوں گے، اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف تمام حق پرست مجاہدین اسلام بھی اسلامی حکومت کے پرچم تلے متحد ہو کر متحدہ کفار سے نبر آزما ہوں گے۔ تاحال ہم اس پر فتن دور میں سے گزر رہے ہیں جہاں اللہ سبحان و تعالٰی کی مشیت، اخلاص پر مبنی اس قوت کو تیار کر رہی ہے جس کا مطمع نظر فقط اللہ کے کلمہ کی سر بلندی ہو، نہ کہ کسی جماعت، مسلک، مکتب فکر یا فقہی مذہب کی ظاہری کامیابی اور سربلندی۔

اگر عصر حاضر کے مجاہدین کا جہاد حق ہے تو اللہ کی نصرت کیوں نہیں نظر آتی ہے؟

اللہ کی نصرت کے مشاہدہ کا اصل مقام تو میدان جنگ ہے۔ قرآن، احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اس بات پر گواہ ہیں کہ اللہ کی نصرت ہمیشہ کفار کے مقابلے میں میدان جنگ میں موجود افراد کی تائید میں اتری اور وہی افراد اس کے مشاہدہ کے گواہ ہیں نہ کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم یا تابعین رحمۃ اللہ علیہم جو اپنے گھروں میں تھے۔

بعینہ آج بھی نہ صرف اللہ کی نصرت میدان جنگ میں نازل ہوتی ہے بلکہ دور حاضر کے مجاہدین اسلام اس کے مشاہدہ کے گواہ بھی ہیں۔ حقیقی دلچسپی رکھنے والے حضرات اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے روس کے خلاف جہاد افغانستان کے دور میں تحریر شدہ عبد اللہ یوسف عزام رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "آیات رحمان فی جہاد افغانستان" یا مفتی رفیع عثمانی صاحب حفظہ اللہ کی کتاب "۔۔۔یہ تیرے پر اسرار بندے" کا مطالعہ فرمائیں۔ یاد رہے کہ یہ کتابیں محض ایک محاذ سے متعلق ہیں، جس میں اللہ کی نصرت فقط میدانوں میں ہی نہیں بلکہ فاسقین، فاجرین، منافقین اور کفار کے ذریعے اعلانیہ دنیاوی وسائل کی صورت میں بھی پہنچ رہی تھی؛ جس کو آج بھی جہاد کے ناقدین ایک اعتراض کے طور پر پیش کرتے ہیں؛ جبکہ ۲۰۰۱ سے امت مسلمہ کا اعلانیہ طور پر ان تمام دنیاوی ظاہری وسائل کے بغیر متعدد جہادی میدانوں میں دنیا بھر کے متحدہ کفار سے مستقل نبرد آزما ہونا ہی فی نفسہٖ کفار کی شکست اور اللہ کی نصرت کا واضح ثبوت ہے۔

اور اگر اس اعتراض سے معترض کی مراد اسلام کی عمومی سربلندی اور کفار کی طاقت کے کلی خاتمہ سے ہے، تو اس اعتراض کا تعلق مجاہدین اسلام سے نہیں بلکہ امت کے مجموعی رویہ سے ہے۔ جب امت کی اکثریت "فاحشہ" اور "منکر" میں مبتلا ہو تو کس طور پر وہ اللہ سبحان و تعالیٰ کی عمومی نصرت کی امیدوار ہو سکتی ہے۔ عصر حاضر میں مجاہدین اسلام تو فقط جہاد جیسی عظیم عبادت کی ادائیگی کے مکلف ہیں نہ کہ عمومی فتح کے۔ مزید بر آں اسی طرح کا اعتراض تو نماز کے متعلق بھی قائم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن کے مطابق نماز "فاحشہ" اور "منکر" سے روکتی ہے [سورۃ العنکبوت؛ آیت ۴۵] مگر چونکہ آج مسلمان معاشروں میں انفرادی اور اجتماعی طور پر نماز کا یہ اثر مفقود ہے تو اس کی ادائیگی بھی ساقط قرار دے دینی چاہیے۔

مجھے تو سمجھ ہی نہیں آتا کہ کون سے جہادی تنظیم حق پر ہے؟

یہ اپنے اصل میں ایک اعتراض کے بجائے عذر ہے اور اس عذر کا اصل حقدار تو وہی ہو گا جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ یا زید بن عمرو بن نفیل کی طرح حق کو پانے کی جستجو کرے گا۔ اب یہ تو اللہ سبحان و تعالیٰ پر منحصر ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں حق کو سامنے لا کر کھڑا کر دے یا زید بن عمرو بن نفیل کی طرح فقط حق پانے کی سچی جستجو کو ہی آخرت میں اس فریضہ کی ادائیگی سے کوتاہی کے طور پر قبول فرمالے۔

دین میں حق کی تلاش کے دو ہی طریقہ ہیں؛ اول یہ کہ انسان خود کوشش کر کے عالم حق کے مرتبہ پر پہنچ جائے بصورت دیگر ان "علمائے حق" کی تلاش کی جستجو کرے جن کی نشانیاں قرآن و سنت میں بیان ہوئیں ہیں۔ مندرجہ بالا طریقوں سے دین کے عمومی امور اور بالخصوص جہاد فی سبیل اللہ کی حقیقت تک رسائی کے لیے لازم ہے کہ طالب حق مندرجہ ذیل تین صفات کا حامل ہو؛

- وہ دینی احکام کو اپنی پسند ناپسند پر ترجیح دیتا ہو؛

✓ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ [سورة البقرة؛ ۲۱۶] "[مسلمانو] تم پر [خدا کے رستے میں] لڑنا فرض کر دیا گیا ہے، **وہ تمہیں ناگوار تو ہو گا**، مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے مضر ہو۔ اور [ان باتوں کو] خدا ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"

- وہ اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جہاد کی محبت کو تمام دنیاوی محبتوں پر ترجیح دیتا ہو؛

✓ قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ [سورة التوبة؛ ۲۴] "کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو، **خدا اور اس کے رسول** صلی اللہ علیہ وسلم

سے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے **تمہیں زیادہ عزیز ہوں** تو ٹھہرے رہو، یہاں تک کہ خدا اپنا حکم [یعنی عذاب] بھیجے۔ اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا"

- اپنی ذاتی تیاری [جسمانی اور دنیاوی اسباب کی حد تک] پوری رکھے؛

✓ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ [سورة الانفال؛ ٦٠] " اور جہاں تک ہو سکے زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے **ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو** کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے اور خدا جانتا ہے ہیبت بیٹھی رہے گی۔ اور تم جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا ذرا نقصان نہیں کیا جائے گا"

آج کل تو جہاد کے حق میں بات کرنا مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہے؟

یہ اعتراض بھی درحقیقت محض ایک عذر ہے جس کا تعلق ایک مسلمان کے ایمانی جذبہ سے ہے اور اس عذر کا جواب صرف قرآن کے ذریعے ہی دیا جا سکتا ہے۔

اس دنیا میں انسان کی تخلیق کا مقصد؛

✓ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ [سورة الذاریات؛ ٥٦] اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ **میری عبادت کریں**۔

یہ دنیا انسان کے لیے محض آزمائش کی جگہ ہے؛

✓ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ [سورة الملك؛ ٢] اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا **تاکہ تمہاری آزمائش کرے** کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔ اور وہ زبردست [اور] بخشنے والا ہے۔

✓ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ [سورۃ العنکبوت؛ ۱] کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ **ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔**

اس دنیا میں مومنوں کا دین کے معاملے میں لوگوں کے ذریعہ آزمائش کی وجہ؛

✓ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ [سورۃ آل عمران؛ ۱۴۰-۱۴۱] اگر تمہیں زخم [شکست] لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں اور اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ خدا **ایمان والوں کو متمیز کردے اور تم میں سے گواہ بنائے** اور خدا بے انصافوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور یہ بھی مقصود تھا کہ خدا **ایمان والوں کو خالص [مومن] بنادے** اور کافروں کو نابود کردے۔

اس دنیا میں عملی منافقوں کا دین کے متعلق عمومی رویہ؛

✓ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَى وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ [سورۃ الحج؛ ۱۱] اور لوگوں میں بعض ایسا بھی ہے جو **کنارے پر [کھڑا ہو کر] خدا کی عبادت کرتا ہے۔** اگر اس کو کوئی [دنیاوی] فائدہ پہنچے تو اس کے سبب مطمئن ہو جائے اور اگر کوئی آفت پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائے [یعنی پھر کافر ہو جائے] اس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی۔ یہی تو نقصان صریح ہے۔

اس دنیا میں عملی منافقوں کا دین کے معاملے میں لوگوں کے ذریعہ آزمائش پر رویہ؛

✓ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ [سورۃ العنکبوت؛ ۱۰] اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لائے جب ان کو **خدا [کے**

رستے] میں کوئی ایذا پہنچتی ہے تو لوگوں کی ایذا کو [یوں] سمجھتے ہیں جیسے خدا کا عذاب۔
اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے مدد پہنچے تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ تھے۔ کیا جو اہل عالم کے سینوں میں ہے خدا اس سے واقف نہیں؟

دین میں اعمال کی قبولیت کی دو شرائط ہیں [نیت کا اخلاص؛ ظاہری شکل میں سنت کے تابع] اور قبولیت کے بعد اعمال کے درجات میں بلندگی کا دارومدار اس انفرادی مشقت پر ہے جو اس عمل کی تکمیل کے لیے ضروری ہے اور نفس پر گراں بھی ہو۔ جہاد کو اسی لیے دین کی چوٹی قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں نفس پر گراں مشقت کا عنصر، باقی تمام دینی احکام کی مشقت سے بہت زیادہ ہے اور اسی مناسبت سے حج اور عمرہ کو باقی دینی اعمال پر افضلیت حاصل ہے۔

کیا جہاد میں زکوٰۃ کا مال دینا جائز ہے؟

کبھی آپ نے سوچا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کی سوئی تک اٹھا کر جہاد فی سبیل اللہ میں کیوں دے دی تھی؟ کیا کبھی آپ نے غور کیا کہ حضرات فقہاء کرام نے آخر یہ کیوں لکھ دیا کہ اگر مسلمان بھوکے مر رہے ہوں تب بھی مجاہدین کو کمک پہنچانا، ان بھوکوں کو کھانا کھلانے سے زیادہ اہم ہے؟ اللہ کے لئے تھوڑا سا غور کیجئے، ہمارے دشمنوں نے اس نکتہ پر بہت پہلے غور کر لیا تھا چنانچہ آج وہ محفوظ ہیں، مطمئن ہیں اور جہاں چاہتے ہیں وار کرتے ہیں، مگر ہم نے اس نکتہ کو بھلا دیا، ہم تو یہ مسئلہ پوچھتے رہ گئے کہ مجاہدین کو زکوٰۃ لگتی ہے یا نہیں؟۔

- ✓ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ [سورة التوبة؛ ٦٠] " صدقات [یعنی زکوٰۃ و خیرات] تو **مفلسوں اور محتاجوں** اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور **غلاموں کے آزاد کرانے میں** اور **قرضداروں** [کے قرض ادا کرنے میں] اور **خدا کی راہ میں** اور **مسافروں** [کی مدد] **میں** [بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیے یہ حقوق] خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا (اور) حکمت والا ہے "

جہاد فی سبیل اللہ شاید وہ واحد عمل ہے جو اس آیت کے ذریعے زکوٰۃ کے ایک نہیں بلکہ کم از کم چھ مصارف کا براہ راست مصداق ہے۔

مفلسوں اور محتاجوں کی مدد میں؛ ماضی کی طرح آج بھی امت مسلمہ کا وہی طبقہ اکثریتی طور پر جہاد فی سبیل اللہ کی اگلی صفوں میں موجود ہے جن کا تعلق اللہ سے مضبوط اور اس دنیا سے کمزور ہے۔ یہ طبقہ اپنے خاندان کی بنیادی ضروریات کو بھی پس پشت رکھ کر، امت مسلمہ کی سربلندی کے لیے کفر کے مقابلے میں ڈٹا ہوا ہے۔ اور اسی طرح شہداء کے خاندانوں کی کفالت بھی امت مسلمہ پر فرض ہے۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا سامان درست کر دے، تو گویا اس نے خود جہاد کیا، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے پیچھے **اس کے گھر کی عمدہ طور پر خبر گیری کرے**، تو گویا اس نے خود جہاد کیا۔" [صحیح بخاری۔ جلد دوم ۔ جہاد اور سیرت رسول اللہ ﷺ ۔ حدیث ۱۱۶]
- ✓ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "مجاہدین کی عورتوں کی حرمت و عزت **گھروں میں رہنے والوں کے لئے ایسی ہے جیسے ان کی ماؤں کی عزت ہے** کوئی آدمی گھر میں رہنے والوں میں سے ایسا نہیں، جو مجاہدین کے کسی آدمی کے گھر میں اس کے بعد نگرانی کرنے والا ہو، پھر ان میں خیانت کا مرتکب ہو کہ اسے قیامت کے دن کھڑا نہ کیا جائے، پھر وہ مجاہد اس کے اعمال میں سے جو چاہے گا لے لے گا، اب تمہارا کیا خیال ہے [کہ وہ کونسی نیکی لے لے گا]؟" [صحیح مسلم۔ جلد سوم ۔ امارت اور خلافت کا بیان ۔ حدیث ۴۱۱]۔۔۔۔ آخر کون سا باغیرت مسلمان اپنی ماں کو لوگوں کے در پر بے یار و مددگار چھوڑے گا۔

غلاموں کے آزاد کرانے میں؛ آج کے دور میں غلاموں کو آزاد کرانے کا مصداق کسی مسلمان قیدی کو رہائی دلوانا ہے۔ خصوصاً اگر وہ مجاہد ہو اور کفار کی قید میں بھی ہو۔ یہ نہ صرف زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہم مصرف ہے، بلکہ جمہور علمائے حق کے نزدیک مسلمان قیدیوں کو کفار کی قید سے چھڑانا امت پر فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔

- ✓ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "**مسلمان قیدیوں کو چھڑاؤ** اور دعوت کرنے والے کی دعوت قبول کرو۔" [صحیح بخاری ۔ جلد سوم ۔ احکام کا بیان ۔ حدیث ۲۰۸۵]

- ✓ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد اپنے کلمے کی بلندی، اپنے دین کے غلبے اور کمزور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے فرض فرمایا ہے اگر چہ اس میں جانیں چلی جائیں اور قیدیوں کو دشمن سے لڑ کر یا انہیں مال دے کر چھڑانا مسلمانوں پر فرض ہے اور مال کے ذریعے چھڑانا زیادہ تاکیدی فرض ہے کیونکہ یہ جان قربان کرنے سے آسان اور ہلکا ہے۔
- ✓ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ قیدیوں کو چھڑائیں خواہ انہیں اپنا سارا مال ہی کیوں نہ دینا پڑے۔

حرف آخر کے طور پر مندرجہ ذیل حدیث ہی ایک درد مند مسلمان کے لیے اس مصرف کی اہمیت اور فرضیت کے احساس کے لیے کافی ہے؛

- ✓ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس نے دشمنوں کے ہاتھوں سے کسی مسلمان قیدی کو فدیہ دے کر چھڑایا تو **میں [محمد ﷺ] وہی قیدی** ہوں۔" [الطبرانی ۔ مجمع الزوائد]

خدا کی راہ میں؛ جمہور علماء کے نزدیک اس آیت میں "فی سبیل اللہ" سے مراد "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔

[دعوت جہاد ؛ تالیف مولانا فضل محمد؛ پانچواں باب ؛ تیسری فصل]

مندرجہ ذیل حدیث بھی مجاہد کے لیے زکوۃ کے استعمال کو جائز قرار دیتی ہے۔

- ✓ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "غنی کے لئے صدقہ حلال نہیں ہے مگر جو **جہاد میں شریک** ہو، یا مسافر ہو، یا ایک محتاج ہمسایہ ہو جس کو کوئی چیز صدقہ میں ملے اور وہ تجھے بطور ہدیہ میں دے یا تیری دعوت کرے"۔ [سنن ابوداؤد ۔ جلد اول ۔ کتاب الزکوٰۃ ۔ حدیث ۱۶۳۳]

حق پر مبنی جہادی تنظیمیں، بالخصوص دینی طبقہ کے وہ علماء اور طلبا جو اپنی ذہنی صلاحیتیں دینی علم کے حصول کی لیے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جسمانی صلاحیتیں جہاد فی سبیل اللہ میں استعمال کرتے ہیں وہی اس مدّ کے بہترین اور واحد مصداق ہیں ورنہ دوسری صورت میں زکوٰۃ وصدقات وخیرات کسی غنی؛ صحت مند اور کمانے کے لائق شخص کے لیے جائز نہیں ہیں۔

مسافر کی مدد میں؛ جب عام مسافر کے لیے زکوٰۃ جائز ہے تو بطریق اولیٰ وہ مجاہد جو جہاد کے سفر میں بھی ہو؛ مندرجہ ذیل حدیث میں بیان کردہ دو خصائص کے حامل ہونے کے باعث، اس مدّ کا بطریق اولی زیادہ اہل ہے۔

- ✓ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "غنی کے لئے صدقہ حلال نہیں ہے مگر جو جہاد میں شریک ہو، یا **مسافر ہو**، یا ایک محتاج ہمسایہ ہو جس کو کوئی چیز صدقہ میں ملے اور وہ تجھے بطور ہدیہ میں دے یا تیری دعوت کرے"۔ [سنن ابوداؤد۔ جلد اول۔ کتاب الزکوٰۃ۔ حدیث ۱۶۳۳]

چونکہ مقاصد شریعت کی ضامن اسلامی حکومت کی غیر موجودگی کے باعث، آج وہ اشخاص جو زکوٰۃ کی ادائیگی کو بوجھ نہیں، بلکہ اللہ کا فرض سمجھتے ہوئے نیت کے اخلاص کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور انہیں زکوٰۃ کے انفرادی مستحق یا کسی بااعتماد وکیل کی تلاش کی اہمیت کا بخوبی اندازہ بھی ہے، ان کے لیے تھوڑی سی تحقیق اور کوشش سے، مندرجہ بالا جہاد فی سبیل اللہ کی کسی بھی مدّ میں اپنی زکوٰۃ کا استعمال، بیک وقت دو فریضوں سے ادائیگی کا باعث بن سکنے کے ساتھ ساتھ، اس منافقت والی موت سے بھی برأت کا باعث بن سکتا ہے، جس کا ذکر مندرجہ ذیل حدیث میں ہے؛

- ✓ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ "جو شخص جہاد کے بغیر مر جائے اور اس کے **دل میں جہاد کی خواہش** بھی نہ ہو تو وہ منافقت کی حالت پر مرا"۔ [المستدرك۔ جلد ۲۔ کتاب الجهاد۔ حدیث ۲۴۱۹]

لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله محمد رسول الله

اللهم صل علی سیدنا محمد و علی اٰلہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

اصطلاحات کی حقیقت

اصطلاحات سے کیا مراد ہے؟

- وہ لفظ، جس کے کوئی خاص معنی، کسی علم یا فن وغیرہ کے ماہرین نے، یا کسی جماعت نے، مقرر کر لیے ہوں۔
- اصطلاح، کسی قوم کا کسی شے کے نام پر اتفاق کر لینا ہے، جو کہ اس کے پہلے معنی، موضوع سے منتقل کر دے اور لغوی معنی کی بجائے، کسی مناسبت کے باعث، دوسرے معنی مراد لیے جائیں۔
- اصطلاح، کسی متعین لفظ کو کہتے ہیں، جو متعین کرنے والوں کے درمیان، متعین معنوں میں استعمال ہوتی ہو۔

انگریزی میں اصطلاح کے لیے استعمال ہونے والا لفظ [TERM] ہے؛

- A word or phrase used to describe a thing or to express a concept, especially in a particular kind of language or branch of study:

کیا ایک ہی اصطلاح دو نظریات کی علم بردار ہو سکتی ہے یا کیا ایک نظریاتی اصطلاح کا غلط استعمال ممکن ہے؟

کوئی اصطلاح، مجرد [اکیلا، تنہا] لفظ نہیں ہوتی؛ ہر اصطلاح، کا اپنا مخصوص فکری، علمی یا مذہبی پس منظر ہوتا ہے اور اس کے معانی کا تعین، اس کے مخصوص پس منظر سے صرفِ نظر کر کے نہیں کیا جا سکتا؛ چنانچہ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے، کہ کوئی بھی اصطلاح غیر جانبدار نہیں ہوتی اور نہ ہی بیک وقت دو نظریات کی علم بردار ہو سکتی ہے۔ ہاں اصطلاحات کا غلط استعمال، نہ صرف ممکن، بلکہ عصر حاضر میں عروج پر ہے۔

عصر حاضر کی بیشتر مغربی اصطلاحات کا مسلمان معاشروں میں عمومی استعمال، نہ صرف معمول ہے، بلکہ علمی بد دیانتی کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے، ایک مخصوص مفاد پرست طبقہ، ان اصطلاحات کی گمراہی اور باطل نظریات کو شریعت کی خالص اور پاک اصطلاحات کے مترادف ٹھہراتے ہوئے، ان کے بے دریغ استعمال سے بھی گریز نہیں کرتا۔

عصر حاضر کی چند مشہور گمراہ کُن اصطلاحات کون سی ہیں؟

دور جدید کی بیشتر مغربی اصطلاحات کا تعلق یورپ کی تحریک نشاۃ ثانیہ [European Renaissance] کے دور، یعنی چودھویں صدی عیسوی سے لے کر سترویں صدی عیسوی کے اوائل تک ہے؛ یہی وہ زمانہ ہے جب دین سے وابستہ ہر چیز سے بیزاری اور دوری اپنے عروج پر تھی اور ایک نئے حکومتی، معاشرتی، سماجی، سیاسی اور معاشی نظام کی داغ بیل ڈالنے کی لیے **"جو مذہب کی چھاپ سے آزاد ہو"** لازم تھا کہ ایسی نئی اصطلاحات کو متعارف کیا جائے، جو ان تمام نظاموں کے لیے بنیادی اساس [جڑ، اصل] فراہم کر سکے۔

مندرجہ ذیل چند مغربی اصطلاحات اور ان کے مدمقابل اسلامی اصطلاحات اور ان کے مفہوم کا تذکرہ قارئین کو محض معاملہ کی سنگینی کے احساس کی نیت سے قلم بند کی گئی ہیں، جو کہ ہماری سول سوسائیٹی؛ ماڈریٹ اسلام اور سیکولر اسلام کے علم بردار طبقہ کے عام استعمال میں ہیں اور ان کے ذریعے وہ نہ صرف عوام، بلکہ ہمارے دینی طبقہ کو بھی بیوقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اً. HUMAN BEING [ہیومن بینگ]

ہیومن بینگ، محض ایک لغوی لفظ نہیں، کہ جس کا ترجمہ "انسان" کر کے اسے جس معنی میں چاہے استعمال کر لیا جائے، بلکہ یہ ایک مخصوص تہذیبی اقدار کی عکاس و علمی تاریخ سے بر آمد ہونے والی ایک اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال یورپ میں سولھویں صدی کے اواخر سے ہوا۔

مغربی نقطہ نظر؛

ہیومن بینگ، ایک تصور انفرادیت ہے، جس کے مطابق ایک فرد ایک Self-Determined & Self-Governed Being [قائم بالذات اور خود مختار ہستی] ہے۔ اس انفرادیت کی بنیاد عبدیت نہیں، بلکہ آزادی یعنی بغاوت ہے، ہیومن بینگ خود اپنا رب ہوتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے اسے کر گزرنے کا مکلف سمجھتا ہے۔ اسی خود مختار ہستی کی حیثیت سے "ہیومن بینگ" وہ بنیادی اکائی [یونٹ] ہے، جس کے تحت تمام نظاموں یعنی حکومتی، معاشرتی، معاشی، سیاسی وغیرہ کا مقصد فقط اس کے انفرادی حقوق اور لامحدود خواہشات کے حصول کا تحفظ ہے۔

اسلامی نقطہ نظر؛

انسان، اپنے رب کے ارادے کا مطیع ہوتا ہے اور اس کائنات میں اس کا مقام اللہ کے عبد اور زمین پر اس کے خلیفہ کا ہے اور اسی عبد کی حیثیت سے "انسان" وہ بنیادی اکائی [یونٹ] ہے، جس کے تحت تمام نظاموں یعنی حکومتی، معاشرتی، معاشی، سیاسی وغیرہ کا مقصد فقط اپنے رب کی اطاعت ہے۔

ب. HUMAN RIGHTS [حقوق انسانی]

مغربی نقطہ نظر؛

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو "انسانی حقوق کا عالمی منشور" منظور کر کے اس کا اعلان عام کیا، جو ۳۰ دفعات پر مشتمل ہے؛ ان دفعات کا کل مرکزِ نظر، ایک ہیومن بینگ کے انفرادی مفادات کا تحفظ ہے؛ چونکہ اس حقوق کے نظام کا مرکز نگاہ دینے سے پہلے لینے پر ہے، اسی لیے موجودہ معاشروں میں چہار سو مختلف طبقے، اپنے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے، باہم دست و گریبان نظر آتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر؛

حقوق العباد کا جواز اور اس کی ترتیب ارادہ خداوندی سے طے ہوتی ہے، یعنی ایک انسان [عبد] کو کسی عمل کا حق ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ، کتاب و سنت سے ہوتا ہے۔ حقوق العباد، اللہ سبحان وتعالی کی

طرف سے مقرر کردہ وہ ذمہ داریاں ہیں، جن کی ادائیگی کا وہ اس دنیا میں مکلف ہے اور یہ حقوق کا نظام لینے سے پہلے دینے پر یقین رکھتا ہے؛ اور معاشرہ میں دوسروں کے حقوق کو اپنے حقوق پر فوقیت کا درس دیتا ہے۔ تو اپنے اصل میں یہ مغربی تصور "حقوق انسانی" کی ضد ہے۔

ہیومن رائٹس، پر ایمان لانے کا تقاضا یہ مان لینا ہے، کہ اسلام ہی واحد حق نہیں ہے، بلکہ تمام مذاہب اور نظریہ ہائے زندگی بھی اتنے ہی حق پر مبنی ہیں جتنا اسلام۔ لہٰذا مسلمانوں کو اسلام کی دوسرے مذاہب اور نظام ہائے زندگی پر برتری کے دعوے سے دستبردار ہو جانا چاہیے اور خصوصاً اقامت دین کی کوششیں ترک کر دینی چاہیں، کیونکہ اسی مذہبی برتری کی سوچ کے نتیجے میں مذہبی انتہا پسندی کو فروغ ملتا ہے۔

ت. FREEDOM[آزادی]

مغربی نقطہ نظر؛

دورِ جدید کا مغربی نظریہ آزادی کا معنی، ہر فرد کا تعین خیر و شر کا حق [Right to Define Good and Bad]، یعنی یہ تصور کہ خیر کی تعریف کرنا، ہر فرد کا انفرادی حق ہے۔

اسلامی نقطہ نظر؛

مذہبی نقطہ نگاہ سے آزادی کا مطلب ہے، ارادہ خداوندی کے مظہر تصورات خیر و شر کو اپنانے کی صلاحیت؛ اب وہ اس آزادی کی صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے، حق کو اختیار کر کے اپنے رب کا فرماں بردار بنے یا اس کا انکار کر کے، اس کا باغی کہلائے۔

ث. EQUALITY[مساوات]

مغربی نقطہ نظر؛

دورِ جدید کا مغربی نظریہ مساوات کا معنی یہ ماننا ہے، کہ چونکہ ہر فرد کو یہ آزادی حاصل ہے، کہ وہ اپنے لیے خیر و شر کا جو پیمانہ چاہے طے کر لے؛ لہٰذا ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ دوسروں کے اس مساوی حق کو تسلیم کرے۔

اسلامی نقطہ نظر؛

مذہبی نقطہ نگاہ سے مساوات کی تعلیم کا اہم مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہے، کہ اس کے تمام ماننے والوں کو باہمی طور پر یکساں حقوق اس طرح باہم پہنچائے جائیں، کہ کسی بھی فرد کے ساتھ کسی معذوری و مجبوری، کسی نوعیت، مرد وعورت کے امتیاز، یا چھوٹے بڑے کی بنیادوں پر، دنیا کے کسی بھی ملک یا خطہ میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔ کسی کی صورت وشکل، یا زبان وغیرہ کے بجائے، مسلم معاشرہ کے فرد کو صرف اور صرف "تقوٰی" کی بنیاد پر امتیاز اور برتری کا تاج پہنایا جائے۔ دور جدید کا مغربی نظریہ مساوات کو اپنانے کا معنی ہے کہ نظام ہدایت ورُشد کا رَدّ؛ یعنی اِس بات کا انکار کرنا، کہ اللہ تعالٰی نے انسان کو خیر وشر بتانے کے لیے ہدایت کا کوئی سلسلہ انبیاء کرام کے ذریعے قائم کیا ہے۔

ج. TOLERANCE[رواداری]

مغربی نقطہ نظر؛

دور جدید کا مغربی نظریہ رواداری کا مطلب یہ ہے، کہ یہ مانا جائے کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کہ آپ کی نگاہ میں خیر کا تصور کیا ہے؛ بلکہ اہم بات یہ ہے، کہ فرد اس بات کا قائل ہو کہ ذاتی زندگی میں اقدار [Values] کی جو بھی ترتیب ہو مگر معاشرتی سطح پر وہ اس ترتیب کو قبول کرے گا ، جس میں آزادی کے اصول کو مقدم رکھا جائے گا۔ [Tolerance] کا مطلب اختلاف رائے کو برداشت کرنا نہیں، بلکہ اس کا مطلب اقداری ترتیب کے فرق کو غیر اہم اور لایعنی سمجھنا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر؛

مذہبی نقطہ نگاہ سے رواداری کا مفہوم، اپنے مخالف مذہب و نظریہ کے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور مراعات سے پیش آنا، ان کے حق میں کوئی ایسی سخت بات نہ کہنا، جو اُن کی آزردگی اور دلآزاری کو موجب ہو، ان کو اپنے مذہب میں آزادی ضمیر کا حق دینا، ضرورت پر ان کی امداد اور ہمدردی کرنا، مصیبت اور مشکل میں ان کی اعانت کرنا۔ اِس کے برخلاف جدید مغربی نظریہ رواداری کو اپنانے کے معنی ہے، نہی عن المنکر کا رَدّ؛ یعنی جب مان لیا، کہ خیر و شر کا تعین فرد کا حق ہے؛ نیز تمام تصورات خیر مساوی ہیں، تو یہ ماننا بھی لازم ہے، کہ اول تو برائی کوئی شے ہی نہیں اور اگر مجھے کوئی

عمل اپنے تصور خیر کے مطابق برائی نظر بھی آتا ہے، تو میں اس کو برداشت کروں، نہ یہ کہ اسے روکنے کی فکر اور تدبیر کرنے لگوں۔

کیا مغربی اصطلاحات کو "اسلامی" کا لاحقہ لگا کر کلی یا جزوی طور پر اپنایا جا سکتا ہے؟

اِس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے، کہ چونکہ ہر اصطلاح کسی فکری، علمی یا مذہبی پس منظر کی علم بردار ہوتی ہے تو **"دین اسلام کی کس فکری؛ علمی یا مذہبی کمی کو ان مغربی اصطلاحات کے ذریعہ مکمل کیا جا رہا ہے؟"**۔ حکومتی نظام سے متعلق مندرجہ ذیل چند مشہور مغربی اصطلاحات، جن کو "اسلامی" لاحقہ پہنانے کے بعد، مسلمان معاشروں میں بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے، اسلامی اصطلاحات کے تقابل اور میرے ذاتی تجزیہ کے ساتھ قارئین کے پیش خدمت ہیں۔

معاملہ کی شفافیت اور سنگینی کو برقرار رکھنے کی نیت سے تمام مغربی اصطلاحات کو بغیر اردو ترجمہ کے قلم بند کیا گیا ہے۔

1. Democracy [جمہوریت]

- A form of government in which the people freely govern themselves; where the executive (or administrative) and law-making (or legislative) power is given to persons chosen by the population; the free people. In the result, the government is said to be 'representative', as in representative of the people.
(Duhaime's Law Dictionary)

اً. **خلافت**

- "امامت [اسلامی حکومت] بنائی جاتی ہے، **نبی ﷺ کی نیابت کے لیے**، دین **اسلام کی حفاظت** کرنے اور **دنیا کا نظم ونسق** چلانے اور اُس کی **اصلاح** کرنے میں" (امام ابوالحسن ماوردی رحمہ اللہ متوفی ۴۵۰ھ ؛الاحکام السلطانیہ صفحہ ۵، اسلامی سیاست صفحہ ۱۱۰)
- "وہ عمومی ریاست، جو دینی اور دنیوی امور میں **نبی ﷺ کی نیابت** میں کام کرتی ہو" (ابن عابدین شامی رحمہ اللہ حنفی)
- "خلافت وہ عمومی ریاست ہے، جو **اقامت دین** کی جانب عملاً متوجہ رہتی ہو" (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ)

تجزیہ:ان دونوں اصطلاحات کے مطالب سے یہ واضح ہے کہ دونوں کا تعلق طرز حکومت سے ہے، بجز اس فرق کہ، کے خلافت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے تابع ہوتے ہوئے، ایک دینی مقصد کے حصول کو نصب العین بناتی ہے، جبکہ جمہوریت، اکثریت کے تابع ہوتے ہوئے، اپنی مقصدیت فقط اکثریت کی خواہشات کے حصول کو ٹھہراتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا، کہ جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے لازم ہے، کہ اس کے دونوں بنیادی اصولوں کو خلافت کے اصولوں سے بدل دیا جائے اور اگر بالفرض محال ایسا کر بھی دیا جائے، تو آخر ایسی کون سی مجبوری ہے، کہ اس کو پھر بھی خلافت کے بجائے جمہوریت کی اصطلاح کے تابع رکھا جائے۔

2. Constitution [آئین]

- The basic, fundamental law of a state which sets out how that state will be organized and the powers and authorities of government between different political units and citizens.
- The primary contract or law by which the government of a nation or state is set out and organized.
- The constitution is colloquially referred to as the "#1 law of the land"; to which all of government, citizens, corporate persons and other laws must defer in the event of any conflict.

(Duhaime's Law Dictionary)

ب. شریعہ

- "شریعت سے مراد وہ احکام ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے بطور ضابطہ حیات جاری فرمائے ہیں۔" [عبد القادر الرازی، مختار الصحاح:۳۷۳]

اِس سے معلوم ہوا کہ شرع اور شریعت سے مراد دین کے وہ معاملات و احکامات ہیں، جو اللہ نے بندوں کے لئے بیان فرما دیے اور جو حضور نبی اکرم ﷺ کے عطا کردہ ضابطہ حیات سے ثابت ہیں۔ شریعت سے اوامر و نواہی، حلال و حرام، فرض، واجب، مستحب، مکروہ، جائز و ناجائز اور سزا و جزا کا ایک جامع نظام استوار ہوتا ہے۔ شریعت ثواب و عذاب، حساب و کتاب کا علم ہے۔ شریعت کے اعمال، دین کے اندر ظاہری ڈھانچے اور جسم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تجزیہ:ان دونوں اصطلاحات کے مطالب سے یہ واضح ہے، کہ دونوں کا تعلق اجتماعی نظام سے ہے بجز اس فرق کہ کے شریعت کا ماخذ قرآن اور حدیث ہیں، جبکہ آئین کا ماخذ ایک خاص علاقہ یا قوم کا اجتماعی فیصلہ اور اختیار ہے۔ اگر کوئی قوم اجتماعی طور پر قرآن

اور حدیث کو اپنے ہر معاملے میں جزوی نہیں بلکہ کلی فیصلہ کا اختیار سپرد کر دے تو ایسے نظام حکومت کو نظام شریعت کا خطاب دیں گے، وگرنہ وہ آئینی نظام حکومت کہلائے گا۔اس سے یہ ثابت ہوا، کہ یہ دونوں اصطلاحات اپنے اصل معنوں میں مترادف کے طور پر کبھی بھی استعمال نہیں ہو سکتیں اور ایک اصطلاح دوسری اصطلاح کی غیر موجودگی میں ہی استعمال ہو سکتی ہے بیک وقت نہیں۔ چنانچہ کوئی نظام حکومت یا تو شرعی ہو سکتا ہے یا آئینی [بمعنی غیر شرعی]؛ جزوی طور پر بھی فیصلہ کا اختیار شریعت کے علاوہ کسی اور کے حق میں ماننے سے کل نظام غیر شرعی ہو جاتا ہے۔

3. Derived Law [وضعی قانون]

- According to the United Nations, the rule of law: "... refers to a principle of governance in which all persons, institutions and entities, public and private, including the State itself, are accountable to laws that are publicly promulgated, equally enforced and independently adjudicated, and which are consistent with international human rights norms and standards.
- Rules of conduct approved and enforced by the government of and over a certain territory.
- A law is ... a command proceeding from the supreme political authority of a state, and addressed to the persons who are subjects of that authority.
- A rule of ... conduct prescribed by the supreme power in a state, commanding what is right and prohibiting what is wrong.

(Duhaime's Law Dictionary)

ت. فقہ

- انسان کو جو جو اعمال ضروری ہیں اور جن جن سے بچنا ضروری ہے، ان کے جاننے کا نام فقہ ہے [امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ]۔
- ایسے احکام کے جاننے کا نام فقہ ہے، جو کہ قرآن وحدیث سے حاصل ہوتے ہوں [امام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ]۔
- ذیل میں دی گئی فقہ کی یہ تعریف خیر القرون کے بعد کے علماء نے پیش کی ہے؛

علم فقہ، شریعت کے ان فروعی احکام کے علم کا نام ہے جن کا تعلق بندوں کے افعال سے ہے مثلاً ان کی عبادات و معاملات، ان کے خاندانی تعلقات، دین کے حق میں ان کی زیادتیاں، زمانہ امن وجنگ میں مسلمانوں کے اپنوں اور غیروں سے تعلقات وغیرہ۔ پھر ان افعال کے بارے میں، اس

حکم کا علم، کہ یہ واجب ہیں یا حرام، مندوب ہیں یا مکروہ یا مباح یا یہ کہ وہ صحیح ہیں یا غلط وفاسد وغیرہ۔
اس علم کی اٹھان، ان تفصیلی دلائل پر ہی ہوگی جو کتاب وسنت اور دیگر معتبر دلائل سے ماخوذ ہوں۔

تجزیہ: کسی بھی لبرل معاشرے یا ایسا معاشرہ، جس کے بنیادی اصول آئین میں باہم اتفاق رائے سے طے کیے گے ہوں؛ اس میں کوئی قانون بھی وضع کرنے کا واحد اصول، اس قانون کا آئین کے ان متفق علیہ بنیادی اصولوں کے موافق ہونا ہے۔ اس اصول پر مبنی قوانین کا بنیادی مقصد لوگوں کے ان انفرادی اور اجتماعی حقوق کی پاسداری ہے، جن حقوق پر آئین میں اکثریتی جماعتوں کا اتفاق موجود ہے۔ غرض کہ قوانین کسی بھی معاشرہ میں اس کے متفق الیہ بنیادی اصولوں کے مظہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی معاشرہ کی اکثریت شریعت کو اپنے بنیادی اصول کے طور پر اپنالے، تو یہ قوانین شریعت کا مظہر ہوں گے اور ان کو فقہ کے نام سے تعبیر کریں گے، جن کا ماخذ قرآن اور سنت ہو گا۔ اس صورت میں ہر قانون کا جواز کسی شرعی دلیل کی بنیاد پر ہو گا، نہ کہ کسی قانون کا بظاہر قرآن وسنت سے مخالف نظر نہ آنا۔

4. Ruling or Verdict [قطعی رائے، فیصلہ]

- "A verdict of the jury is the jury's answer to the question of fact contained in the issue formed by the pleadings of the parties."
- "A verdict is a declaration of the truth as to the matters submitted to the jury.... It is a very important act. It is a culmination of the trial, and embodies the conclusions of the jury upon the questions of fact litigated upon the trial." (Duhaime's Law Dictionary)
- A judicial or administrative interpretation of a provision of a statute, order, regulation, or ordinance. The judicial determination of matters before the court such as the admissibility of evidence or the granting of a motion, which is an application for an order. (http://legal-dictionary.thefreedictionary.com/ruling)
- An official or authoritative decision, decree, statement, or interpretation (as by a judge on a point of law). (http://www.merriam-webster.com/dictionary/ruling)
- An authoritative decision, as one by a judge on a debated point of law. (http://www.thefreedictionary.com/ruling)

ث. فتویٰ

- شریعت کی اصطلاح میں، زندگی کے کسی بھی شعبہ سے متعلق پیش آمدہ مسائل میں دینی رہنمائی کا نام فتویٰ ہے، بالفاظِ دیگر کسی بھی مسلمان کو کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہو، تو اس کے استفسار پر قرآن و حدیث اور ان سے اخذ کیے ہوئے اصول و تشریحات کی روشنی میں علمائے دین اور مفتیانِ کرام جو **حکم شرعی** بتاتے ہیں، اسی کا نام "فتویٰ" ہے۔
- زمانے کی تبدیلی، احوال کے فرق اور ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت آنے والے نت نئے پیچیدہ مسائل کو **فقہی اصول و ضوابط کی روشنی میں حل کرنے کا نام** "فتویٰ" ہے۔
- ڈاکٹر شیخ حسین ملّاح نے فتوی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے؛ پیش آمدہ واقعات کے بارے میں دریافت کرنے والے کو **دلیل شرعی کے ذریعہ اللہ تعالی کے حکم کے بارے میں خبر** دینے کا نام "فتویٰ" ہے۔

تجزیہ: آئینی نظام میں، عدالت کا جج، کسی بھی قانون میں موجود ابہام یا حالات و واقعات کے تناظر میں پہلے سے موجود قانون کی جو تشریح کرتا ہے اور اس کے مطابق جو فیصلہ صادر فرماتا ہے، اس کو انگلش میں "Ruling or Verdict" اور عربی میں "فتویٰ" کہتے ہیں۔ اس فیصلہ یا فتویٰ کا اطلاق اور اس کی پاسداری کرنا ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسلامی نظام میں کسی بھی عدالت کا جج، مفتی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ سے مروی ہے کہ "**قاضی تین قسم کے ہیں**۔ ایک قسم جنت میں جائے گی اور دو قسمیں جہنم میں جائیں گی۔ پس جو جنت میں جائے گی وہ قاضی جنہوں نے حق پہچانا اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا اور وہ قاضی جو حق کو پہچاننے کے باوجود فیصلہ میں ظلم کرے وہ جہنم میں جائے گا اور وہ قاضی جس نے لوگوں کی لئے جہالت کے ساتھ فیصلہ کیا وہ بھی جہنم میں جائے گا" [سنن ابوداؤد ۔ جلد سوم ۔ فیصلوں کا بیان ۔ حدیث ۱۸۰]۔

علمائے اسلام کا اس حدیث میں "حق" کے بارے میں مطلق اجماع ہے، کہ اس سے مراد شریعت کا علم ہے، نہ کہ آئینی نظام کے تحت وضع شدہ قوانین کا علم۔

5. Legal or Lawful [قانونی]

- Allowable or enforceable by being in conformity with the law of the land and the public policy; not condemned as illegal. (http://www.businessdictionary.com/definition/legal.html)
- Conforming to the law; required or permitted by law; not forbidden by law. (http://legal-dictionary.thefreedictionary.com/legal)

ج. حلال یا مباح

حلال؛ جس پر عمل کرنے میں کوئی گناہ نہ ہو، اسی طرح اس کے ترک کرنے پر گناہ نہ ہو، لیکن اگر اس حلال فعل کو سرانجام دینے میں اللہ تعالی کی اطاعت پر تقویت حاصل کرنا مقصد ہو، تو اس نیت کی رو سے اسے ثواب ملے گا۔ حلال وہی ہے، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کیا۔

مباح؛ جس کام کا کرنا اور نہ کرنا دونوں حکم کے اعتبار سے برابر ہوں، یعنی اس کے کرنے میں نہ ثواب ہے اور نہ ہی ترک میں کوئی گناہ۔ اشیاء میں اصل حکم اباحت ہی کا ہے [رد المحتار، قواعد الفقه]

تجزیہ: جمہوری آئینی نظام چونکہ اکثریت کی رائے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، اس لیے اس میں کسی عمل یا اشیاء کے قانونی ہونے کا دار و مدار افراد کے باہمی رضامندی پر ہوتا ہے اور انہی اصولوں کے تابع ہوتا ہے، جن اصولوں پر آئین کی بنیاد ہوتی ہے۔ اسی اصول کے تحت جمہوریت نے ہم جنس پرستی، سود، شراب، موسیقی، فحاشی کی اشاعت وغیرہ جیسے لاتعداد محرمات اور منکرات کو قانونی قرار دے دیا ہے اور اس کے برعکس اگر کسی معاشرہ میں کسی بھی عمل یا شے کا قانونی ہونے کا جواز، شریعت کی بنیاد پر ہو، تو اسی قانونی عمل یا شے کو اسلامی اصطلاح میں حلال یا مباح کہا جائے گا۔

6. illegal or Un-Lawful [غیر قانونی]

- Not authorized by law; illicit; unlawful; contrary to law. Sometimes this term means merely that which lacks authority of or support from law; but more frequently it imports a violation. (http://thelawdictionary.org/illegal/)

ح. حرام، مکروہ تحریمی یا مکروہ تنزیہی

- **حرام**؛ وہ ہے، جس کی ممانعت دلیل قطعی سے ثابت ہو، اس کا منکر کافر ہے اور بلاعذر اس کا مرتکب فاسق اور مستحق عذاب ہے۔
- **مکروہ تحریمی**؛ وہ ہے، جس کی ممانعت دلیل ظنی سے ثابت ہو، بلاعذر اس کا مرتکب گناہگار اور عذاب کا مستحق ہے، اور اس کا منکر فاسق ہے۔
- **مکروہ تنزیہی**؛ وہ ہے، جس کے ترک [چھوڑنے] میں ثواب اور کرنے میں عذاب نہیں؛ مگر ایک قسم کی قباحت [برائی] ہے۔

تجزیہ: جمہوری آئینی نظام میں جس طرح کسی قانونی عمل یا شے کا دارومدار اکثریت کی رائے کی بنیاد پر ہے، اسی طرح غیر قانونی کا معیار بھی اکثریت کی رائے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور انہی اصولوں کے تابع ہوتا ہے جن اصولوں پر آئین کی بنیاد ہوتی ہے۔ اسی اصول کے تحت جمہوریت نے حدود کا نفاذ، جہاد، اذان، حجاب، توہین رسالت کی سزا، قانونی بلوغت سے پہلے مسلمان ہونا وغیرہ جیسے لاتعداد فرائض وواجبات کو غیر قانونی قرار دے دیا اور اس کے برعکس، اگر کسی معاشرہ میں کسی بھی عمل یا شے کے غیر قانونی ہونے کا جواز شریعت کی بنیاد پر ہو، تو اِسی غیر قانونی عمل یا شے کو اسلامی اصطلاح میں حرام، مکروہ تحریمی یا مکروہ تنزیہی کہا جائے گا۔

7. Legal Duty or Legal Obligation [قانونی فرض یا قانونی فریضہ]

- Obligation arising from operation of law, a breach of which would constitute a legal wrong (illegality).(http://www.businessdictionary.com/definition/legal-duty.html)
- The requirement to do what is imposed by law, promise, or contract; a duty. In its general and most extensive sense, obligation is synonymous with duty. In a more technical meaning, it is a tie which binds us to pay or to do something agreeably to the laws and customs of the country in which the obligation is made. (http://www.lectlaw.com/def2/o001.htm)

خ. فرض، واجب

فرض یا واجب {جمہور کے مطابق}: جو دلیل قطعی سے ثابت ہو، یعنی اُس کے ثبوت میں شک وشبہ نہ ہو، مثلاً قرآن وحدیث صحیحہ سے ثابت ہو، بلاعذر اس کا **تارک فاسق** اور عذاب کا مستحق ہے اور اس کی **فرضیت کا اعتقاد رکھنا ضروری** ہے، چاہے اس پر عمل نہ کرے۔

واجب [حنفیہ کے مطابق]: وہ ہے جو دلیل ظنی سے ثابت ہو، اس کا **تارک عذاب کا مستحق** ہے، اس کے وجوب کا **منکر فاسق** ہے کافر نہیں۔

تجزیہ: جمہوری آئینی نظام میں، حکومتی اداروں [عدالتیں، پولیس، فوج وغیرہ] کے ارکان کا قانونی فرض یا قانونی فریضہ ہوتا ہے، کہ جو عمل یا شے قانونی قرار دیا جاچکا ہو، اس کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے اور اِسی طرح جو عمل یا شے غیر قانونی قرار دیا جاچکا ہو، اس کی روک تھام کے لیے ہر قسم کی کاروائی کو یقینی بنایا جائے۔ اسی قانونی فریضہ کی ادائیگی کے تحت قحبہ خانوں، شراب خانوں، سینما گھروں، سود، ہم جنس پرستی وغیرہ جیسے لاتعداد عمل اور اشیاء، جن کو اگرچہ اسلامی شریعت نے، حرام، مکروہ تحریمی یا مکروہ تنزیہی قرار دیا ہو، مگر قانونی قرار دیے جانے کے سبب، ان کو بزور طاقت تحفظ فراہم کیا جاتا ہے اور اس کے مدمقابل، حدود کے نفاذ،

جہاد، اذان، حجاب، توہین رسالت کی سزا، قانونی بلوغت سے پہلے مسلمان ہونے وغیرہ جیسے لاتعداد عمل اور اشیاء، جن کو اسلامی شریعت فرض، واجب، حلال یا مباح قرار دے چکی ہو، ان کو غیر قانونی قرار دیے جانے کے سبب، ان میں ملوث افراد کی بیخ کنی بھی اسی قانونی فریضہ کا جز ہے۔

ان مغربی اور اسلامی اصطلاحات کے تقابلی جائزہ سے، ایک خوفناک حقیقت کا احساس دل میں اجاگر ہوتا ہے، کہ کہیں ہم اپنی سادہ لوحی، جہالت، دین سے دوری یا نفسانی خواہشات کے غلبہ کے تحت، "دین اسلام" کے بجائے "دین جمہوریت" کے علم بردار تو نہیں ہیں اور کہیں قرآن کی اس آیت میں بیان کی گئی وعید کے مستحق تو نہیں ہو رہے؛

- ✓ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ [سورۃ آل عمران؛۸۵] اور جو شخص **اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو گا** وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہو گا۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارک و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

جمہوریت کی حقیقت

کیا جمہوریت ایک حکومتی نظام ہے یا محض طریقہ انتخاب؟

ہر نظام کی بنیاد کوئی عقیدہ یا نظریہ ہوتا ہے، جب کہ طریقہ انتخاب کی اس نظام کے اندر حیثیت، محض ایک آلہ [Tool] کی سی ہوتی ہے۔ جمہوریت اگر ایک نظام ہے، تو اس کی بنیاد کوئی عقیدہ یا نظریہ ہونا چاہیے، ورنہ ایک آلہ کی حیثیت سے وہ ہر نظام میں قابل استعمال ہونا چاہیے۔

جب ہم تاریخ اور عصر حاضر کے حکومتی نظاموں کا مطالعہ کرتے ہیں مثلاً اسلامی خلافت؛ کمیونزم؛ سوشلزم وغیرہ، تو یہ تمام نظام جہاں ایک واضح عقیدہ اور نظریہ کے دعوے دار ہیں، وہیں ان میں طریقہ انتخاب کے لیے رائے شماری یا کثرت رائے سے انتخاب کی اصطلاحات کا استعمال تو نظر آتا ہے، مگر جمہوریت کی اصطلاح کا، ایک طریقہ انتخاب کے طور پر استعمال، غیر موجود نظر آتا ہے۔ جب کہ اس کے مقابل جمہوریت بھی اکثریتی رائے کو قانون سازی کے واحد معیار حق کے طور پر ماننے کے نظریہ کا علم بردار ہونے کے بعد، رائے شماری یا کثرت رائے سے انتخاب کو، باقی دیگر نظاموں کی طرح، محض اپنا ایک جز قرار دیتا ہے۔

اسلام میں جمہوریت تو نہیں، مگر جمہور کی اصطلاح کا استعمال، عوامی سطح پر معاشرہ میں جاری **عرف کو بیان کرنے** میں یا علمی سطح پر علماء کی اکثریت کا **ایک مسئلہ پر اتفاق** کرنے میں ہوتا ہے، نہ کہ حکومتی نظام یا اس کے کسی جز کے بیان کے طور پر۔

کیا جمہوری نظام کا ووٹ اور اسلامی نظام کی بیعت مترادف ہیں؟

اپنی حقیقت میں ووٹ تو بیعت کی عین ضد ہے، کیونکہ اسلام میں حاکم کی بیعت کا مطلب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے تابع، حاکم وقت کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ امور میں کلی اطاعت کا عہد؛ جبکہ ووٹ کا معنیٰ عوام کی حکمرانی قبول کرکے، حاکم کا خود کو عوام کے نفس کے سپرد کر دینا ہے۔

دوسرے لفظوں میں **بیعت** عوام کی اطاعت کا مظہر ہوتی ہے جبکہ **ووٹ** ان کی حکمرانی کا۔

عصر حاضر کے علماء، جو اس جمہوری نظام کے کلی یا جزوی حق میں ہیں، وہ بھی جمہوری نظام میں ووٹ کو شہادت یا وکالت کے مترادف ٹھہراتے ہیں، نہ کہ اسلامی نظام میں رائج بیعت کے۔ اصل مسئلہ حکومتی نظام کی شرعی حیثیت ہے، نہ کہ ووٹ کی شرعی حیثیت۔ ووٹ تو انفرادی سطح پر عوام کی کسی بھی نظام پر اعتبار اور شمولیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اگر حکومتی نظام کی حیثیت طاغوت کی ہے، تو حفظ دین کی مقاصد شریعت میں اولیت کی وجہ سے، یہ محض اخف الضررین [کمتر برائی] کا مسئلہ نہیں، بلکہ ایسے نظام میں ووٹ طاغوت پرستی کے اقرار کے مترادف ہو سکتا ہے، جو کفر ہے۔

کیا جمہوری طرز حکومت اسلام کے نزدیک زیادہ پسندیدہ نہیں ہے؟

یہ وہ دعوٰی ہے، جس کی بازگشت مختلف سطح پر، اس نظام کے حامی دینی اور لادینی اشخاص کے قول و تحریر میں، بغیر کسی واضح دلیل کے، سنائی دیتی رہتی ہے۔ جمہوریت کی بنیاد اکثریت ہے؛ جبکہ قرآن و حدیث اور آثار صحابہ کا مطالعہ، اس بنیاد کی نفی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن میں بالعموم "ک ث ر" کا مادہ، انسانوں کے ساتھ مذموم اور منفی معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل صرف چند آیات سے واضح ہوتا ہے؛

- ✓ ـــــ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ [سورۃ البقرۃ؛ ۱۰۰] "ـــــ حقیقت یہ ہے کہ ان میں **اکثر** بے ایمان ہیں"
- ✓ ـــــ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ [سورۃ الانعام؛ ۳۷] "ـــــ لیکن **اکثر** لوگ نہیں جانتے"
- ✓ ـــــ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ [سورۃ الانعام؛ ۱۱۱] "ـــــ بات یہ ہے کہ یہ **اکثر** نادان ہیں"
- ✓ وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ـــــ [سورۃ الانعام؛ ۱۱۶] "اور **اکثر** لوگ جو زمین پر آباد ہیں (گمراہ ہیں) اگر تم ان کا کہا مان لوگے تو وہ تمہیں خدا کا رستہ بھلا دیں گے ـــــ"

✓ ۔۔۔۔۔ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَٰكِرِينَ [سورۃ الاعراف؛ ۱۷] "۔۔۔۔۔ تو ان میں **اکثر** کو شکر گزار نہیں پائے گا"۔

اس کے برعکس قرآن کی مندرجہ ذیل دو آیات جن میں مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں مشورہ کی اہمیت کا ذکر ہے؛

✓ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ [سورۃ الشوری؛ ۳۸] "اور جو اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ اور اپنے کام **آپس کے مشورے** سے کرتے ہیں۔ اور جو مال ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔

✓ ۔۔۔۔۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ [سورۃ آل عمران؛ ۱۵۹] "۔۔۔۔۔ تو ان کو معاف کر دو اور ان کے لئے [خدا سے] مغفرت مانگو۔ اور اپنے کاموں میں **ان سے مشاورت** لیا کرو۔ اور جب [کسی کام کا] عزم مصمم کر لو تو خدا پر بھروسا رکھو۔ بے شک خدا بھروسا رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

ان آیات کے اور مندرجہ ذیل واقعات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے، کہ دین میں مشورہ کی حیثیت صرف اضافی ہے، جبکہ جمہوریت میں رائے شماری کی حیثیت، شرط کے طور پر ہے نہ کہ فقط اضافی۔

*رسول اللہ ﷺ کا غزوہ احد کے دن اکثریت کے اصرار کے باوجود فیصلہ بدلنے سے انکار۔ *خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا انتخاب جن میں سے کسی ایک کے انتخاب کا طریقہ بھی مروجہ جمہوریت کے انداز پر پورا نہیں اترتا۔ *حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا اکثریتی فیصلہ کے باوجود معانین زکوۃ کے خلاف جہاد کا فیصلہ۔ *حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اکثریتی رائے کے خلاف عراق کی مفتوح زمینوں کے متعلق فیصلہ۔ *حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خلافت چھوڑنے سے انکار وغیرہ۔

اسلام میں طرز حکومت کی پسندیدگی کا واحد معیار مندرجہ ذیل حدیث میں انتہائی واضح ہے؛

✓ حضرت ام حصین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا اگر تم پر حبشی نکٹا غلام امیر مقرر کر دیا جائے تو اس کی بات سنو اور مانو جب تک وہ **اللہ کی کتاب کے مطابق تمہاری قیادت کرے**۔ [سنن ابن ماجہ۔ جلد دوم۔ جہاد کا بیان۔ حدیث ۱۰۲۱]

اگر جمہوریت سے مراد، اسلام میں اہل حل و عقد [عوام کے نظم ونسق چلانے والے] کا باہم مشورہ اور اکثریتی رائے سے حاکم کا انتخاب ہے، تو یہ عمل اسلام میں نہ صرف پسندیدہ بلکہ مطلوب ہے مگر اسلامی سیاست میں اس عمل کو کبھی بھی جمہوریت کی اصطلاح سے مخاطب نہیں کیا گیا اور نہ ہی حکمرانی قائم ہونے کی شرط کے طور پر اس کا ذکر ہے اور نہ ہی مروجہ جمہوریت کے حامی اس محدود آزادی کے علم بردار ہیں۔

کیا لبرل مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت بنایا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا مکمل جواب مولانا سمیع اللہ سعدی کی تصنیف "اسلامی جمہوریت کا فلسفہ" سے انتہائی اختصار کے ساتھ ماخوذ ہے۔ جو قارئین ان کی مکمل تصنیف کے مطالعہ کے متقاضی ہیں وہ ماہنامہ الشریعہ کے دسمبر ۲۰۱۳ اور جنوری ۲۰۱۴ کے شمارے کا مطالعہ فرمائیں۔

لبرل مغربی جمہوریت کی اسلام کاری پر بحث کے لئے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے، کہ لبرل مغربی جمہوریت کے بنیادی اصولوں اور اسلامی تعلیمات میں کتنا تضاد ہے اور کتنی ہم آہنگی؟ اگر جمہوریت کے سارے یا اکثر اصول اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں، تو محض ایک یا دو چیزوں میں ترمیم کرنے سے لبرل جمہوریت اسلامی نہیں بن سکتی؛ کیونکہ یہ اصول ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی کا آمیزہ، غیر اسلامی ہی کہلاتا ہے؛ اسی کو علمی اصطلاح میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے، کہ کسی چیز کا اسلامی ہونا "**موجبہ کلیہ**" [تمام جز کا اثبات یا موجود ہونا] ہے، جبکہ غیر اسلامی ہونا "**سالبہ جزئیہ**" [کسی جز کا انکار یا غیر موجود ہونا] ہے۔

لبرل مغربی جمہوریت کے چند بنیادی خدوخال اور اصول مندرجہ ذیل ہیں؛

أ. عوام کی حاکمیت۔
ب. پارلیمنٹ کے لامحدود اختیارات۔
ت. آئین و دستور کی بالادستی اور تقدس۔
ث. بالغ رائے دہی کا تصور اور سیاسی مساوات۔
ج. کثرت رائے کا تصور۔
ح. سیاسی جماعتوں اور حزب اختلاف کا تصور۔
خ. مساوات اور آزادی۔

د. اختیارات کی تقسیم اور حکومت کی مدت۔

أ. عوام کی حاکمیت

عوام کی کلی حاکمیت اور خود مختاری کا اصول اسلامی تعلیمات سے کلی طور پر متصادم ہے۔ اس لئے مغربی جمہوریت کی اسلام کاری کرتے وقت عوام کی جزوی وکلی حاکمیت کے تصور کی بیخ کنی کرنی ہو گی اور ایسی ترمیم کرنی ہو گی کہ حکمران عوامی نمائندہ ہونے کی بجائے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نمائندہ ہو اور عوامی خواہشات کی بجائے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا اور خوشی کو مد نظر رکھے۔

ب. پارلیمنٹ کے لامحدود اختیارات

یہ اصول بھی شریعت سے متصادم اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ اسلامی ریاست میں قانون سازی صرف مباحات اور انتظامی امور میں ہوتی ہے؛ مسائل منصوصہ اور متفق علیہا مسائل بلا ترمیم و تبدیلی کے لاگو ہوتے ہیں؛ البتہ مسائل اجتہادیہ میں اہل اجتہاد اور اسلامی امور کے ماہرین یعنی فقہا اور علماء حالات کے مطابق مخصوص حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کر سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی جمہوریت میں پارلیمنٹ سے متعلق دو باتیں طے کرنی ہوں گی؛

- پارلیمنٹ کے اختیارات کے حدود و قیود طے کرنا؛
- پارلیمنٹ کے ممبر بننے کے لئے مخصوص شرائط لگانا؛

ت. آئین و دستور کی بالا دستی اور تقدس

آئین و دستور کی بالا دستی اور تقدس کا اصول بھی شریعت کے منافی ہے؛ قرآن و حدیث کے مطابق ہر صورت میں بالا دستی صرف اور صرف اللہ کی نازل کردہ شریعت اور دین اسلام کی ہے۔

ث. بالغ رائے دہی کا تصور اور سیاسی مساوات

اسلامی تعلیمات کی رو سے انتخابِ امیر میں مشورہ ضروری ہے، البتہ اسلامی سیاست پر لکھنے والے تقریباً تمام مفکرین کا اتفاق ہے، کہ مشورہ ہر فرد سے لینے کی بجائے، صرف اہل حل و عقد [عوام کے نظم و نسق چلانے والے] سے لیا جائے۔

جمہوریت کی اسلام کاری میں اس اصول میں مندرجہ ذیل ترمیمات کرنی ہوں گی؛

- انتخاب امیر کا حق صرف اہل حل وعقد کو ہو گا؛ ملک کا ہر شخص اس میں حصہ دار نہیں ہو گا۔
- اہل حل وعقد صرف مشورہ اور رائے کا فریضہ سرانجام دیں گے؛ اس کام پر نہ تو ان کو معاوضہ دیا جائے گا اور نہ وہ اکثریت کے بل بوتے پر حکومت پر اثرانداز ہوں گے۔
- ایک مرتبہ جب اہل حل وعقد متعین ہو جائے، تو مختلف عوامل کی بنیاد پر اس میں کمی بیشی تو ہو گی، لیکن یہ اصول درست نہیں ہو گا، کہ ایک مخصوص مدت تک تو وہ اہل حل وعقد ہوں، ان کی عقل وفہم مسلم ہو، پھر دوسری مدت میں ان کی عقل مندی کالعدم ہو جائے اور نئے اہل حل وعقد کی تلاش شروع ہو جائے۔

ج. کثرت رائے کا تصور

لبرل جمہوریت کی اسلام کاری کرتے وقت اس اصول میں یہ ترمیمات کرنی ہوں گی؛

- مسائل منصوصہ اور متفقہ مسائل میں کثرت رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا۔
- مسائل اجتہادیہ اور انتظامی امور میں کثرت رائے کا اعتبار کیا جائے گا؛ البتہ حالات اور دلائل کے اعتبار سے اقلیت کی رائے بھی اختیار کی جاسکے گی۔
- کثرت رائے کو ماننا قانوناً لازمی اور حتمی نہیں ہو گا۔

ح. سیاسی جماعتوں اور حزب اختلاف کا تصور

اسلامی نکتہ نظر سے ایک اسلامی ریاست میں مختلف بنیادوں پر سیاسی جماعتیں بنانے مثلاً نسلی، علاقائی، لسانی، ثقافتی، اور نظریاتی اعتبارات سے سیاسی جماعتیں بنانا اسلامی تعلیمات اور مقاصد شریعت سے مختلف وجوہ سے ہم آہنگ نہیں ہے؛

- مسلمان بحیثیت امت، ایک گروہ اور جماعت شمار ہوتے ہیں اور اِن بنیادوں پر سیاسی جماعتیں بنانا، اتحاد امت کو پارہ پارہ کر دیتی ہے، جبکہ امت کا اتحاد و اتفاق برقرار رکھنا، شریعت کے عظیم مقاصد میں سے ہے۔

- مختلف بنیادوں پر سیاسی جماعتوں کی وجہ سے عصبیت اور قومیت کے جذبات ابھرتے ہیں اور اسلام اس عصبیت، رنگ و نسل کے اعتبار سے تفریق اور رنگ و نسل کی بنیاد پر گروہ بندی کا شدت کے ساتھ رد کرتا ہے۔
- سیاسی جماعتوں میں عام طور پر جذبہ رقابت کی بنیاد پر نفرت اور ایک دوسرے سے بغض و عناد ہوتا ہے۔
- ہر سیاسی جماعت کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طریقے سے اقتدار تک پہنچ جائے، توبسا اوقات کچھ جماعتیں اس مقصد کے حصول کی خاطر کفریہ طاقتوں اور عالمی استعمار کی آلہ کار بھی بن جاتی ہیں۔
- ہماری پوری اسلامی تاریخ اس قسم کی سیاسی جماعتوں کے وجود سے خالی ہے اور اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب بھی کسی چیز کے مقاصد شریعت سے ہم آہنگ ہونے یا نہ ہونے پر واضح قرینہ ہے۔

کیا اسلامی تعلیمات میں حزب اختلاف کا تصور ہے؟

- امیر اور خلیفہ کی اطاعت اور اسلامی ریاست میں انارکی نہ پھیلانا شریعت کے بڑے مقاصد میں سے ہے؛ جبکہ حزب اختلاف کا تصور ان مقاصد کے حصول میں رکاوٹ ہے۔
- حزب اختلاف کی وجہ سے معاشرہ ہمیشہ اپنے حکمرانوں سے شاکی رہتا ہے اور پورے معاشرہ میں بے یقینی کی کیفیت سی رہتی ہے۔
- اسلام میں حزب اختلاف کا نعم البدل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صورت میں موجود ہے؛ اور سلطان جائر کے سامنے کلمہ حق کہنا شریعت کی رو سے افضل جہاد ہے۔

خ. مساوات اور آزادی

جمہوریت کی اسلام کاری میں اس اصول میں درج ذیل ترمیمات کرنی ہوں گی؛

- اسلام انسانوں کو مومن اور کافر دو بڑے گروہوں میں تقسیم کرتا ہے، اس لیے جمہوریت کی اسلام کاری میں ریاست کی نظر میں تمام مذاہب برابر نہیں ہوں گے، بلکہ اسلامی اقدار کا

فروغ اور غیر اسلامی تہذیب وثقافت سے اسلامی معاشرے کو پاک کرنا ریاست کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہو گا۔

- دوسرے مذاہب والوں کو انفرادی طور پر تو اپنے مذہب پر عمل کی مکمل اجازت ہو گی؛ لیکن اپنے مذہب کی تشہیر، تبلیغ اور معاشرے میں اپنی ثقافت کی ترویج ممنوع ہو گی۔
- اسلام مرد وزن میں مساوات کے بجائے حفظ مراتب اور دائرہ کار کی تقسیم پر زور دیتا ہے اس لیے اسلامی جمہوریت میں عورتوں کے لیے ایسے مناصب قطعاً ممنوع ہوں گے جو شریعت کی رو سے صرف مرد کے ساتھ خاص ہیں۔
- لبرل مغربی جمہوریت میں ملکی باشندے ہر فعل، قول، نظریہ اور رائے کے اظہار میں مکمل آزاد ہوتے ہیں؛ مکمل آزادی اسلامی تعلیمات سے کسی طرح سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔

د. اختیارات کی تقسیم اور حکومت کی مدت

اگر مقاصد شریعت کی روشنی میں حکومت کی مدت کے مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں؛

- جب ایک امیر اصولوں کے مطابق نظام حکومت چلا رہا ہو، تو صرف مخصوص مدت کے گزرنے پر اسے معزول کرنا محل نظر [نقطہ اختلاف] ہے۔
- حکومت کی مدت مقرر کرنے میں یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے، کہ ملک کے سرکردہ افراد میں کسی نہ کسی حوالے سے حکومت کے اہل اشخاص کے درمیان اندرون خانہ رسہ کشی اور سرد جنگ جاری رہتی ہے۔

مولانا سمیع اللہ سعدی ﷾ کے اس تفصیلی کام پر اللہ سبحان وتعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، مگر تعجب تو ان اہل حل وعقد اور قانون ساز اراکین پر ہو گا جو ان کی تجاویز پر عمل کرنے کی تکلیف بھی گوارا کریں اور پھر بھی اس تبدیل شدہ اور اسلامی نظام کو جمہوریت کی اصطلاح کے تابع رکھنے پر اصرار کریں۔

اسلامی جمہوری نظام میں قانون سازی کا دائرہ شریعت کے پابند ہونے سے کیا مراد ہے؟

اسلامی جمہوری نظام میں دائرہ شریعت کی پابند قانون سازی ایک مبہم اصطلاح ہے، جس کے مندرجہ ذیل معنی ہوسکتے ہیں؛

- عوامی نمائندے عوامی رائے کی روشنی میں نصوص شریعہ کی تعبیر کریں گے۔
- عوام کی مرضی کے مطابق قانون سازی، صرف ان معاملات میں کی جائے گی، جہاں شریعت خاموش ہے۔ یہ اصول اس مفروضے پر قائم ہے، کہ اسلامی ریاست صرف "قرآن وسنت کے خلاف فیصلہ "نہ کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ جبکہ اصل معاملہ یہ کہ اسلامی ریاست ہر فیصلہ قرآن وسنت اور اسلامی علمیت کی روشنی میں "کرنے" کی پابند ہوتی ہیں۔ کسی واضح نص کے نہ ہونے کا مطلب، یہ کس اصول شریعہ سے نکل آیا، کہ ان معاملات میں "مقاصد شریعت" سے قطع نظر ہو کر "عوامی خواہشات" کے مطابق فیصلے کیے جائیں گے؟

یہ تو اب اپنے اپنے جمہوری نظام میں قانون سازی کرنے والوں کا ہی کام ہے، کہ وہ آئین میں اس بات کی مکمل تشریح کریں، کہ اس مبہم اصطلاح سے "کون سے" معنی مراد ہیں۔ کم از کم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اسلامی آئین میں "دائرہ شریعت کی پابند قانون سازی" سے کیا مراد ہے، اس کا اندازہ قارئین کو اس کتاب میں موجود مضمون "آئین پاکستان کی حقیقت" کے مطالعہ سے بخوبی ہو جائے گا۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

آئین پاکستان کی حقیقت

یہ مضمون خالصتاً پاکستان میں نافذ اسلامی جمہوریت کے فقط ایک جز "اسلامی آئین" کے متعلق ہے، کیونکہ مذہبی جماعتوں ہی کی بات نہیں، لادین جماعتیں بھی تو اسی آئین کی حکمرانی چاہتیں ہیں؛ یہاں مقبول عام مطالبہ یہی تو رہا ہے، کہ آئین کو اس کی اصل "روح" کے ساتھ نافذ کر دیا جائے؛ مگر یہ "روح" ایک غیر مرئی چیز ہے، جو نظر آئے بھی، تو ہر کسی کو دوسرے سے مختلف نظر آتی ہے۔ آئین کی اس "روح" پر بھلا کب اتفاق ہو گا؟ اس آئین کی یہی تو خوبی ہے، کہ ہر آدمی اسے جیسا دیکھنا چاہتا ہے یہ اسے ویسا ہی نظر آتا ہے۔

کیا قرارداد مقاصد کی پاکستان کے آئین میں موجودگی آئین کے اسلامی ہونے کے لیے کافی ہے؟

سوال یہ نہیں ہے، کہ آئین کی قرارداد مقاصد میں اللہ کے لئے "**حاکم اعلٰی**" کا لفظ بولا جاتا ہے، یا اس کے ننانوے ناموں میں سے کس کس نام کا ورد کیا جاتا ہے؟ سوال بہت واضح اور مختصر ہے "**یہاں اللہ کی چلتی ہے یا کسی اور کی؟**"

اللہ کی توحید کے قولی اور عملی اقرار کے ساتھ ساتھ دین کے احکام پر عمل کی نیت چونکہ ایمان میں شامل ہے اور دنیا میں اس نیت کی موجودگی اور غیر موجودگی کا انحصار فقط انسان کے قول پر ہے؛ اور چونکہ آئین پاکستان ایک تحریری دستاویز ہے، تو اسی نظریہ کے تحت ہم پاکستان کے اسلامی آئین کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا دین پر **عمل کی نیت تحریری طور پر قرارداد مقاصد میں اللہ کے لئے "حاکم اعلٰی" کے تحریری اقرار کے ساتھ** موجود ہے یا نہیں۔ اگر تحریری طور پر "**حاکم اعلٰی**" کے اقرار کے ساتھ عمل کی نیت تحریری طور پر بھی موجود ہے، تو کم از کم نظریاتی طور پر ملک میں رائج حکومتی نظام کو اسلامی جمہوری نظام کہلانے کا دعوٰی، حق ثابت ہو جائے گا۔

کیاپاکستان کے "اسلامی آئین" میں لبرل مغربی جمہوریت کے کچھ خصائص موجود ہیں؟

جیسا کہ بیان کیاجاچکا کہ کسی چیز کا اسلامی ہونا "موجبہ کلیہ" [تمام جز کا اثبات یا موجود ہونا] ہے، جبکہ غیر اسلامی ہونا "سالبہ جزئیہ" [کسی جز کا انکار یا غیر موجود ہونا] ہے، تو اس سوال کے جواب میں تو کوئی ایک مماثلت بھی اکتفا کر جاتی، مگر بات کو واضح کرنے کے لیے مندرجہ ذیل چند مماثلتیں پیش کی جارہی ہیں۔

لبرل مغربی جمہوریت کے اصول "مساوات اور آزادی" سے ہم آہنگ؛

- جس میں قرار واقعی انتظام کیاجائے گا کہ اقلیتیں آزادی سے اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔ [آئین پاکستان؛ تمہید؛ صفحہ نمبر ۱]
- ہر شہری کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق ہو گا؛ اور۔۔۔[آئین پاکستان؛ حصہ دوئم؛ بنیادی حقوق اور حکمت عملی کے اصول؛ باب ۔۱۔ بنیادی حقوق؛ ۲۰۔ الف؛ صفحہ نمبر ۱۲]

لبرل مغربی جمہوریت کے اصول "آئین و دستور کی بالادستی اور تقدس" سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے قرآن و سنت کی قید سے آزاد دستور کی غیر مشروط اطاعت اور اس کے تحفظ اور دفاع کا عہد۔

- دستور اور قانون کی اطاعت ہر شہری خواہ وہ کہیں بھی ہو اور ہر اس شخص کی جو فی الوقت پاکستان میں ہو واجب تعمیل ذمہ داری ہے۔ [آئین پاکستان؛ حصہ اول، ابتدائیہ؛ ۵۔۲؛ صفحہ نمبر ۴]
- عہدہ سنبھالنے سے قبل، چیف جسٹس پاکستان، صدر کے سامنے، اور عدالت عظمیٰ کا کوئی دوسرا جج چیف جسٹس کے سامنے، اس عبارت میں حلف اٹھائے گا جو جدول سوم میں درج کی گئی ہے۔ [آئین پاکستان؛ حصہ ہفتم؛ نظام عدالت؛ باب ۲؛ پاکستان کی عدالت عظمیٰ؛ ۱۷۸؛ صفحہ نمبر ۱۰۵]

جدول سوم۔ حلف کی عبارت

۔۔۔۔۔۔۔۔ کہ بحیثیت چیف جسٹس پاکستان میں اپنے فرائض و کارہائے منصبی ایمانداری، اپنی انتہائی صلاحیت اور وفاداری کے ساتھ، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور اور قانون کے مطابق انجام دوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کو برقرار رکھوں گا اور اس کا تحفظ اور دفاع کروں گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

صدر ؛ وزیر اعظم؛ وفاقی وزیر یا وزیر مملکت؛ قومی اسمبلی کا اسپیکر
یا سینٹ کا چیئرمین ؛ قومی اسمبلی کا ڈپٹی اسپیکر یا سینٹ کا ڈپٹی
چیئرمین ؛ قومی اسمبلی کا رکن یا سینٹ کا رکن ؛ صوبے کا گورنر ؛
وزیر اعلیٰ یا صوبائی وزیر ؛ کسی صوبائی اسمبلی کا اسپیکر ؛ کسی صوبائی
اسمبلی کا ڈپٹی اسپیکر ؛ کسی صوبائی اسمبلی کا رکن ؛ وفاقی شرعی
عدالت کا چیف جسٹس یا جج کے حلف میں موجود ایک عبارت۔

جدول سوم۔ حلف کی عبارت

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کو برقرار رکھوں گا اور اس کا تحفظ اور دفاع کروں گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دستور کے حامی حضرات اس مرحلہ پر یہ اعتراض کر سکتے ہیں، کہ چونکہ پاکستان کا دستور اسلامی ہے، تو اس پر مزید قرآن و سنت کی تحریری قید اضافی اور غیر ضروری ہے۔ یہ اعتراض صرف اسی صورت میں بجا ہوتا اگر [نعوذ باللہ من ذالک] اس کو تحریر کرنے والوں کے نزدیک پاکستان کا اسلامی دستور اپنے مضامین اور مفاہیم و محاسن [مطالب اور خوبیاں] میں قرآن و سنت سے زیادہ جامع اور اکمل ہوتا، جبکہ محض یہ سوچ بھی کفر ہے۔

لبرل مغربی جمہوریت کے اصول "پارلیمنٹ کے لا محدود اختیارات" سے ہم آہنگ؛ تابوت میں ایک نہیں دو آخری دو کیل؛

- دستور میں کسی ترمیم پر کسی عدالت میں کسی بناء پر چاہے جو کچھ ہو **کوئی اعتراض نہیں کیا جائے گا**۔ [آئین پاکستان؛ حصہ یازدہم؛ دستور کی ترمیم؛ ۲۳۹۔۵؛ صفحہ نمبر ۱۵۸]
- ازالہ شک کے لئے، بذریعہ ہذا قرار دیا جاتا ہے کہ دستور کے احکام میں سے کسی ترمیم کرنے کے مجلس شوریٰ [پارلیمنٹ] کے **اختیار پر کسی بھی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے**۔ [آئین پاکستان؛ حصہ یازدہم؛ دستور کی ترمیم؛ ۲۳۹۔۶؛ صفحہ نمبر ۱۵۸]

کیاوفاقی شرعی عدالت "آئین" یا "قوانین" میں غیر اسلامی شقوں کے خاتمے کے لیے مؤثر ادارہ نہیں ہے؟

وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار، قانون سازی نہیں، بلکہ آئین اور قانون میں موجود شقوں کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کے متعلق فیصلہ کرنا ہے۔ تو اس سوال کے جواب سے قارئین کو اس اسلامی آئین کا دین کے احکامات پر عمل کرنے کی نیت کا احساس شروع ہو گا؛ جس کے شروع میں ہی علی اعلان تحریر کر دیا گیا کہ ہم دین کی کچھ باتوں کو مانیں گے اور کچھ کو نہیں۔

- " قانون" میں کوئی رسم ورواج شامل ہے جو قانون کا اثر رکھتا ہو **مگر اس میں** دستور، مسلم شخصی قانون، کسی عدالت یا ٹریبیونل کے ضابطہ کار سے متعلق کوئی قانون یا، اس بات کے آغاز نفاذ سے [دس] سال کی مدت گزرنے تک، کوئی مالی قانون یا محصولات یا فیسوں کے عائد کرنے اور جمع کرنے یا بنکاری یا بیمہ کے عمل اور طریقہ سے متعلق کوئی قانون **شامل نہیں ہے**؛ اور۔۔۔۔۔۔۔[آئین پاکستان؛ حصہ ہفتم؛ نظام عدالت؛ باب ۳ الف؛ وفاقی شرعی عدالت؛ ۲۰۳ ب۔ ج؛ صفحہ نمبر ۱۱۹]

اوپر درج کی گئیں "محرمات" کے بعد اگر کوئی "قانون" یا " قانون کا حکم" وفاقی شرعی عدالت خدانخواستہ اسلام کے منافی قرار دے ہی دے تو یہ واحد عدالت ہے جس کے فیصلے پر مندرجہ ذیل چار قدغن [روک ٹوک، ممانعت، مناہی، پابندی، بندش] ہیں۔

اگر عدالت فیصلہ کرے کہ کوئی قانون یا قانون کا حکم اسلامی احکام کی منافی ہے تو وہ اپنے فیصلے میں حسب ذیل بیان کرے گی:۔

[الف] اس کے مذکورہ رائے قائم کرنے کی وجوہ؛ اور

[ب] وہ حد جس تک وہ قانون یا حکم بایں طور پر منافی ہے؛

اور اس تاریخ کی صراحت کریگی جس پر وہ فیصلہ مؤثر ہو گا؛

مگر شرط یہ ہے کہ ایسا کوئی فیصلہ، **اس میعاد کے گزرنے سے پہلے** جس کے اندر عدالت عظمیٰ میں اس کیخلاف اپیل داخل ہو سکتی ہو یا جبکہ اپیل بایں طور پر داخل کر دی گئی ہو تو اس **اپیل کے فیصلہ سے پہلے مؤثر نہیں ہو گا**۔
[آئین پاکستان؛ حصہ ہفتم؛ نظام عدالت؛ باب ۳ الف؛ وفاقی شرعی عدالت؛ ۲۰۳ د۔ ۲؛ صفحہ نمبر ۱۲۲]

اللہ تعالی کا فرمان ہے ؛

- ✓ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا [سورة النساء؛٦٥] تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور **جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں** بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

اور گو اس ادارہ کی حیثیت اس آئین کے علم برداروں کے نزدیک ملک میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نائب کی سی ہے اور تمام دلائل اور مباحث کے بعد اس کے فیصلے یا فتویٰ کی حیثیت اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے برابر ہے؛ تو پھر اب اگر کوئی" قانون "یا" قانون کا حکم "خالصتاً اپنی بد بختی کی وجہ سے اوپر والی شق کے مطابق، پھر بھی اسلام کے منافی قرار پا ہی گیا؛ تو اسی عدالت کے لیے ایک اور طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ اس بات کو بھی یقینی بنائے کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ خوش ہوں یا نہ ہوں ؛ مذکورہ کاروائی میں ملوث فریق، اس کے فیصلہ سے ضرور خوش ہو کر لوٹیں، ورنہ اس کے فیصلہ کو سرد خانہ کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ [انا للہ و انا الیہ راجعون]

- آرٹیکل ۲۰۳ د کے تحت عدالت کے سامنے کسی کاروائی کا کوئی فریق جو مذکورہ کاروائی میں **عدالت کے قطعی فیصلہ سے ناراض ہو**، مذکورہ فیصلے سے ساٹھ یوم کے اندر عدالت عظمٰی میں اپیل داخل کر سکے گا۔

[مگر شرط یہ کہ وفاق یا کسی صوبے کی طرف سے اپیل مذکورہ فیصلے سے چھ ماہ کے اندر داخل کی جا سکے گی۔]۔

[آئین پاکستان؛ حصہ ہفتم؛ نظام عدالت؛ باب ۳ الف؛ وفاقی شرعی عدالت؛ ۲۰۳ و۔ ا؛ صفحہ نمبر ۱۲۵]

مزید قرآن کا فتوی ہے کہ

- ✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا [سورة النساء؛ ۵۹] مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم

میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

مگر ہمارے محبوب اسلامی آئین میں اس کو بھی یقینی رکھا کہ وفاقی شرعی عدالت کے قرآن اور احادیث کی بنیاد پر فیصلوں پر، اللہ اور رسول ﷺ کے بجائے، اسلامی دستور کی سربلندی کی علم بردار عدالت عظمیٰ کا حکم، قول فیصل رکھتا ہو [انا للہ و انا الیہ راجعون] ، تاکہ کہیں وفاقی شرعی عدالت کی اسلام کی تعبیر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے "اسلامی آئین" کی حدود سے باہر نہ نکل جائے۔

- اس آرٹیکل کے تابع، عدالت عظمیٰ کو کسی عدالت عالیہ کے صادر کردہ فیصلوں، ڈگریوں، حتمی سزاؤں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرنے اور ان پر فیصلہ صادر کرنے کا اختیار ہو گا۔ [آئین پاکستان؛ حصہ ہفتم؛ نظام عدالت؛ باب ۲؛ پاکستان کی عدالت عظمیٰ؛ ۱۸۵۔۱؛ صفحہ نمبر ۱۰۷]

کیا اسلامی احکام کا نفاذ آئین کے "حصہ نہم" کے مطابق حکومت کی آئینی ذمہ داری نہیں ہے؟

یہ سوال اس معمہ کا دوسرا حصہ ہے جس کے پہلے حصہ کا جواب قارئین سوال نمبر تین کے جواب میں مطالعہ کر چکے اور اس سوال کے جواب میں قارئین کو اس اسلامی آئین کی دین کے احکامات پر عمل کی نیت کا مکمل احساس ہو جانا چاہیے؛

- تمام موجودہ قوانین کو قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا۔۔۔۔ [آئین پاکستان؛ حصہ نہم؛ اسلامی احکام؛ ۲۲۷۔۱؛ صفحہ نمبر ۱۴۵]

مندرجہ بالا شق وہ مشہور زمانہ شق ہے جو قرارداد مقاصد کے ساتھ پیش کر کے اس آئین کے اسلامی ہونے کے ڈھنڈورا پیٹنے میں ہر سطح پر استعمال ہوتی ہے۔ جب کہ اس شق کی پہلی بیڑی اسی صفحہ پر اسی کے نیچے تحریر ہے۔

- شق [۱] کے احکام کو صرف اس طریقہ کے مطابق نافذ کیا جائے گا جو اس حصہ میں منضبط ہے۔ [آئین پاکستان؛ حصہ نہم؛ اسلامی احکام؛ ۲۲۷۔۲؛ صفحہ نمبر ۱۴۵]

یہ تمام طریقے چونکہ اسلامی نظریاتی کونسل کے ذریعے نافذ عمل ہوں گے، تو چلیں مطالعہ کرتے ہیں کہ وہ کون کون سے "عملی" طریقے ہیں جو اس باب کی شق [ا] کے نفاذ کے لیے اس باب میں منضبط [باضابطہ، باوقار، مرتب، طے شدہ، ضابطے میں لایا ہوا] کیے گیے ہیں۔

پہلا طریقہ؛

- صدر یا کسی صوبے کا گورنر، **اگر چاہے** یا اگر کسی ایوان یا کسی صوبائی اسمبلی کی کل رکنیت کا دو بٹا پانچ حصہ **یہ مطالبہ کرے** تو کسی سوال پر اسلامی کونسل سے **مشورہ کیا جائے گا** کہ آیا کوئی مجوزہ قانون اسلام کے احکام کے منافی ہے یا نہیں۔ [آئین پاکستان؛ حصہ نہم؛ اسلامی احکام؛ ۲۲۹؛ صفحہ نمبر ۱۴۶]

دوسرا طریقہ؛

- ایسی تدابیر کی جن سے نافذ العمل قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا نیز ان مراحل کی جن سے گزر کر محولہ تدابیر کا نفاذ عمل میں لانا چاہیے **سفارش کرنا**۔ [آئین پاکستان؛ حصہ نہم؛ اسلامی احکام؛ ۲۳۰-ا؛ ج؛ صفحہ نمبر ۱۴۷]

تیسرا طریقہ؛

- مجلس شوری اور صوبائی اسمبلیوں کی **رہنمائی کے لئے** اسلام کے ایسے احکام کی ایک موزوں شکل میں تدوین کرنا جنہیں قانونی طور پر نافذ کیا جا سکے۔ [آئین پاکستان؛ حصہ نہم؛ اسلامی احکام؛ ۲۳۰-ا؛ د؛ صفحہ نمبر ۱۴۷]

اگرچہ یہ تینوں طریقے اپنی افادیت اور اثر انگیزی کے حساب سے انتہائی کمزور اور بودے تھے مگر سونے پر سہاگہ اسی اسلامی احکام کے باب میں مندرجہ ذیل شق بھی شامل ہے؛

- جب کوئی ایوان، کوئی صوبائی اسمبلی، صدر یا گورنر، جیسی بھی صورت ہو، یہ خیال کرے کہ مفاد عامہ کی خاطر اس مجوزہ قانون کا وضع کرنا جس کے بارے میں سوال اٹھایا گیا تھا **مشورہ حاصل ہونے تک ملتوی نہ کیا** جائے، تو اس صورت میں مذکورہ قانون مشورہ مہیا ہونے سے قبل وضع کیا جا سکے گا؛

  مگر شرط یہ ہے کی جب کوئی قانون اسلامی کونسل کے پاس مشورے کے لئے بھیجا جائے اور کونسل یہ مشورہ دے کہ **قانون اسلامی احکام کے منافی ہے** تو ایوان، یا جیسی بھی صورت ہو، صوبائی اسمبلی، صدر یا گورنر

اس طرح **وضع کردہ قانون پر دوبارہ غور کرے گا۔** [آئین پاکستان؛حصہ نہم؛اسلامی احکام؛۲۳۰۔۳؛ صفحہ نمبر ۱۴۷]

اس باب کی تمام شقوں کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ [افسوس صد افسوس] قانون وضع کرنے کے لیے تو مفاد عامہ کا جواز بھی بہت ہے مگر اس کے کالعدم ہونے کے لیے قرآن وحدیث کے دلائل کو یہ حیثیت بھی حاصل نہیں ہے۔

شق [۱] کو عملی شکل میں لانے کا عمل تو اس باب میں "**مشورہ**"؛"**سفارش**" اور "**رہنمائی**" سے آگے بڑھتا ہی نہیں ہے اور جمہوریت پسند دینی طبقہ کی، کسی بھی ان تھک محنت کا نتیجہ، محض اس غیر اسلامی وضع کردہ قانون پر غور کرنے کے ایک غیر مرئی وعدہ کی صورت میں ہے۔ [انا للہ وانا الیہ راجعون]

اس موضوع کے خاتمہ سے پہلے، مندرجہ ذیل دو شقوں کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے کافی ہو گا، جو اب بھی کسی ذہنی مخمصہ کا شکار ہیں؛ یہ دونوں شقیں تمام غیر اسلامی آئینی شقوں اور قوانین کو دوام بخشنے کی لیے پاکستان کے اسلامی آئین میں بدرجہ اتم موجود ہیں؛

- شق [۱] کے تحت صادر شدہ کوئی فرمان بغیر کسی غیر ضروری تاخیر کے دونوں ایوانوں کے سامنے پیش کیا جائے گا، اور **اس وقت تک نافذ العمل رہے گا** جب تک کہ ہر ایوان اسے نامنظور کرنے کی قرارداد منظور نہیں کرتا یا دونوں ایوانوں میں اختلاف کی صورت میں اس وقت تک جب تک ایسی قرارداد مشترکہ اجلاس میں منظور نہ ہو جائے۔ [آئین پاکستان؛حصہ دوازدہم؛متفرقات؛باب ۷؛عبوری؛۲۶۷۔۲؛صفحہ نمبر ۱۷۷]
- بجز جیسا کہ اس آرٹیکل میں قرار دیا گیا ہے، تمام موجودہ قوانین، اس دستور کے تابع، جس حد تک قابل اطلاق ہوں اور ضروری تطبیق کے ساتھ اس وقت تک **بدستور نافذ رہیں گے** جب تک متعلقہ مقنّنہ [قانون ساز اسمبلی] انہیں تبدیل یا منسوخ نہ کر دی یا ان میں ترمیم نہ کرے۔ [آئین پاکستان؛حصہ دوازدہم؛متفرقات؛باب ۷؛عبوری؛۲۶۸۔۱؛صفحہ نمبر ۱۷۸]

کیا۱۹۷۳ء کے اسلامی آئین کو ہمارے دینی طبقہ کی حمایت حاصل نہیں ہے ؟

یقیناً ۱۹۷۳ء کی اسلامی آئین کی منظوری میں پاکستان کے ہر مکتب فکر کے جید علماء مثلاً مولانا شاہ احمد نورانی؛ مولانا غلام غوث ہزاروی؛ مولانا عبد الحکیم؛ مفتی محمود صاحب؛ مولانا ظفر احمد انصاری؛ مولانا عبد الحق وغیرہ کی کوششیں شامل ہیں؛ اور اسی وجہ سے آج تک ہمارے عوام و خواص کی اکثریت، دلیل کی بنیاد پر نہیں بلکہ تقلید کی بنا پر، اس نظام سے کراہت محسوس نہیں کرتی۔ مگر ایک عالم اور غیر عالم کے مؤقف میں فرق محض عالم کے مؤقف کے پیچھے قرآن اور حدیث کے دلائل کی طاقت ہے؛ جس طاقت کی تلاش میں راقم تا حال مصروف تفتیش ہے اور اسی تفتیش نے ان چار مضامین کی شکل اختیار کر لی ہے، جن کے تحت چار مختلف جہتوں سے اس نظام حکومت کا طاغوت کے مترادف ہونا ثابت ہوتا ہے۔

کسی بھی تحریری مؤقف کی عدم موجودگی میں؛ حسن ظن کی بنیاد پر میرا پختہ یقین ہے، اس نظام کے حامی کسی بھی ماضی کے جید عالم کی؛ اس نظام میں شمولیت کسی قسم کی ذاتی و نفسانی خواہشات کا حصول نہیں، بلکہ اس امت کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش تھی اور وہ اپنے اس اجتہاد کی وجہ سے یقیناً ایک اجر کے حقدار ہوں گے اور امت سے تقویٰ میں افضلیت کی وجہ سے، وہ رسول اللہ ﷺ کی مندرجہ ذیل حدیث کے بھی زیادہ مصداق ہیں؛

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "**مومن آدمی بھولا بھالا** [دھوکہ کھانے والا] **اور شریف ہوتا ہے** اور فاسق انسان دھوکہ باز اور کمینہ ہوتا ہے۔ [مقصد یہ ہے کہ مومن عموماً دھوکہ کھا جاتا ہے اپنی سادگی کی بناء پر اور پھر دھوکہ کھانے پر جھگڑا نہیں کرتا کیونکہ وہ شریف بھی ہوتا ہے جبکہ فاسق و فاجر انسان دھوکہ باز بھی ہوتا ہے اور لڑائی جھگڑا کرنے والا بھی] [سنن ابوداؤد۔ جلد سوم۔ ادب کا بیان۔ حدیث ۱۳۸۷]

مندرجہ بالا حدیث کی عملی تفسیر کے طور پر اس نظام کے وظیفہ خواروں کی اس نظام سے وفاداری اور ہمارے علماء کی معصومیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے طریقہ کار کی اعلیٰ ترین مثال، مولانا احتشام الحق تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "عائلی قوانین اور اختلافی نوٹ" کے صفحہ نمبر ۲۹ تا ۳۶ کے مطالعے سے، ہر ذی شعور مسلمان پر واضح ہو جائے گی۔

✓ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ

[سورة البقرة؛ ۱۳۴] یہ جماعت گزر چکی۔ ان کو اُن کے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمھارے اعمال (کا) اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہیں ہو گی۔

وہ اکابر امت جن کے نام کے ذریعے اس آئین پاکستان کو جواز دینے کی کوشش کی جاتی ہے وہ ماضی کا حصہ بن چکے اور ان کا معاملہ اللہ سبحان وتعالیٰ کے سپرد ہے۔ ہم ہر مؤمن کے انجام کی طرح، ان کے بارے میں حسن ظن کے قائل ہیں؛ مگر یہ ہمارے اعمال کا جواز نہیں ہو سکتا بالخصوص جب عصر حاضر میں ہر خاص وعام پر روز روشن کی طرح واضح ہو کہ یہ آئین پاکستان اپنے اقوال وافعال میں درالحقیقت عالمی طاغوتی جمہوری نظام کا چربہ ہے، اور اس میں انہی انفرادی وباہمی سطح کے اسلامی احکام کی پیوند کاری ممکن ہے جو عالمی طاغوتی نظام کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہیں ہوں۔

جس کی واضح ترین مثال سود کے متعلق وفاقی شرعی عدالت کے ایک نہیں بلکہ دو بار قرآن وحدیث پر مبنی واضح اور قطعی فیصلے کو یہی آئین عدالت عظمیٰ میں التواکی اپیل کا حق دیتا نظر آتا ہے۔ اصل تعجب ہمارے علمائے وقت اور دینی قوتوں کے رد عمل پر ہے جو ایک طرف ان اداروں کے بائیکاٹ کا مشورہ دیتے نظر آتے ہیں جنھوں نے آئین پاکستان کے مطابق یہ قانونی اپیل دائر کی ہے اور دوسری طرف حکومت وقت سے اس قانونی اپیل کی واپسی کی درخواست کرتے ہوئے؛ ان سے ابھی بھی اس اسلامی آئین اور اسلامی جمہوری نظام میں موجود اعلانیہ طاغوت مخفی ہے۔

لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله ؛ لا اله الا الله محمد رسول الله

اللهم صل علی سیدنا محمد و علی اٰلہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

علمائے حق کی حقیقت

علماء کی معاشرہ میں ذمہ داری کیا ہے؟

دین میں انسانی معاشرہ کی اہمیت کا احساس اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس دنیا میں اللہ کے جزا و سزا کا قانون محض معاشرہ کے اجتماعی رویئوں کے بنیاد پر نافذ ہوتا ہے نہ کہ انفرادی گناہوں کے باعث؛ اور اسی لیے اس دنیا میں اجتماعی سطح پر اللہ کے قوانین سے انحراف کرنے والے "کفار" اور انفرادی سطح پر کوتاہی کرنے والے "فاسق" قرار پائے، جیسا کہ مضمون "شریعت کی حقیقت" میں سورۃ المائدۃ کی آیات کی روشنی میں بیان ہو چکا۔ معاشرہ کے اصلاح کے دو درجات ہیں اور دونوں کی ذمہ داری کے اولین مخاطب "اولو الامر" کی صورت میں علماء اور حکمران ہیں؛ مگر "وارث الانبیاء" ہونے کے باعث اس دینی ذمہ داری کا اصل بوجھ ایک عالم پر ہے۔

- **اصلاح کے درجہ اول کا تعلق طاغوتی و کفریہ نظام کے خلاف عسکری اور غیر عسکری دعوت دین سے ہے؛** جیسا کہ مکی دور میں عسکری طاقت کی عدم موجودگی میں اصلاح معاشرہ کی فکر میں رسول اللہ ﷺ نے عمومی مقامات پر بھی توحید خالص کی تبلیغ فرمائی، مگر خصوصی طور پر سرداران قوم آپ ﷺ کی توجہ کے مرکز تھے اور مدنی دور میں عسکری طاقت کی موجودگی میں اسی اصلاح معاشرہ کے تناظر میں غزوات و سرایا کی صورت میں اقدامی جہاد فی سبیل اللہ کی سنت تفصیل سے سیرت رسول ﷺ میں ملتی ہے۔ اور سیرت رسول ﷺ کے اس پہلو سے اس بات کا ادراک بھی ہوتا ہے کہ علمائے حق کی اصل کوششوں کا مرکز نگاہ، انفرادی اصلاح کے بجائے معاشرہ کے اجتماعی اصلاح کے پہلو ہونے چاہیں۔

- **درجہ دوم کا تعلق اسلامی معاشرہ میں اصلاح کے دوام سے ہے؛** اس کے لیے سنت رسول ﷺ میں "امر بالمعروف و نہی المنکر" کی فرض کی صورت میں سنت موجود ہے؛ اور معاشرہ میں، اس سنت کے نفاذ کا اولین مخاطب، قوت کے ساتھ ایک صاحب اختیار؛ قول کے ساتھ ایک عالم اور پھر عمومی طور پر ہر صاحب استطاعت ہے۔ مزید بر آں، تاریخ اسلام ایک طویل عرصہ تک معاشرہ میں عالم اور غیر عالم کا فرق موجود تھا مگر دینی و دنیاوی طبقات کی تقسیم سے آزاد تھی اور اس کی ایک اہم ترین وجہ اہل علم کا معاشرہ کے ہر منفعت بخش شعبہ میں عملی موجودگی تھی، جس کے باعث حکومتی سطح پر نہ بھی سہی مگر عمومی سطح پر معاشرہ میں اصلاح کو دوام نصیب ہونے کے ساتھ عام عوام کو دینی علم سے رغبت نصیب رہی۔

الحمد اللہ ثم الحمد اللہ کہ اللہ سبحان و تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کی مدرسہ و مسجد میں مصروفیات اتنی محدود در کھیں کہ آج ہم اپنے آپ کو مسلمان کہلانے کے قابل ہیں؛ خدا نخواستہ اگر رسول اللہ ﷺ ہمارے عصر حاضر کے اکثریتی علماء کی طرح مدارس و مسجد ہی میں مصروف رہتے تو یقیناً **عملی دین اسلام** مکہ مکرمہ میں دارِ ارقم سے باہر نہ نکلتا اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی ﷺ سے۔

معاشرہ میں عوام الناس، علماء اور حکمران کا کیا باہم ربط ہے؟

معاشرہ کی اجتماعیت کے پیش نظر حکمران کی اطاعت، حتّٰی کہ ظالم وفاسق وفاجر حکمران کی اطاعت کی تاکید بھی احادیث صحیحہ میں جابجا ملتی ہیں۔ مگر اصل سوال یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ ایک عالم حق اور حکمران کے درمیان تنازعہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو ایسی صورت میں عوام الناس کی اطاعت کا کون زیادہ حقدار ہے؟۔

اِس مسئلہ پر مندرجہ ذیل آیت قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے؛

- ✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا [سورة النساء؛ ۵۹] اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول ﷺ کا اور جو ''اختیار والے ''ہیں تم میں سے۔ پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو **رجوع کرو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف** اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور پچھلے دن پر یہ خوب ہے اور بہتر تحقیق کرنا۔

مفسرین نے اولوالامر کی تفسیر میں تین قول بیان کیے ہیں؛

- یہ کہ اس سے خلیفہ وقت یا حکمران مراد ہیں۔
- یہ کہ اس سے سرداران فوج مراد ہیں۔ ہر فوج کو اپنے سردار کی اطاعت واجب ہے۔
- یہ کہ علماء اور فقہاء مراد ہیں۔

ان تینوں قولوں میں کوئی اختلاف نہیں تینوں مراد ہوسکتے ہیں چونکہ ان میں سے ہر ایک کی اطاعت اپنے اپنے درجہ میں واجب ہے۔ مگر آیت کے آخری حصہ میں تنازع کی صورت میں رجوع الی اللہ ورسول ﷺ [یعنی قرآن وسنت] کے حکم کے باعث علماء وفقہا کی اطاعت باقی دونوں اطاعتوں پر حاوی ہے۔

دین میں عالم کے خطاب کا حقیقی حقدار کون ہے؟

قرآن اور حدیث میں علم سے مراد فقط دینی معلومات کا حصول نہیں "رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ الْأَرْبَعِ **مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ**۔۔۔۔" [سنن نسائی - کتاب الاستعاذۃ- حدیث ۵۵۳۹] بلکہ نفع والے علم کا اطلاق اس دینی معلومات پر ہوتا ہے جو ایمان کا حصہ بن جائے، عمل اس کے تابع ہو اور دنیا و آخرت میں نفع بخش ہو۔ حتّٰی کہ دنیاوی معاملات میں بھی علم صرف اسی معلومات کو کہتے ہیں جس کا تعلق انسان کے دنیاوی نفع سے ہو۔ وہ معلومات جس کے جاننے یا نہ جاننے سے اس کی انفرادی، باہمی یا اجتماعی زندگی پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہو وہ علم نہیں کہلاتا اور اس کا حصول بھی مندرجہ بالا حدیث کی روشنی میں ناپسندیدہ ہے۔ قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت میں تو اللہ کے خوف یعنی تقویٰ ہی کو عالم ہونے کے واحد معیار کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

- ✓ ۔۔۔۔ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ [سورۃ الفاطر؛۲۸]

  "۔۔۔۔ خدا سے تو اس کے بندوں میں سے **وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں**۔ بے شک خدا غالب [اور] بخشنے والا ہے"۔

تقویٰ اور علم کو براہ راست متناسب [Directly Proportional] ہونے کے سبب تقویٰ میں اضافہ محض علم میں اضافہ کے ذریعے ہی ممکن ہے نہ کہ فقط عبادات میں اضافہ سے۔ اسی فرق کو مندرجہ ذیل حدیث میں واضح کیا گیا؛

- ✓ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیشک میں نے حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص علم کے حصول کی راہ میں چلا اللہ تعالیٰ اسے جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ پر چلاتے ہیں اور بیشک ملائکہ اپنے پروں کو طالب علم کی خوشنودی کے لئے بچھاتے ہیں اور عالم کے لئے زمین و آسمان کی تمام اشیاء مغفرت کی دعا کرتی ہیں اور مچھلیاں پانی کے پیٹ میں۔ اور بیشک **عالم کی فضیلت عابد پر** ایسی ہے جیسی چودھویں کے چاند کی فضیلت سارے ستاروں پر اور بیشک علماء انبیاء کے ورثاء ہیں اور انبیاء علم کو میراث بناتے ہیں پس جس نے اسے حاصل کر لیا تو اس نے پورا حصہ حاصل کر لیا۔ [سنن ابوداؤد ۔ جلد سوم ۔ علم کا بیان ۔ حدیث ۲۴۸]

علم کی وہ قلیل ترین مقدار جو آخرت میں عالم کا مقام و درجہ حاصل کرنے کے لیے کفایت کر جائے گی وہ رسول اللہ ﷺ کی مندرجہ ذیل حدیث میں بیان ہے؛

- ✓ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ علم کی مقدار کیا ہے کہ جب انسان اتنا علم حاصل کرے تو فقیہہ [عالم] ہو جائے اور **آخرت میں اس کا شمار زمرہ علماء میں** ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی میری امت کو فائدہ پہنچانے کے لئے امر دین کی چالیس حدیثیں یاد کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت میں فقیہ اٹھائے گا اور قیامت کے دن میں اس کا شفاعت کرنے والا اور [اس کی اطاعت پر] گواہ بنوں گا۔" [مشکوۃ شریف ۔ جلد اول ۔ علم کا بیان ۔ حدیث ۲۴۶]

علماء لکھتے ہیں کہ اس سے مراد چالیس حدیثوں کا دوسرے لوگوں تک پہنچانا ہے اگرچہ وہ یاد نہ ہوں چنانچہ اس حدیث کے پیش نظر بہت سے علماء نے چالیس احادیث جمع کر کے لوگوں تک پہنچائی ہیں اور اس طرح وہ قیامت میں رسول اللہ ﷺ کی شفاعت اور گواہی کے امیدوار ہوئے ہیں۔

بہر کیف اس دنیا میں ہر شعبہ کے ماہر کی طرح، عالم کے لقب کے صحیح حقدار تو فقط وہ اشخاص ہیں جنہوں نے دینی علم کے حصول میں اپنی زندگیاں صرف کیں؛ وہ علم حاصل کیا جس کے علم دین اور برحق ہونے پر سلف وخلف میں اتفاق ہے اور علمی حلقوں میں ان کی علمیت قابل قبول ہو۔

کیاہر فارغ التحصیل عالم قابل اطاعت ہے؟

جس طرح تمام ایلوپیتھک طبیب[Doctors] کسی نہ کسی طبی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں، مگر پھر بھی ہر فارغ تحصیل طبیب اللہ کے خوف کے سبب خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار مسیحا نہیں ہوتا، اور نہ ہی ہر فارغ التحصیل طبیب انسانوں کے اعضاء کے گھناؤنے کاروبار میں مبتلا ہوتا ہے، بلکہ اکثریت کے نزدیک تو طب، محض ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے جو باقی فنون کی طرح محض ان کی دنیاوی ضروریات وخواہشات کے حصول میں ان کی معاونت کرتا ہے۔ اور جہاں معاشرہ ان کے علم کے فوائد سے انفرادی سطح پر بہرہ مند ہوتا ہے، وہیں یہ اکثریت اس تعلیمی نظام کے تحفظ کا کام بھی ادا کرتی ہے۔

بعینہ مدارس سے فارغ التحصیل علماء میں بھی نہ تو ہر کوئی رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق "وارث انبیاء" ہوتے ہوئے [عالم حق] کے لقب کا مستحق ہوتا ہے اور نہ ہی ہر فارغ التحصیل عالم کے دل کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق "بھیڑیوں کے دل" سے مشابہت دیتے ہوئے [عالم سوء] کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اکثریت کے نزدیک تو اس دینی علم کی حیثیت محض ایک فن کی سی ہوتی ہے جو باقی فنون کی طرح محض ان کی دنیاوی ضروریات وخواہشات کے حصول میں ان کی معاونت کرتا ہے۔ اور جہاں معاشرہ ان کے علم کے فوائد سے انفرادی سطح پر بہرہ مند ہوتا ہے، وہیں یہ اکثریت اس تعلیمی نظام کے تحفظ کا کام بھی دیتی ہے۔

اسی لیے ہر مسلمان پر انفرادی سطح پر ان بنیادی عقائد اور اعمال کے علم کا حصول فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے جو داعی حق وباطل میں فرق کو واضح کرتا ہو اور یہی اس کتاب کا حقیقی موضوع ہے۔

علمائے حق کی تلاش آخر کیوں ضروری ہے؟

دن بدن معاشرہ میں بڑھتی ہوئی مسجدوں کی تعداد کے باوجود، معاشرہ میں فسق وفجور اور بے راہ روی کے بڑھتے ہوئے رجحانات، ہر اس مسلمان کو جو اپنی آخرت کی فکر میں ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ دنیا اس کے لیے دار عمل ہے، تو اس کے لیے اس سوال کا جواب تو محض مندرجہ ذیل احادیث میں پنہاں ہے؛

✓ ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں ایک دن اللہ کے رسول ﷺ کے پہلو بہ پہلو آپ ﷺ کے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "**دجال کے علاوہ** بھی ایک فتنہ ہے جس کا مجھے اپنی امت پر اندیشہ ہے۔" جب میں اس بات سے ڈرا کہ آپ ﷺ تو اپنے گھر میں داخل ہونے لگے ہیں تو میں نے کہا "اللہ کے رسول ﷺ آپ ﷺ اپنی امت پر دجال سے بھی زیادہ کس بات کا اندیشہ رکھتے ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا "**گمراہ ائمہ**" [مسند امام احمد۔ جلد ۱۱۔ خلافت و امارت کے مسائل۔ حدیث ۱۲۰۷۳]

"گمراہ ائمہ" سے مراد حکمران بھی ہو سکتے ہیں اور علماء و مشائخ بھی؛ مگر اس حدیث میں دجال سے نسبت کی وجہ سے دونوں ہی مراد ہونا قرین قیاس ہے کیونکہ دجال کا فتنہ دینی اور دنیاوی دونوں طرز زندگی پر یکساں اثر انداز ہو گا۔

✓ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں اس وقت تمہارا کیا عالم ہو گا جب تمہارے سامنے ایسا فتنہ آئے گا جو بڑی عمر کے لوگوں کو بوڑھا کر دے گا اور کم عمر لوگوں کو جوان کر دے گا جب اس فتنے میں سے کسی چیز کو ترک کیا جائے گا تو یہ کہا جائے گا سنت ترک ہو گئی ہے لوگوں نے دریافت کیا ایسا کب ہو گا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا تمہارے **علماء رخصت** ہو جائیں گے۔ تمہارے ہاں **جہلاء کی کثرت** ہو جائے گی **قرآن کے عالم کہلانے والوں کی کثرت** ہو جائے گی۔ دین کی سمجھ بوجھ رکھنے والوں کی کمی ہو جائے گی امراء بکثرت ہوں گے اور امین لوگ کم ہو جائیں گے اور آخرت کے عمل کے نتیجے میں دنیا حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور دین کے بجائے دیگر معاملات میں سمجھ بوجھ اختیار کی جائے گی۔ [سنن دارمی۔ جلد اول۔ مقدمہ دارمی۔ حدیث ۱۸۸]

✓ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "عنقریب لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اسلام میں صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا اور قرآن میں سے صرف اس کے نقوش باقی رہیں گے۔ ان کی مسجدیں [بظاہر تو] آباد ہوں گی مگر حقیقت میں **ہدایت سے خالی** ہوں گی۔ ان کے علماء آسمان کے نیچے کی مخلوق میں سے **سب سے بدتر** ہوں گے۔ انہیں سے [ظالموں کی حمایت و مدد کی وجہ سے] دین میں فتنہ پیدا ہو گا اور انہیں میں لوٹ آئے گا [یعنی انہیں پر ظالم] مسلط کر دیئے جائیں گے۔" [مشکوۃ شریف۔ جلد اول۔ علم کا بیان۔ حدیث ۲۶۳]

ان احادیث اور عصر حاضر کے حالات سے اس بات کی اہمیت اور احساس مزید دوچند ہو جاتا ہے کہ یا تو ہر مسلمان رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چلا جائے [مسند امام احمد ۔ جلد ۱۲ ۔ قیامت اور اس کے فتنوں کی علامات ۔ حدیث ۱۲۸۲۱] ورنہ انفرادی کوشش سے عالم حق کے مقام تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ یقیناً پہلی دونوں صورتیں اکثریت کے لیے ناممکن ہیں۔ واحد صورت میں کم از کم ان دینی اصولوں کے علم کا حصول کرے جن کی بنیاد قرآن اور حدیث کے قطعی دلائل پر ہو اور ان کی روشنی میں وہ معاشرہ میں علمائے حق کی تلاش کرے تاکہ اپنی ذاتی اور باہمی زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے ایمان سوز فتنوں سے بھی آگاہی حاصل ہوتی رہے۔ **کیونکہ** حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "یہ علم [یعنی کتاب و سنت کا علم] دین ہے۔ لہٰذا جب تم اس کو حاصل کرو تو یہ دیکھ لو کہ اپنا دین **کس سے حاصل کر رہے ہو**۔" [مشکوۃ شریف ۔ جلد اول ۔ علم کا بیان ۔ حدیث ۲۶۰]

اس دنیا میں حق کی پہچان؛ ان گنت شیطانی اور نفسانی فتنوں سے بچاؤ؛ باہمی اور اجتماعی معاملات میں سماجی دباؤ سے بچاؤ اور اپنی زندگیوں کو اللہ تعالیٰ کے مطلوبہ سانچے میں ڈھالنے کے لیے علمائے حق کی علمی اور عملی پیروی صرف اس دنیاوی زندگی کے لیے ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ ان کی پیروی کے باعث اللہ سبحان و تعالیٰ تین دیگر مقامات پر بھی دین حق کے پیروکار کو ثابت قدمی اور اس کی حفاظت فرمائیں گے، جہاں اس کے سوا کوئی مددگار نہیں۔

- **عالم برزخ میں؛** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "۔۔۔۔ اور میری ﷺ طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ تمہاری **قبروں میں** تمہاری آزمائش ہوگی، **فتنہ دجال کی طرح** [سخت] یا اس کے قریب قریب، [فاطمہ رضی اللہ عنہا] کہتی ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ اسماء رضی اللہ عنہا نے کیا کہا تھا [مثل کا لفظ یا قریب کا لفظ] ۔۔۔۔" [صحیح بخاری ۔ جلد اول ۔ علم کا بیان ۔ حدیث ۸۹]
- **میدان حشر میں؛** يَوْمَ نَدْعُو كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَأُولَٰئِكَ يَقْرَءُونَ كِتَابَهُمْ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا [سورۃ الاسرآء؛ ۷۱]" جس دن ہم سب لوگوں کو

ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے۔ تو جن [کے اعمال] کی کتاب ان کے داہنے ہاتھ میں دی جائے گی وہ اپنی کتاب کو [خوش ہو ہو کر] پڑھیں گے اور ان پر دھاگے برابر بھی ظلم نہ ہو گا۔"

- **جہنم سے نجات؛** يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ۝ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا [سورۃ الاحزاب؛ ۶۸۔ ۶۹] "جس دن ان کے منہ آگ میں الٹائے جائیں گے کہیں اے کاش ہم خدا کی فرمانبرداری کرتے اور رسول [خدا] ﷺ کا حکم مانتے۔ اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار **ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کا کہا مانا** تو انہوں نے ہم کو رستے سے گمراہ کر دیا۔"

کیا معاشرہ میں عالم حق کی پہچان ممکن ہے؟

جس طرح قرآن و حدیث میں کسی کے مسلمان؛ مومن؛ محسن؛ فاسق؛ فاجر؛ ظالم؛ منافق یا کافر ہونے کی باطنی و ظاہری علامات تفصیلاً بیان ہوئی ہیں، اسی طرح قرآن و حدیث میں علمائے حق اور علمائے سُوء کی باطنی و ظاہری علامات بھی تفصیلاً بیان کی گئی ہیں، مگر اس مضمون میں عصر حاضر کی روشنی میں صرف چند چیدہ علامات کا اجمالاً ذکر مطلوب ہے۔ ان علامات کے مطالعے سے قبل اگر مندرجہ ذیل دو باتیں ملحوظ خاطر رہیں تو ان علامات سے استفادہ مزید آسان جائے گا؛

- ✓ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا دین کی ابتداء اجنبیت میں ہوئی اور عنقریب یہ اپنی ابتدائی حالت پر لوٹ جائے گا سو خوشخبری ہے **غرباء** کے لئے [جو دین سے چمٹے رہیں گے] [مسند احمد۔ جلد چہارم۔ حدیث ۱۸۷۲]۔

یہ حدیث جہاں عمومی طور پر دین حق [یعنی باطل رخصتوں اور نفس پرستانہ مصلحتوں سے پاک اسلام] پر عمل پیرا لوگوں کو معاشرہ میں ان کے دین کی بنیاد پر ان کو ممتاز کرتی ہے وہیں خصوصی طور پر علمائے حق کو بھی ان کے طبقہ میں باقی علماء سے ممتاز کرتی ہے۔

- ✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ [سورۃ آل عمران؛ ۱۱۸] "مومنو! کسی غیر [مذہب کے آدمی] کو اپنا راز داں نہ بنانا یہ لوگ تمہاری

خرابی اور [فتنہ انگیزی کرنے] میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ [جس طرح ہو] **تمہیں تکلیف پہنچے** ان کی **زبانوں سے تو دشمنی** ظاہر ہو ہی چکی ہے اور جو [کینے] ان کے سینوں میں مخفی ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سنا دی ہیں۔"

اس آیت کی روشنی میں اس بات پر توجہ دیں کہ علماء کے کس گروہ سے اسلام دشمن عناصر یعنی ہنود، یہود اور نصاریٰ اور ہمارے معاشروں میں ان کے حامیوں کو قولی اور عملی بغض ہے۔

علمائے حق کی عصر حاضر کی مناسبت سے چند چیدہ علامات؛

- ✓ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ علم جو دل کے اندر ہوتا ہے یہ علم تو نفع دیتا ہے اور دوسرا وہ علم ہے جو زبان کے اوپر ہوتا ہے **یہ علم آدمی پر اللہ عزوجل کی دلیل و حجت ہے**۔" [مشکوۃ شریف - جلد اول - علم کا بیان - حدیث ۲۵۷]

اَ. فرشتوں کے مثل، اپنے علم پر فخر نہیں کرتے بلکہ اس کو خالصتاً اللہ کی عطا و مہربانی سمجھتے ہوئے نرم خو ہیں۔

- ✓ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ [سورة البقرة؛ ٣٢] "انہوں نے کہا، تو پاک ہے۔ **جتنا علم تو نے ہمیں بخشا** ہے، اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ بے شک تو دانا [اور] حکمت والا ہے۔"
- ✓ ـــــ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ـــــ [سورة النساء؛ ١٥٩] " ـــــ اور اگر تم **بدخو اور سخت دل** ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے ـــــ"

ب. دین کی خدمت کا بدلہ وہ مخلوق سے پانے کے امیدوار نہیں ہوتے اور نہ ہی دنیا کا مال و متاع ان کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔

- ✓ اتَّبِعُوا مَن لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُم مُّهْتَدُونَ [سورة يس؛٢١] "ان کی پیروی کرو جو تم سے کوئی **اجر نہیں مانگتے** اور وہ ہدایت پانے والے ہیں"
- ✓ فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَإِن يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهُ يَأْخُذُوهُ ـــــ [سورة الاعراف؛ ١٦٩] "پھر ان کے بعد ناخلف

ان کے قائم مقام ہوئے جو **کتاب کے وارث** بنے۔ یہ [بے تامل] اس دنیائے دنی کا **مال و متاع لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بخش دیئے جائیں گے**۔ اور [لوگ ایسوں پر طعن کرتے ہیں] اگر ان کے سامنے بھی ویسا ہی مال آجاتا ہے تو وہ بھی اسے لے لیتے ہیں۔۔۔۔۔"

ت. ان کے نزدیک حفظ دین تمام دنیاوی مصلحتوں پر حاوی ہے جس کے بنا پر وہ بغیر لگی لپٹی کے واضح طور پر حق بات کہنے سے نہیں رکتے اور نہ ہی اس کو چھپاتے ہیں۔

- ✓ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ [سورۃ البقرۃ؛ ۴۲] "اور حق کو باطل کے ساتھ **نہ ملاؤ**، اور سچی بات کو جان بوجھ کر **نہ چھپاؤ**"
- ✓ ۔۔۔۔۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ "اگر تم اس پر تلوار رکھ دو لیکن پھر بھی میں سمجھوں گا کہ اس سے پہلے کہ تم میرے اوپر تلوار چلاؤ ایک کلمہ جو میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہہ سکوں گا تو ضرور اس کو کہہ دوں گا" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "فليبلغ الشاهد الغائب" [یہ بھی علم کے ظاہر کرنے کا حکم دے رہا ہے]۔۔۔۔ [صحیح بخاری۔ جلد اول۔ علم کا بیان۔ حدیث ۷۰]

ث. دین کے راستے میں مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں اور دین پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

- ✓ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے سخت آزمائش کس پر آتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انبیاء کرام علیہم السلام پر، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے پوچھا؛ ان کے بعد؟ فرمایا؛ **علماء پر**؛ انہوں نے پوچھا؛ ان کے بعد؟ فرمایا صالحین پر۔۔۔۔۔۔ [المستدرک؛ جلد اول؛ کتاب الایمان؛ ۱۱۹]

ج. حکومتی ایوانوں سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔

- ✓ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں جو شخص اپنے دین کی عزت افزائی کرنا چاہتا ہو وہ **کسی حکمران کے پاس نہ جائے** اور تنہائی میں عورتوں کے پاس موجود نہ ہو اور بدعقیدہ لوگوں کے ساتھ بحث و مباحثہ نہ کرے۔ [سنن دارمی۔ جلد اول۔ مقدمہ دارمی۔ حدیث ۳۰۳]
- ✓ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "میری امت میں بہت سے لوگ دین میں سمجھ یعنی دین کا علم حاصل کریں گے اور قرآن پڑھیں گے اور کہیں گے کہ **ہم**

امراء کے پاس جاکر ان کی دنیا اور [دولت] میں سے اپنا حصّہ حاصل کریں گے اور اپنے دین کو ان سے یکسو رکھیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا، جیسا کہ جس طرح خاردار درخت سے صرف کانٹا ہی حاصل ہو سکتا ہے، اسی طرح امراء کی صحبت سے نہیں حاصل ہوتا مگر! حضرت محمد ابن صباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گویا رسول اللہ ﷺ کی مراد (لفظ الا کے بعد) خطایا [گناہ] تھی۔" [مشکوۃ شریف۔ جلد اول۔ علم کا بیان۔ حدیث ۲۵۰]

ح. خالی نیکی کی تلقین ہی نہیں بلکہ دنیاوی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر برائیوں سے بھی عوام الناس کو منع کرتے ہیں۔

- ✓ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ [سورۃ المائدۃ؛ ٦٣] " بھلا ان کے مشائخ اور علماء انہیں گناہ کی باتوں اور حرام کھانے سے **منع کیوں نہیں کرتے**؟ بلا شبہ وہ بھی برا کرتے ہیں۔"

خ. خصوصاً عوام الناس میں کسی جاہل اور بدعقیدہ کے ساتھ بحث و مباحثہ میں مصروف نہیں ہوتے۔

[اس سے کفار کے ساتھ مناظرہ یا مجادلہ کی ممانعت مراد نہیں ہے]

- ✓ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں جو شخص اپنے دین کی عزت افزائی کرنا چاہتا ہو وہ کسی حکمران کے پاس نہ جائے اور تنہائی میں عورتوں کے پاس موجود نہ ہو اور **بدعقیدہ لوگوں کے ساتھ بحث و مباحثہ نہ کرے**۔ [سنن دارمی۔ جلد اول۔ مقدمہ دارمی۔ حدیث ۳۰۳]
- ✓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا اگر اہل علم [یعنی علماء] علم کی حفاظت کریں اور **علم کو اس کے اہل ہی [یعنی قدر دانوں] کے سامنے رکھیں** تو وہ بے شک اپنے علم کے سبب دنیا والوں کے سردار بن جائیں لیکن [علماء] نے اگر ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے علم کو دنیاداروں پر خرچ کیا تا کہ اس کے ذریعہ وہ دنیا [یعنی جاہ و جلال] کو حاصل کریں اور علم کا حقیقی مقصد یعنی دنیا والوں کی ہدایت و نصیحت کو موقوف کر دیں تو وہ دنیا والوں کی نظر میں ذلیل ہوئے۔۔۔۔۔۔ [مشکوۃ شریف۔ جلد اول۔ علم کا بیان۔ حدیث ۲۵۱]

د. وہ مومنین سے نرمی اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں گے اور جہاد کے معاملہ میں کسی بھی قسم کی تکلیف اور ملامت سے نہیں ڈرتے ہیں۔

✓ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ [سورة المائدة؛ ۵۴] " اے ایمان والو اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو **مومنوں کے حق میں نرمی کریں** اور **کافروں سے سختی سے پیش آئیں** خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والی کی **ملامت سے نہ ڈریں** یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی کشائش والا اور جاننے والا ہے۔"

✓ وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ [سورة آل عمران؛ ۱۴۶] "اور بہت سے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ ہو کر اکثر اہل اللہ [خدا کے دشمنوں سے] لڑے ہیں تو جو مصبتیں ان پر راہ خدا میں واقع ہوئیں ان کے سبب انہوں نے **نہ تو ہمت ہاری اور نہ بزدلی کی نہ [کافروں سے] دبے** اور خدا استقلال رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے"

ذ. آخری مگر سب سے اہم ترین علامت کہ وہ [مقلد و غیر مقلد] اپنے فقہی و غیر فقہی مذہب، مسلک اور مکتب فکر میں شدّت پسند نہیں ہوتے ہیں۔

✓ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ [سورة آل عمران؛ ۱۰۵] "اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو **متفرق ہو گئے اور احکام بین آنے کے بعد** ایک دوسرے سے [خلاف و] اختلاف کرنے لگے یہ وہ لوگ ہیں جن کو قیامت کے دن بڑا عذاب ہو گا"

✓ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۔۔۔۔۔ [سورة الشوری؛ ۱۴] "اور یہ لوگ جو **الگ الگ ہوئے** ہیں تو علم [حق] آچکنے کے بعد **آپس کی ضد سے** [ہوئے ہیں] ۔۔۔۔۔"

کیا عصر حاضر میں عالم حق کا "جہاد فی سبیل اللہ" کا علم بردار ہونا لازمی ہے؟

✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے سر پر وہ انسان مبعوث فرمائے گا جو ان کے **دین کی تجدید** کرے گا۔ [سنن ابوداؤد۔ کتاب الملاحم۔ باب ا، ح ۴۲۹۱]

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ ہر زمانہ کے حالات، وقت کی ضروریات اور اس زمانہ کے مروجہ باطل کے مقابلہ کی ضروریات کے سبب، اللہ سبحان و تعالیٰ علمائے حق کی صورت میں حق اور باطل واضح کرتا رہا ہے تا کہ عوام و خواص پر حجت قائم ہو سکے۔ امت میں ان مجدد شخصیات کی فہرست پر کلی اتفاق تو موجود نہیں مگر اول [حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ] اور آخر شخصیت [امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ] پر تقریباً اجماع ہے۔

احادیث میں امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کی دو بنیادی کاوشوں کا انتہائی تفصیل سے ذکر ہے؛ **اول** اقامت خلافت علی منہاج النبوۃ اور **دوم** کفار کے خلاف جہادی کارنامے۔ بر خلاف ماضی کی تجدید دین کی کاوشوں کے، ان دونوں کاوشوں کا تعلق اجتماعی عبادات سے ہے اور "**سمعنا و اطعنا**" کے اصولوں پر قائم تابعین کی ایک جماعت ان کاوشوں کی کامیابی کے لیے جزو لازم ہے۔

- ✓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کی خاطر لڑتا رہے گا اور قیامت تک غالب رہے گا اور فرمایا کہ پھر حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اتریں گے **لوگوں کا امیر** ان سے نماز پڑھانے کے لے عرض کرے گا آپ علیہ السلام فرمائیں گے کہ نہیں بلکہ تم ایک دوسرے پر امیر ہو یہ وہ اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عطا فرمایا ہے۔ [صحیح مسلم۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۳۹۵]

اس حدیث کے مصداق یہ گروہ، انفرادی جماعتیں کی صورت میں آج بھی موجود ہے اور حق کی دعوت دیتا نظر آتا ہے، مگر عوام تو کیا قرآن اور حدیث کے واضح دلائل کے باوجود علماء کی اکثریت بھی اس کی اس نظریاتی، قولی اور عملی پکار سے نہ صرف کوسوں دور نظر آتے ہیں بلکہ اس گروہ کے مخالفین کی صفوں میں نظر آتے ہیں۔

تو جب امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ عالمی دجالی نظام کی بغاوت میں اسلامی خلافت قائم کریں گے اور جہاد فی سبیل اللہ کی شکل میں کفار و منافقین کے بقول دہشتگردی [نعوذ باللہ من ذالك] کے مرتکب ہوں گے، تو جہاد سے نظریاتی، قولی اور عملی طور پر غافل علماء، جس طرح عصر حاضر کے جاری و ساری جہادی معرکوں میں سے حق کی پہچان کرنے اور عوام کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں، بعینہ اللہ تعالیٰ ان کو اس عظیم سعادت کی پہچان اور

اس کی پیروی سے بھی محروم رکھے گا[الا ما شاء اللہ]۔اور عصر حاضر ہی کی طرح وہ امت کے ایک کثیر طبقہ کے لیے کفار اور منافقین کے ایجنڈے کی تکمیل کرتے نظر آئیں گے۔

امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کی پکار پر لبیک کہنے کی توفیق اور سعادت تو محض ان کے نصیب میں ہو گی جن کی زندگیوں کا نظریاتی مقصد ہی جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی سربلندی ہو۔۔۔۔۔ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ [سورۃ الیوسف؛ ۵۶] "۔۔۔۔ہم اپنی رحمت جس پر چاہتے ہیں کرتے ہیں اور نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔" اور یہی علماء اور ان کے متبوعین موجود زندگیوں میں جہاد فی سبیل اللہ کے نظریاتی قائل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی استطاعت کے مطابق قولی [یا تحریری]؛مالی اور[اگر توفیق ہے تو] جسمانی طور پر اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروف عمل ہوں گے۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔۔۔۔۔[سورۃ البقرۃ؛ ۲۸۶]خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔۔۔۔

اس کتاب کے موضوعات اور علمائے حق کا کیا ربط ہے؟

کوئی زندہ شخص دنیاوی فتنوں سے محفوظ ہونے کا دعوی نہیں کر سکتا،اسی لیے عالم حق کوئی مستقل نوعیت کا لقب یا مقام نہیں ہے جس کے حامل میں تغیر ممکن نہیں ہے؛ناقابل تغیر تو صرف وہ عقائد اور ان سے منسلک وہ اعمال ہیں جن کا ذکر اس کتاب کے مختلف مضامین میں اجمالاً کیا گیا ہے اور ہر دنیاوی فتنہ در حقیقت ایک عالم حق کے اسی مقام اور لقب کی آزمائش ہے۔

یقیناً ایک عالم حق ہر قسم کے **طاغوت** سے اعلانیہ اور عملی براءت کا علمبردار اور خالص **عقیدہ توحید** کا حامل اور داعی ہوتا ہے؛فتنوں میں **سنت رسول** صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کے لیے انفرادی و اجتماعی معاملات میں واحد معیار حق ہوتا ہے؛کل دین کی **تبلیغ** بشمول امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں سرگرم [اس سے مراد عصر حاضر میں مشہور تبلیغی جماعت والی تبلیغ نہیں ہے]؛اور **امت مسلمہ** کے درد کا احساس اور **حربی کفار کے ساتھ** قولی اور عملی طور پر سخت مؤقف رکھنے والا؛ملامت کرنے والوں کی ملامت کے باوجود قولی،مالی اور عملی طور **جہاد فی سبیل اللہ** پر مصروف عمل اور موجودہ حکومتی نظاموں کے برخلاف **خلافت** کی صورت میں **شریعت** کی سربلندی کا قولی و عملی داعی ہوتا ہے۔

علمائے حق، اس امت میں ہمیشہ ایک اقلیتی طبقہ رہا ہے؛ جیسے خلق قرآن کے فتنہ کے وقت پوری عباسی خلافت میں بشمول امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ کے صرف پانچ علماء ہی حق پر کھڑے نظر آتے ہیں اور باقی تمام علماء نے حکومتی مؤقف کی پیروی یا خاموشی اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی [بحوالہ تاریخ ابن کثیر]۔ بہر کیف اس مضمون میں علمائے حق کی چند چیدہ علامات ضرور بیان ہوئیں ہیں، مگر راہ حق کے متلاشی کے لیے ان علامات سے استفادہ کی صورت میں علمائے حق کی پہچان اور پہچان کے بعد ان علمائے حق کی پیروی کی بنیاد اور میزان، یہی عقائد اور اعمال ہیں جن کا ذکر اس کتاب کے مختلف مضامین میں اجمالاً کیا گیا ہے۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہ و صحبہ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

فتنہ عظیم کی حقیقت

کیا مسیح دجال کے خروج اور عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا عقیدہ متفق الیہ ہے؟

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں میں کھڑے ہو کر پہلے اللہ کی ایسی تعریف کی جس کا وہ مستحق تھا پھر دجال کا ذکر کر کے فرمایا کہ "میں تمہیں اس سے ڈراتا ہوں اور **ہر نبی علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس سے ڈرایا ہے** اور نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو ڈرایا ہے لیکن میں تمہیں ایک ایسی بات بتاتا ہوں جو کسی نبی علیہ السلام نے اپنی قوم کو نہیں بتائی (اور وہ یہ ہے) کہ بیشک دجال کانا ہے اور اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے"۔ [صحیح بخاری ۔ جلد دوم ۔ انبیاء علیہم السلام کا بیان ۔ حدیث ۵۹۳]

مندرجہ بالا حدیث کے مطابق مسیح دجال کے خروج کا عقیدہ اپنے تواتر کی وجہ سے صرف اس امت کے بنیادی عقائد میں نہیں بلکہ ہر نبی علیہ السلام کی تعلیم میں شامل رہا ہے اور اس کا منکر صرف رسول اللہ ﷺ کا نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا منکر ہے۔

- ✓ آپ ﷺ نے فرمایا وہ (قیامت) ہرگز قائم نہ ہو گی یہاں تک کہ تم اس سے پہلے دس علامات دیکھ لو گے پھر دھوئیں، **دجال**، دابۃ الارض، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے اور **سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام** کے نازل ہونے اور یاجوج وماجوج اور تین جھگوں کے دھنسنے، ایک دھنسنا مشرق میں اور ایک دھنسنا مغرب میں، ایک دھنسنا جزیرہ العرب میں ہونے اور آخر میں یمن سے آگ نکلنے کا ذکر فرمایا جو لوگوں کو جمع ہونے کی جگہ کی طرف لے جائے گی۔ [صحیح مسلم ۔ جلد سوم ۔ فتنوں کا بیان ۔ حدیث ۲۷۸۴]

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بطور علامت قیامت اور قتل مسیح دجال بھی اس امت کے مسلمہ عقائد کا جزو رہا ہے۔ ان دونوں امور میں اختلاف فقط ان حضرات کے نصیب میں ہے جو زبردستی علماء کی فہرست میں

شامل تو ہونا چاہتے ہیں، مگر احادیث کی حجت پر کج روی کے باعث، اُمت کے متعدد متفق علیہ عقائد و مسائل سے کوسوں دور ہیں اور یہ محض ظنی عقل کو یقین والے نقلی علم پر فوقیت دینے کے سبب ہے۔

- ✓ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا [سورة النجم:۲۸] "حالانکہ ان کو اس کی کچھ خبر نہیں۔ وہ **صرف ظن پر چلتے ہیں**۔ اور ظن یقین کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔"

کیا مسیح دجال کسی شخصیت کا لقب ہے یا نظام کا؟

احادیث کی روشنی میں مسیح دجال کے ایک زندہ جیتی جاگتی شخصیت ہونے پر اہل علم میں کوئی اختلاف نہیں اور نہ ہی کسی باطل تاویل کی بنیاد پر اس کے انکار یا شک کرنے کی ضرورت۔ جہاں تک نظام کی دجالیت کا تعلق ہے، تو ہر فتنہ گر کا فتنہ صرف اس کی شخصیت کے باعث زود اثر نہیں ہوتا بلکہ اس میں اصل کردار اس ماحول کا ہوتا ہے جو اس فتنہ گر کے فتنہ کو ایندھن مہیا کرتا ہے۔ نمرود، فرعون، ابو جہل وغیرہ کے فتنوں کوئی حیثیت نہ ہوتی، اگر ان کے وقت کے نظام ان کے تابع نہیں ہوتے۔ اسی طرح مسیح دجال کے فتنے کی کوئی حیثیت یا اہمیت نہیں ہوتی اگر اس کے تابع وہ نظام نہ ہوں جن کے ذریعے وہ انسانوں کو گمراہ کر سکے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ماضی کے دجالوں کا فتنہ ان کے اپنے علاقوں تک محدود تھا، مگر مسیح دجال کا فتنہ عالمی نوعیت کے ہونے کے باعث کوئی ذی روح اس سے محفوظ نہیں رہے گا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

- ✓ "پیدائش آدم سے تاقیامت "دجال" سے **بڑا کوئی معاملہ [فتنہ] نہیں** ہے" [صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ فتنوں کا بیان۔ حدیث ۲۸۹۴]۔

مسیح دجال کی بحیثیت ایک شخصیت کے خروج سے پہلے اسے وہ میدان عمل چاہیے، جس کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے مطابق، وہ معاشرہ میں رزّاق؛ زندگی و موت کا مختار؛ جزا و سزا کا مالک ہونے کی بنیاد پر ربّ ہونے کا دعوی کر سکے گا۔ ان تمام دعووں کی بنیاد، وہ مادہ پرست نظام ہوں گے، جو اس آخر زمان میں لوگوں کی توجہ اور امیدوں کا محور ہوں گے۔

اور آج ہم اپنی آنکھوں سے ان نظاموں کا مشاہدہ کر رہے ہیں، جن کے ذریعے کفار تو کیا مسلمانوں کا بھی سارا توکل "**مسبب الاسباب**" سے ہٹ کر، محض "**اسباب**" پر رہ گیا ہے، مثلاً چند چیدہ نظام پیش خدمت ہیں؛

أ. **قرضوں کی بنیاد پر مبنی معاشی نظام[Debt based Economic System]؛**
اس نظام کا واحد مقصد اور مطمع نظر انسان کے سامنے اس کی لامحدود خواہشات کے حصول کو ممکن بناتے ہوئے، مصنوعی چمک والی دنیاوی ترقی کے حصول میں اس حد تک کوشاں رکھنا ہے کہ، دین کے معین کردہ معاشی معاملات میں حلال و حرام کی بحث ایک لایعنی امر قرار پا جائے۔ اس نظام کا ظاہر، انفرادی یا قومی سطح پر، دنیاوی ترقی کے حصول کے لیے، سودی یا غیر سودی قرضوں کی فراہمی ہے مگر باطنی اور اصل ہتھیار خالص سودی اور حرام اصولوں کی بنیادوں پر **قرض کی بنیاد پر تخلیق زر کا اختیار** ہے؛ جس کے باعث تمام ممالک معاشی طور پر اسی عالمی نظام کے غلام ہیں اور اس نظام کے مالکان [WB; IMF etc] جب چاہیں کسی بھی ملک کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں۔ جس کی عصر حاضر میں واضح مثال وینزویلا کی معاشی تباہی ہے۔

عصر حاضر میں ہر شخص [دینی و غیر دینی] چاہے یا نہ چاہے، اسی نظام کا اسیر ہے اور اپنی جائز یا ناجائز ضروریات یا خواہشات کے حصول کے لیے اسی ایک دجالی نظام کے ساتھ منسلک رہنے پر مجبور ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛

- ✓ "جب ایسا دور آئے گا کہ لوگ سود کھائیں گے اور **جو شخص سود نہیں کھائے گا تو اس پر بھی سود کا غبار پڑ جائے گا** یعنی سود اگر خود نہیں کھائے گا تو اس پر سود کا اثر تو پہنچ ہی جائے گا"۔ [سنن نسائی۔ جلد سوم۔ خرید و فروخت کے مسائل و احکام۔ حدیث ۷۶۴]

ب. **تقدیر اور توکل کی نفی کی بنیاد پر طبی نظام؛** میڈیکل سائنس کی ظاہری ترقی نے انسان کی آنکھوں کو اتنا چندھیاں دیا ہے کہ اللہ سبحان و تعالیٰ کی تقدیر اور اس پر توکل محض زبانی کلام کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ آج اکثریت اپنی بیماریوں سے شفا صرف اسی طبی نظام کی مرہون

منت سمجھتے ہیں اور حقیقی "شافی الامراض "کا خیال اور اس کے شکر کا احساس بھی ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ زندگی اور موت کا اختیار تک ذہنی اور عملی طور پر اس نظام کے حوالے کر دیا ہے؛ جس کی بہترین مثال کرونا وائرس اور اس سے بچاؤ کے لیے ہمارے انفرادی و اجتماعی رد عمل میں تھا؛ جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے اقوال سے زیادہ اس طبی نظام کے مالکان [W.H.O.] کے فرمان ہمارے لیے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اپنی استطاعت کے مطابق علاج کا حصول سنت رسول ﷺ ہے، مگر اس کے حصول کے لیے اپنی استطاعت سے بڑھ کر، قرض یہاں تک کہ بھیک مانگنے سے بھی گریز نہیں کرنا اور اپنے وسائل کی کمی کو ہی اپنی موت کا سبب گردانا، اس طبی نظام پر اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اعتماد کا مظہر ہے۔

ت. **دجل کی بنیاد پر ذرائع ابلاغ کا نظام؛** اس نظام کا مقصد ہی معاشرہ میں گمراہی؛ فحاشی؛ منکر کے فروغ اور معاشرہ کو فروعی اور غیر اہم معاملات میں الجھائے رکھنا ہے تا کہ اکثریت پر ان دجالی نظاموں کی اصل حقیقت اور دین حق کی حقانیت واضح نہ ہو سکے۔ عصر حاضر میں الیکٹرونک میڈیا؛ پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا یا انٹرنٹ جیسے ذرائع ابلاغ پر صرف انہی دینی و دنیاوی شخصیات اور اسی معلومات کو حق اور سچ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو ان باطل اور دجالی نظاموں کی ترویج کا باعث ہوں یا کم از کم ان کے لیے باعث خطرہ نہ ہوں۔ اس نظام کی اصل حقیقت مندرجہ ذیل حدیث سے زیادہ بہتر انداز میں پیش نہیں کی جا سکتی؛

- ✓ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا **خروجِ دجال سے پہلے کچھ سال دھوکے والے ہوں گے، جن میں سچے کو جھوٹا اور جھوٹے کو سچا قرار دیا جائے گا،** امین کو خائن اور خائن کو امین سمجھا جائے گا، اور اس میں "رویبضہ "بڑھ چڑھ کر بولے گا، کسی نے پوچھا کہ رویبضہ سے کیا مراد ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا فاسق آدمی امور عامہ میں دخل اندازی کرنے لگے گا۔

[مسند احمد۔ جلد پنجم۔ حدیث ۲۲۶۱]

اسی حدیث اور اپنے ذرائع ابلاغ کے تقابلی جائزہ سے ہر صاحب دل بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ہم انسانی تاریخ کے کس نازک موڑ پر کھڑے ہیں۔

ث. **کیمیائی کھادوں اور جینیاتی طور پر ترمیم شدہ بیجوں کی بنیاد پر زرعی نظام؛** کیمیائی کھادیں اور جینیاتی طور پر ترمیم شدہ بیجوں کے مستقل استعمال کے منفی اثرات سے زرعی ماہرین بخوبی واقف ہیں اور آج اسی لیے ہماری زمینیں اپنی قدرتی پیداواری صلاحیت سے محروم ہو چکنے کے باعث اپنی مصنوعی پیداوار کے لیے مکمل طور پر کفار کی مہیا کردہ زرعی ٹیکنالوجی پر انحصار کیے ہوئے ہیں؛ اور اسی نظام کی عالمی سطح پر ترویج کی بدولت آج ہر کاشتکار نے زیادہ پیداوار اور منافع کی لالچ میں اپنے ہاتھوں قدرتی بیج اور کھاد والی آزادی کو بیچ دیا ہے اور اب ہر ملک کی زرعی پیداوار اس نظام کے مالکان کی نظر کرم کی محتاج ہو گئی ہے۔

ج. **سائنس و ٹیکنالوجی کی بالادستی اور نفس پرستی کے بنیاد پر تعلیمی نظام؛** اس نظام کی حیثیت کُل دجالی نظام میں اس پیداواری کارخانہ کی سی ہے جس کی مستقل پیداوار ہی اس کُل نظام کی بقا کے لیے لازم ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظام تعلیم کے ذریعے ان افراد کی تعلیم و تربیت اس نہج پر کی جاتی ہے کہ ان کے نزدیک ان باطل نظاموں کے قائم رہنے میں ہی ان کی انفرادی بقا کا دارومدار ہو اور اس تعلیمی نظام سے استفادہ ہی ان کے نزدیک حصول رزق کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہو اور اس سے محرومی رزق سے محرومی کے مترادف ہو۔

عصر حاضر میں سائنس و ٹیکنالوجی نے باقاعدہ ایک میزان کی شکل اختیار کرلی ہے، جس پر دین کے ہر عقیدہ، قول اور فعل کو تولے جانے کے بعد ہی اس کو قابل قبول سمجھا جاتا ہے، ورنہ ردّ کرنے سے پہلے، باطل اور فاسد تاویلوں سے دینی حقائق کی سائنس و ٹیکنالوجی سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چند ممالک میں موجود دینی تعلیم نظام گو اس دنیاوی تعلیمی نظام کے دائرہ سے باہر ہے مگر اس سے بہرہ مند ہونے والے افراد کی اکثریت کا تعلق معاشرہ کے محروم طبقہ سے ہونے کے باعث اس کے حاملین کی اکثریت عملی زندگی میں اپنی بقا، دنیاوی تعلیمی نظام کے حامل متوسط اور اعلی طبقہ کی مرہون منت سمجھتی ہے اور چونکہ اس سے استفادہ کرنے والے افراد کا تناسب عالمی سطح پر رائج تعلیمی نظام کے حجم کے سامنے انتہائی قلیل ہے اسی لیے معاشروں میں باہمی اور اجتماعی سطح پر اس متبادل تعلیمی نظام کا کوئی بھی اثر مفقود ہے۔

ح. **اللہ سبحان و تعالیٰ سے بغاوت کی بنیاد پر حکومتی نظام؛** اس نظام کا نصب العین اپنے اپنے علاقوں میں عالمی سطح پر رائج شدہ دجالی اور باطل نظاموں کی ترویج اور انسانی قوانین کی بنیاد پر عدالتی اور جزا و سزا کے نظام کے ذریعے ان نظاموں کا تحفظ۔ انفرادی ممالک میں اس نظام کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً جمہوریت، کمیونزم؛ مارشل لا؛ بادشاہت وغیرہ، مگر یہ تمام شکلیں عالمی سطح پر صرف اسی وقت تک قابل قبول ہیں جب تک یہ نظام اپنی حقیقت میں اللہ سبحان و تعالیٰ سے بغاوت کی بنیاد پر ہوں اور عالمی سطح پر رائج دجالی اور باطل نظاموں کی ترویج اور ان کا تحفظ میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے پر تیار ہوں۔ جو ملک بھی ان دجالی اور باطل نظاموں سے محض ملکی سطح پر بھی بغاوت کا مرتکب ہو، تو یہ بظاہر مخالف حکومتی نظام مل کر اس کے خاتمہ کی کوشش میں شریک ہو جاتے ہیں؛ جس کی عصر حاضر میں بہترین مثال افغانستان کی اسلامی حکومت کے خلاف کفار و منافقین کا عالمی اتحاد۔

رسول اللہ ﷺ کی مندرجہ ذیل حدیث جس میں دور حکومت کے پانچ ادوار کا ذکر ہے؛ اس میں تیسرے اور چوتھے ادوار میں بظاہر فرق ظلم کے طریق کار اور اس کی نوعیت کا ہے؛

✓ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا تمہارے درمیان **نبوت** موجود رہے گی پھر اللہ اسے اٹھانا چاہئے گا تو اٹھالے گا پھر **طریقہ نبوت پر گامزن خلافت** ہو گی اور وہ بھی اس وقت رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا پھر اللہ اسے اٹھانا چاہئے گا تو اٹھالے گا پھر **کاٹ کھانے والی حکومت** ہو گی اور وہ بھی اس وقت رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا پھر اللہ اسے اٹھانا چاہئے گا تو اٹھالے گا اس کے بعد **جبر کی حکومت** ہو گی اور وہ بھی اس وقت رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا پھر اللہ اسے اٹھانا چاہئے گا تو اٹھالے گا پھر **طریقہ نبوت پر گامزن خلافت** آ جائے گی پھر نبی کریم ﷺ خاموش ہو گئے"۔ [مسند احمد۔ جلد ہشتم۔ حدیث ۲۸۷]

مسلمان معاشرے ملوکیت و خلافت کے دور میں کفار کے مد مقابل کم از کم ایک منفرد حکومتی نظام کے علم بردار تھے اور ظلم کا عمومی طریق کار ظالم و مظلوم میں براہ راست نوعیت کا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا دائرہ

کار بھی ظالم کی پہنچ تک محدود تھا۔ بر خلاف ۱۹۲۳ میں سقوط خلافت کے بعد قومیت کی بنیاد پر قائم مسلمان ممالک میں وہ غیر مرئی عالمی حکومتی نظام نافذ ہے، جس کی بنیاد سورۃ لقمان کی آیت [۔۔۔۔إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ] کی روشنی میں شرک کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے بغاوت پر ہے؛ اسی لیے جو حکومت شرکیہ نظام کی بنیاد پر قائم ہو گی وہ بلاشبہ **ظلم و جبر کی حکومت** ہو گی اور اس کے جبر کا شکار براہ راست نہ صرف معاشرہ کا ہر شخص ہے بلکہ اجتماعی طور پر اقوام بھی ہیں۔ مثلاً اسی غیر مرئی عالمی نظام کے تحت جب ایک مسلمان ملک یا مسلمان افراد کو عالمی سطح پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو باقی تمام اسلامی ممالک اس غیر مرئی عالمی نظام کی جبری اتباع کو اپنے آپ پر لازم ٹھہراتے ہوئے، باوجود استطاعت اور نیت کے، اپنے ہی اسلامی بہنوں اور بھائیوں کی مدد کو حرام قرار دیتے ہیں؛ حتّٰی کہ انفرادی سطح پر بھی اس عالمی نظام کے جبر کے آثار اور مثالیں ہر اہل بصیرت مسلم و غیر مسلم شخص پر واضح ہیں؛ جن کی بدولت اکثریت بظاہر اپنے اعمال میں آزاد نظر آنے کے باوجود عمومی طور پر اس عالمی نظام کی اتباع پر مجبور رہے۔

اب یہ سارے دجالی، باطل اور شرکیہ نظام جس ہستی کو اپنے تمام تر وسائل پیش کریں گے تو آخر اس دنیا میں اس کو ربّ ہونے کے دعوے سے اور اکثریت کو اس کے اس دعوے کو قبول کرنے سے بھلا کون روکے گا۔ جو ان دجالی نظاموں کا جتنا اسیر ہو گا اتنا ہی یہ فتنہ اس کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گا۔ الا ما شاء اللہ۔ خصوصاً اس فتنہ کا شدید ترین زور ان کفار ممالک میں ہو گا جو ان باطل اور دجالی نظاموں کے علم بردار ہیں اور ان ممالک میں رہائش پذیر مسلمان ہی اس کا اولین نشانہ ہیں اور ہوں گے۔

اگر مسیح دجال کی دین میں اتنی اہمیت ہے تو قرآن میں اس کا ذکر کیوں نہیں ہے؟

اس طرح کے سوالات صرف ان افراد کا خاصہ ہے جن کے سامنے احادیث کا معاملہ شیطان نے مشتبہ کر دیا ہے؛ ورنہ اہل سنت والجماعہ کے نزدیک قرآن اور حدیث دونوں ہی سنت رسول ﷺ میں شامل ہونے کے باعث دین کے بنیادی اور ہم پلہ اساس ہیں۔ بہر کیف مندرجہ ذیل حدیث پر غور کرنے سے احساس ہوتا ہے

کہ دس میں سے صرف تین علامات قیامت کا ذکر قرآن میں موجود ہے [یعنی دابۃ الارض؛نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور خروج یاجوج وماجوج]۔

- ✓ ہمارے پاس نبی ﷺ تشریف لائے اور ہم باہم گفتگو کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا تم کس بات کا تذکرہ کر رہے ہو انہوں نے عرض کیا ہم قیامت کا تذکرہ کر رہے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا وہ ہر گز قائم نہ ہو گی یہاں تک کہ تم اس سے پہلے دس علامات دیکھ لو گے پھر دھوئیں، دجال، "**دابۃ الارض**"، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے اور "**سیدنا عیسیٰ بن مریم کے نازل**" ہونے اور "**یاجوج وماجوج**" اور تین جگہوں کے دھنسنے، ایک دھنسنا مشرق میں اور ایک دھنسنا مغرب میں، ایک دھنسنا جزیرہ العرب میں ہونے اور آخر میں یمن سے آگ نکلنے کا ذکر فرمایا جو لوگوں کو جمع ہونے کی جگہ کی طرف لے جائے گی۔ [صحیح مسلم۔ جلد سوم ۔ فتنوں کا بیان ۔ حدیث ۲۷۸۴]

اس کی بظاہر وجہ یہی ہے کہ یہ تینوں نشانیاں معجزات کے قبیل سے ہیں اور تمام لوگوں پر صریح اور بیّن حجت قائم کریں گے اور لوگ ان کی عقلی توجیہ کرنے سے قاصر ہوں گے، بر خلاف باقی سات علامات کے جن کی حقانیت صرف اہل حق پر ہی منکشف ہو گی اور عمومی طور پر ان کی عقلی توجیہ موجود ہونے کے باعث گمراہی عام رہے گی۔

احادیث میں سورۃ الکہف کا خصوصاً؛ مسیح دجال سے باہمی ربط کیوں بیان کیا گیا ہے؟

احادیث میں مسیح دجال کے فتنہ سے مامون رہنے کے لیے؛ سورۃ الکہف کی ابتدائی دس آیات؛ آخری دس آیات؛ پہلی تین آیات اور پوری سورت کی تلاوت کا ذکر ملتا ہے۔ جن میں پہلے دو اذکار کا تعلق صحیح احادیث اور آخری دو کا تعلق ضعیف احادیث سے ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا ان اذکار کی زبانی تلاوت ہمیں اس فتنہ عظیم سے مامون رکھنے کی ضامن ہے یا عملی تلاوت؟ سورۃ کہف میں بیان کردہ چار قصص، فکری اور عملی لحاظ سے کسی بھی فتنہ سے مامون رہنے کے لیے ایک عظیم مشعل راہ ہیں، مثلاً۔۔۔۔

اصحاب کہف کی طرح؛ ایک مومن کے لیے ایمان کی دولت کے سامنے باقی تمام دنیاوی دولتیں؛ آسانیاں اور آسائشیں ہیچ ہیں اور اس ایمان کو بچانے کی خاطر، وہ محض اللہ توکل، ہر وقت ہجرت کے لیے تیار ہوتا ہے۔

باغ والے کے قصص کی روشنی میں؛ صاحب ایمان اور عقل والوں کے لیے، اپنے رب کی نافرمانی اور اپنے ایمان کی نفی کی بنیاد پر، کسی بھی قسم کی دنیاوی ترقی کوئی کامیابی کا معیار نہیں ہوتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے قصص کی روشنی میں؛ صاحب ایمان افراد کی نظر تکوینی امور کے بجائے شرعی امور پر ہوتی ہے کیونکہ وہ بخوبی ادراک رکھتے ہیں کہ پیش آمدہ حالات و فتن کے نتائج محض اللہ سبحان و تعالیٰ کے تابع ہیں اور اللہ سبحان و تعالیٰ نیکوں کاروں کو اس دنیا میں باطل کے ہاتھوں رسوا اور تنہا نہیں چھوڑتا۔

ذوالقرنین کی طرح؛ کچھ فتنوں کی نوعیت اس معیار کی ہوتی ہے کہ طاقت کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر ان کا سد باب ممکن نہیں ہوتا۔

ان قصص میں پہلا اور آخری قصص عملی نوعیت کے ہیں جبکہ دوسرا اور تیسرا قصص فکری نوعیت کے۔ اسی لیے فتنوں کی نوعیت کے مطابق کبھی محض فکری اصلاح لازمی ہوتی ہے اور کبھی عملی۔ مگر مسیح دجال کے مقابل میں دینی و دنیاوی کامیابی کا دارومدار ان چاروں نوعیت کی اصلاحوں پر مبنی ہے۔

کیا تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ مسلمان بھی مسیح دجال کی پیشانی پر "کافر" کو پڑھ لینے کے باوجود اس کی پیروی کریں گے؟

- ✓ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ نے جو نبی بھی بھیجے، انہوں نے اپنی قوم کو کانے اور جھوٹے سے ڈرایا، وہ [دجال] کانا ہے اور تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے۔ اس [دجال] کی دونوں آنکھوں کے درمیان **کافر لکھا ہوا** ہے"۔ [صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ توحید کا بیان۔ حدیث ۲۳۰۶]
- ✓ ابن شہاب نے کہا مجھے عمر بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ اسے رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ نے خبر دی کہ آپ ﷺ نے دجال سے ڈراتے ہوئے اس دن فرمایا" اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوا ہو گا، جسے وہی پڑھ سکے گا **جو اس کے عمل کو ناپسند کرتا ہو گا یا ہر مومن** اسے پڑھ سکے گا" اور آپ ﷺ نے فرمایا" تم میں سے کوئی بھی اپنے رب العزت کو مرنے تک ہرگز نہ دیکھ سکے گا"۔ [صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ فتنوں کا بیان۔ حدیث ۲۸۵۵]

مندرجہ بالا احادیث میں اس بات کا اثبات بھی موجود ہے کہ دجال کی دونوں آنکھوں کے درمیان "کافر" تحریر ہو گا اور اس سوال کا جواب بھی کہ اس تحریر کو فقط وہی مسلمان پڑھ سکے گا جو مومن ہو گا اور دجال کے عمل کو ناپسند کرتا ہو گا، یعنی کم از کم ایمان کے اس درجہ پر ہو گا جس میں وہ برائی کی پہچان رکھتا ہو گا اور اس کو دل میں بھی برا جانے گا۔ مگر موجودہ دور میں اس سوال کا اصل جواب تو بذات خود ایک دوسرے سوال میں پنہاں ہے کہ "کتنے مسلمان فتنہ دجال سے بچنا چاہتے ہیں؟"

- ✓ حضرت حذیفہ ﷛ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے سامنے دجال کا تذکرہ ہو رہا تھا نبی کریم ﷺ نے فرمایا "میرے نزدیک تمہارے حق میں **دجال کے فتنے سے زیادہ آپس کے فتنے** سے خطرہ ہے، جو شخص دجال کے فتنے سے قبل، اس فتنے سے بچ گیا، تو وہ فتنہ دجال سے بھی بچ جائے گا اور جب سے دنیا بنی ہے، **ہر چھوٹا بڑا فتنہ دجال کے فتنے کے لئے ہی بنایا گیا ہے**"۔ [مسند احمد ۔ جلد نہم ۔ حدیث ۳۲۸۹]

مندرجہ بالا حدیث کے مطابق تو فتنہ دجال سے بچنے کی کوشش ایک مسلسل عمل ہے اور جو شخص اپنے زمانہ کے فتنوں سے آگاہ رہا اور ان سے بچنے کی کوشش کرتا رہا، وہی شخص امید کر سکتا ہے کہ اللہ سبحان و تعالٰی فتنہ دجال سے اس کو محفوظ فرمائیں گے۔

شیطان اپنے ہزاروں سال کے تجربے کی بنیاد پر ہر زمانہ کے فتنوں کی ظاہری شکل میں تبدیلی لاتا رہتا ہے، اگرچہ باطنی طور پر ان تمام فتنوں کی بنیاد، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی ہے۔ اسی لیے ان فتنوں کی پہچان کا اصل اور واحد ذریعہ قرآن اور حدیث کا علم ہے۔ اسی وجہ سے علمائے حق کی پہچان مجھ جیسے تمام عام مسلمانوں کے لیے لازم و ملزوم ہو جاتی ہے کیونکہ انسان کی عقل اور تجربہ شیطان کے سامنے انتہائی محدود ہے اور اللہ سبحان و تعالٰی کی مدد اور اس کی طرف سے ہدایت کے بغیر ان فتنوں سے بچنا ناممکن ہے۔ مثلاً موجودہ دور میں، دنیاوی مال و متاع کے لیے ہجرت اور مغربی ممالک کی شہریت کے حصول کی شکل میں کفر کے اثبات اور توحید کے قطعی انکار کی ایسی واضح مثالیں تمام مسلمان معاشروں میں موجود ہیں، کہ وقت آنے پر مسلمانوں کا دجال کی پیروی اور اس کو بوقت ضرورت "ربّ" مان لینے والی بات کوئی اچنبھے والی محسوس نہیں ہوتی۔

عقیدہ مسیح دجال کی عصر حاضر میں کیا اہمیت ہے؟

قرآن اور احادیث میں موجود ہر علم کی حیثیت محض علمی نہیں بلکہ عملی ہے؛ رسول اللہ ﷺ کی تمام مستقبل کی اخبار صحیحہ کا مقصد ہر مسلمان کے لیے آنے والے فتنوں سے اپنے عقائد و اعمال کی مستقل حفاظت ہے نہ کہ ذہنی تفریح کا ذریعہ۔ مسیح دجال سے متعلق اخبار صحیحہ کا بھی اصل مقصد اپنی شخصیت میں خروج دجال سے پہلے ان اوصاف کو پروان چڑھانا مطلوب ہے جو کم از کم اس کو آخرت میں خسارہ پانے والوں کی فہرست سے محفوظ رکھے۔

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین چیزوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد کسی ایسے آدمی کا **ایمان لانا اس کے لئے فائدہ مند نہیں ہو گا** جو کہ ان سے پہلے ایمان نہ لایا ہو یا نیک کام کیا ہو ان تین میں سے ایک سورج کا مغرب سے نکلنا دوسرے **دجال** کا نکلنا تیسرے دابۃ الارض کا نکلنا ہے۔ [صحیح مسلم۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۳۹۸]

دجال کے زمانہ فتن میں مطلوب اور بہترین ایمان کی تشریح مندرجہ ذیل حدیث میں بیان کی گئی ہے؛

- ✓ نبی ﷺ نے دجال کے متعلق ایک طویل حدیث بیان کی اس میں یہ بھی بیان کیا کہ دجال مدینہ کی ایک کھاری زمین پر آئے گا اور اس پر مدینہ کے اندر داخل ہونا حرام کر دیا گیا ہے۔ اس دن اس کے پاس **ایک شخص آئے گا جو بہترین لوگوں میں سے ہو گا**۔ اور کہے گا میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہی دجال ہے **جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ہم سے حدیث بیان** کی ہے۔ دجال کہے گا اگر میں اس شخص کو قتل کر کے پھر وہ زندہ کر دوں تو پھر میرے معاملہ میں تجھے شک تو نہ ہو گا، لوگ کہیں گے نہیں، چنانچہ وہ اس کو قتل کرے گا اور پھر وہ زندہ کرے گا جب وہ اس کو زندہ کرے گا تو **وہ شخص کہے گا واللہ آج سے پہلے مجھے اس سے زیادہ متعلق حال معلوم نہ تھا تو ہی دجال ہے** پھر دجال کہے گا میں اسے قتل کرتا ہوں لیکن اسے قدرت نہ ہو گی۔ [صحیح بخاری۔ جلد اول۔ عمرہ کا بیان۔ حدیث ۱۸۰۸]

اس حدیث سے دو باتیں روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہیں؛

- اول کہ ایمان کا دار ومدار محض قرآن پاک میں موجود آیات پر نہیں بلکہ احادیث صحیحہ بھی کامل اور بہترین ایمان کے لیے لازم وملزوم ہیں، کیونکہ اس شخص نے محض رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی بنیاد پر مسیح دجال کو جھٹلایا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کے بہترین ہونے کی گواہی دی۔
- اور دوم کہ ایمان کے بعد اس شخص کو کوئی شعبدہ، مشاہدہ، سائنس و ٹیکنالوجی کے پیش کردہ ظنّی حقائق، حتّٰی کہ سب سے بڑھ کر اپنے ذاتی نفس پر گزرا ہوا دجالی تجربہ بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرامین سے متزلزل نہیں کر سکا۔

انہی اوصاف والے ایمان کے حصول کی ہر اس مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے جو آخرت کی رسوائی اور جہنم کے حقیقی خطرہ سے خوف زدہ ہے۔

دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ دجال اور امام مہدی سے متعلق احادیث کے مجموع میں زمانی اور مکانی ربط تلاش کرنا اور وجہ تطبیق بیان کرنا بلاشبہ دین کے نہ صرف مشکل ترین علوم میں سے ہے؛ بلکہ کوئی حتمی آرا قائم کرنا شاید ناممکنات میں سے ہے۔ مگر اس علم کے حصول کا سب سے بڑا فائدہ مندرجہ ذیل حدیث میں بیان ہوا ہے؛ جس کے مطابق جب بھی کوئی حدیث اپنی جامعیت میں ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کا فائدہ صرف اہل علم کو ہی ہوتا ہے اور وہ مزید اپنے ایمان کی حفاظت کی فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

- ✓ نبی ﷺ نے ہم لوگوں کے سامنے خطبہ دیا تو قیامت تک ہونے والی کوئی بات نہیں چھوڑی، جس کو یاد رکھنا تھا، اس نے یاد رکھا اور جس کو بھولنا تھا وہ بھول گیا اگر میں **کوئی ایسی چیز دیکھ لیتا ہوں** جس کو میں بھول گیا ہوتا ہوں تو میں اسے ایسے پہچانتا ہوں جس طرح کہ ایک شخص (کسی کو) پہچانتا ہے، جب وہ غائب ہو جاتا ہے پھر اس کو جب دیکھتا ہے تو پہچان لیتا ہے۔ [صحیح بخاری ۔ جلد سوم ۔ تقدیر کا بیان ۔ حدیث ۱۵۴۳]

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارک و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم اللہ الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

امام مہدی کی حقیقت

کیا امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور متفق الیہ عقیدہ ہے؟

اہل سنت والجماعۃ کے تمام سلف وخلف علماء کا متعدد صحیح وحسن احادیث کی بنیاد پر امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کا قرب قیامت کی آخری علامت صغریٰ ہونے پر اتفاق ہے؛ بجز چند اشخاص کے۔ صحیحین میں امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے لقب کا ذکر نہ ہونے کے باوجود، صحیحین کی احادیث کے مطالعے سے ایک بات تو واضح ہوتی ہے کہ مسیح دجال کے خروج اور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے نزول کے وقت تمام مومن مسلمانوں کا ایک متفقہ امام ہو گا اور صحاح ستہ اور احادیث کی بقیہ کتابوں میں اسی امام کو امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ [یعنی ہدایت یافتہ امام؛ جن کا اصل نام محمد رحمۃ اللہ علیہ بن عبداللہ ہو گا] کے لقب سے ذکر کیا گیا ہے۔

- ✓ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہارا اس وقت کیا حال ہو گا جب ابن مریم علیہ السلام تم میں نازل ہوں گے اور **تمہارا امام تم ہی میں سے ہو گا**"۔ [صحیح بخاری۔ جلد دوم۔ انبیاء علیہم السلام کا بیان۔ حدیث ۷۰۹]
- ✓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کی خاطر لڑتا رہے گا اور قیامت تک غالب رہے گا" اور فرمایا کہ "پھر حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اتریں گے **لوگوں کا امیر** ان سے نماز پڑھانے کے لے عرض کرے گا آپ علیہ السلام فرمائیں گے کہ نہیں بلکہ تم ایک دوسرے پر امیر ہو یہ وہ اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عطا فرمایا ہے"۔ [صحیح مسلم۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۳۹۵]

امام مہدی رحمہ اللہ علیہ کا امت مسلمہ میں کیا مقام ہو گا؟

- ✓ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا تمہارے درمیان **نبوت** موجود رہے گی پھر اللہ اسے اٹھانا چاہے گا تو اٹھا لے گا پھر **طریقہ نبوت پر گامزن خلافت** ہو گی اور وہ بھی اس وقت رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا پھر اللہ اسے اٹھانا چاہے گا تو اٹھا لے گا پھر **کاٹ کھانے والی حکومت** ہو گی اور وہ بھی اس وقت رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا پھر اللہ اسے اٹھانا چاہے گا تو اٹھا لے گا اس کے بعد **ظلم وجبر کی حکومت** ہو گی اور وہ بھی اس وقت رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا پھر اللہ اسے اٹھانا چاہے گا تو اٹھا لے گا پھر **طریقہ نبوت پر گامزن خلافت** آجائے گی پھر نبی کریم ﷺ خاموش ہو گئے"۔ [مسند احمد۔ جلد ہشتم۔ حدیث ۲۸۷]

اس قبیل کی احادیث کی ضمن میں اہل علم کی دو آرا کا ذکر ملتا ہے؛ اول کہ خلافت علی منہاج النبوۃ کے دور کا آغاز حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے نزول سے ہو گا اور دوم کہ اس بابرکت دور کا آغاز امام مہدی رحمہ اللہ علیہ کے ظہور سے ہی ہو جائے گا۔ چند ظنی دلائل کی بنیاد پر میرا غالب گمان یہی ہے کہ اس بابرکت دور کا آغاز امام مہدی رحمہ اللہ علیہ کے ظہور سے ہی ہو جائے گا مگر عروج و تکمیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر نصیب ہو گا؛ جیسا کہ اسلامی حکومت کا برکتوں کی آغاز رسول اللہ ﷺ کی ہجرت مدینہ سے شروع ہو گیا تھا مگر عروج فتح مکہ پر نصیب ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا اس امت پر خصوصی انعام ہے، کہ ماضی کی امتوں کی طرح یہ امت مکمل طور پر گمراہ نہیں ہو گی اور اس امت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا؛ امام مہدی رحمہ اللہ علیہ، دجالی فتنوں کے عروج کے دور، خروج مسیح دجال سے پہلے، میں اسی طائفہ منصورہ کے امیر اور حق کے علم بردار کے طور پر ظہور کریں گے۔

مسیح دجال بمطابق احادیث صحیحہ کے، قرب قیامت کی علامات کبریٰ کی پہلی نشانی ہے اور امام مہدی رحمہ اللہ علیہ قرب قیامت کی علامات صغریٰ کی آخری نشانی؛ یعنی مسیح دجال کے ظہور سے پہلے، حق پرست مسلمان ایک امیر کی بیعت کر کے "خلافت علی منہاج النبوۃ" کی شکل میں، ایک قوت کے طور پر عالمی دجالی نظام سے بغاوت کی شکل میں دنیا کے سٹیج پر ابھر چکیں ہوں گے اور یقیناً یہ اللہ کی مستقل سنت کے عین مطابق ہے،

تاکہ عصر حاضر کے نفس پرست اور اختیاری جہالت کے حامل مسلمانوں کی طرح، ان کے دور کے مسلمانوں پر بھی حجت قائم ہو سکے اور عصر حاضر کی طرح گمراہ صرف وہی ہو جو حق کی روشنی موجود ہونے کے باوجود باطل کے اندھیروں کو ترجیح دے۔

مزید چونکہ امام مہدی رحمہ اللہ پر اس امت کے آخری مجدد ہونے پر تقریباً اجماعی کیفیت ہے اور ان کی امارت کا ذکر بھی احادیث میں تواتر سے ہے، تو غالب گمان یہی ہے کہ، زندگی کے ہر شعبہ پر محیط اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بغاوت پر مبنی عالمی دجالی نظام کے خلاف، اس زمین پر "خلافت علی منہاج النبوۃ" کی صورت میں خالص اللہ کی بندگی اور اجتماعی سطح پر اس کی کبریائی کا عملی بیان و قیام ہی امام مہدی کے تجدید دین کے فرائض منصبی میں سے ہو گا۔

امام مہدی کا طریقہ انقلاب کیا ہو گا؟

یہ دین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مکمل ہو چکا۔ اس دین کے مطلوب دینی و دنیاوی مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعے مہر لگ چکی اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا وعدہ بھی صرف انہی افراد، جماعتوں اور گروہ کے ساتھ ہے جو اس حقیقت کی اہمیت اور سچائی کو نظریاتی، قولی اور عملی طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔

امام مہدی رحمہ اللہ کی دین میں حیثیت مجدد کی ہے نہ کہ موجد کی اور اسی لیے ان کی تمام تر جہد وجہد کا منبع و مخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی ہو گی۔ جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ سے ایک مشہور قول منسوب ہے کہ

- ✓ "اس امت کے **آخری** حصہ کی اصلاح اسی طرز پر ممکن ہے، جس طرز پر **پہلے** حصہ کی اصلاح ہوئی تھی"

امام مہدی رحمہ اللہ سے متعلق احادیث کے مجموع پر غور کرتے ہوئے تین ایسی باتیں واضح ہوتی ہیں، جو اس امت کے پہلے حصہ کا خاصہ تھیں مگر زمانہ کے حوادث اور نفسانی خواہشات کے زور نے ان امور کا تصور اور اہمیت بھی امت مسلمہ کی اکثریت کے ذہنوں سے محو کر دیا ہے۔ ظنی دلائل کی بنیاد پر گمان غالب یہی ہے امام مہدی رحمہ اللہ کی تمام تر کاوشوں کی بنیاد یہی تین امور ہوں گے ؛

أ. **خالص توحید کی بنیاد پر حکومتی نظام کا قیام؛** امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے ظہور سے اسلام کو وہ قیادت دوبارہ نصیب ہو گی، جو مسلمانوں کو قومیت، فرقہ بندی، برادری، خاندان، زبان، رنگ و نسل وغیرہ کے بجائے ہر قسم کی طاغوت کی بندگی اور اطاعت سے پاک خالص توحید کی بنیاد پر، باطل عالمی دجالی نظام کے خلاف، ایک حکومتی نظام یعنی "خلافت علی منہاج النبوۃ" کے سائے تلے متحد کرے گی۔

ب. **ہجرت فی سبیل اللہ؛** امت کے اول حصہ کے لیے فتح مکہ سے قبل، مدینہ کی طرف ہجرت فی سبیل اللہ، قرآن و حدیث کے حکم کے مطابق فرض تھی، جس میں کم از کم تین حکمتیں تو روز روشن کی طرح واضح ہیں؛

- ایک امت کے طور پر مسلمانوں کی اجتماعیت کا مظہر۔
- دشمنوں کے لیے باعث ہیبت۔
- جہاد فی سبیل اللہ کے لیے افرادی قوت کی تیاری۔

انہی تین حکمتوں کی واضح جھلک رسول اللہ ﷺ کے مندرجہ ذیل فرمان میں نظر آتی ہیں جو امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کے لیے ہجرت کو واجب ٹھہرا رہے ہیں۔

✓ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "۔۔۔۔ بلکہ میرے اہل بیت میں سے ایک مرد کے حوالہ کر دیں گے وہ [زمین کو] عدل و انصاف سے بھر دے گا جیسا کہ اس سے قبل لوگوں نے زمین کو جور و ستم سے بھر رکھا تھا سو تم میں سے جو شخص ان کے زمانہ میں ہو تو ان کے ساتھ ضرور شامل ہو اگر برف پر **گھٹنوں کے بل گھسٹ کر جانا پڑے**۔" [سنن ابن ماجہ۔ جلد سوم۔ فتنوں کا بیان۔ حدیث ۹۶۲]

✓ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ "تمہارے خزانے کے پاس تین آدمی لڑیں گے، تینوں خلیفہ کے بیٹے ہوں گے مگر وہ خزانہ کسی ایک کو بھی نہیں ملے گا پھر مشرق کی طرف سے سیاہ جھنڈے آئیں گے اور وہ تمہیں ایسا قتل کریں گے کہ ویسا کسی نے قتل نہ کیا ہو۔۔۔۔ جب تم اسے دیکھو تو اس کی **بیعت کر لینا** خواہ تمہیں برف پر **گھسٹ کر ہی جانا پڑے** کیونکہ وہ اللہ کا خلیفہ مہدی ہو گا۔" [المستدرک۔ جلد ۶۔ کتاب الفتن و الملاحم۔ حدیث ۸۴۳۲]

ت. **جہاد فی سبیل اللہ؛** امام مہدی رحمہ اللہ کے دور کا یہ سب سے نمایاں وصف ہے جو تقریباً اس موضوع کی تمام احادیث میں بیان ہوا ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی نفیر عام ہو گی، تمام برحق جہادی قوتیں ان کے جھنڈے تلے جمع ہو کر باطل سے نبر آزما ہوں گی۔ مومنین کی آزمائشیں بھی ہوں گی؛ پھر فتوحات بھی نصیب ہوں گی؛ مال غنیمت بھی تقسیم ہو گا؛ قسطنطنیہ فتح ہو گا اور آخر ذکر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی امامت کے نیچے مسیح دجال کے ساتھ جہاد ہو گا۔

امام مہدی رحمہ اللہ کے ظہور سے لے کر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے نزول تک کے دور کی مماثلت، ہجرت مدینہ سے لے کر فتح مکہ کی سی ہے۔ جیسے ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امارت کے تحت، دشمنوں کے خوف؛ رزق کی سختیاں؛ ہجرت کی پریشانیاں اور جہاد فی سبیل پر استقامت کی صورت میں ،اللہ سبحان و تعالیٰ پر خالص توکل کرتے ہوئے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا، تو فتح مکہ کی صورت میں جزیرہ نمائے عرب پر اللہ سبحان و تعالیٰ نے غلبہ عطا فرمایا۔ بعینہ اسی طرح جب مسلمان امام مہدی رحمہ اللہ کی امارت کے تحت، دشمنوں کے خوف؛ رزق کی سختیاں؛ ہجرت کی پریشانیاں اور جہاد فی سبیل پر استقامت کی صورت میں ،اللہ سبحان و تعالیٰ پر خالص توکل کرتے ہوئے ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں گے ،تو اللہ تعالیٰ نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اور قتل مسیح دجال کی صورت میں کُل دنیا پر اسلام کا غلبہ عطا فرمائیں گے۔انشاء اللہ تعالیٰ۔

کیا امام مہدی رحمہ اللہ کی خلافت کے قائم ہونے سے تمام مسلمان فتنہ دجال سے بچ جائیں گے؟

- ✓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"۔۔۔۔۔بلکہ میرے اہل بیت میں سے ایک مرد کے حوالہ کر دیں گے **وہ [زمین کو] عدل وانصاف سے بھر دے گا** جیسا کہ اس سے قبل لوگوں نے زمین کو جور و ستم سے بھر رکھا تھا۔۔۔۔" [سنن ابن ماجہ۔ جلد سوم ۔ فتنوں کا بیان ۔ حدیث ۹۶۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مطابق امام مہدی رحمہ اللہ زمین کو اسی طرح انصاف سے بھر دیں گے جیسے وہ پہلے ظلم وجور سے بھری ہوئی تھی۔ مگر کتنے مسلمانوں کو اپنے "**اسلامی جمہوری نظام**" کے بدلے "**خلافت علی**

منہاج النبوۃ" کے ماتحت، دنیاوی خواہشات کے حصول پر مبنی نہیں، بلکہ انصاف پر مبنی نظام میں زندگی گزارنے کی خواہش ہے؟

ماضی قریب میں افغانستان میں اسلام کے نام پر، انصاف پر مبنی، حکومتی نظام قائم ہونے کے باوجود، ہمارے اپنے معاشرہ میں، دینی و دنیاوی عوام و خواص کی ایک کثیر تعداد، جن کو آج تک "اسلامی جمہوری نظام" میں تورائی برابر کفر بھی نظر نہ آیا مگر اس ملک کے اسلامی نظام میں بے شمار غیر اسلامی شعائر نظر آ گئے اور اس واحد اسلامی نظام کے خاتمہ میں بدقسمتی سے مسلمان ہی صف اول میں نظر بھی آئے، جیسا کہ [صد افسوس] امام مہدی رحمہ اللہ علیہ پر پہلی حملہ آور فوج بھی نام نہاد مسلمانوں ہی کی ہو گی۔

ایسی صورت حال میں ہر قاری خود ہی فیصلہ کرے کہ "کیا واقعی امام مہدی رحمہ اللہ علیہ کی خلافت کا قائم ہونا اس کے نزدیک زیادہ اہم ہے؟" یا "عالم حق کی پہچان؟"، کیونکہ امام مہدی رحمہ اللہ علیہ کی خلافت سے استفادہ کے لیے لازم ہے کہ ہم اس قابل ہوں کہ موجودہ حالات میں جہاد فی سبیل اللہ کی دعویدار تحریکوں اور تنظیموں میں حق اور باطل کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کی مخالف باطل قوتیں اور ان کے حواریوں کی نشاندہی بھی کر سکیں کیونکہ امام مہدی رحمہ اللہ علیہ کی تحریک کا آغاز بھی جہاد فی سبیل اللہ کی نفیر عام ہی سے ہو گا۔

امام مہدی رحمہ اللہ علیہ کی خلافت علی منہاج النبوۃ، انصاف کا مظہر تو ہو گی مگر انسانی نفس پر گراں گزرنے والے مطالبات کے سبب اور اکثریتی علماء کی مہیا کردہ لاتعداد قیاس باطلہ کی بنیاد پر رخصتوں اور "دین آسان ہے" جیسی نفس پرست مصلحتوں کے تحت، اپنی دنیاوی خواہشات کی پیروی میں دجال کی مزین کردہ جنت کے امیدوار اس امت میں شاید زیادہ نظر آئیں گے۔

عقیدہ امام مہدی رحمہ اللہ علیہ کی عصر حاضر میں کیا اہمیت ہے؟

قرآن اور احادیث میں موجود ہر علم کی حیثیت محض علمی نہیں بلکہ عملی ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام مستقبل کی اخبار صحیحہ کا مقصد ہر مسلمان کے لیے اپنے عقائد و اعمال کی مستقل حفاظت ہے نہ کہ ذہنی تفریح کا ذریعہ۔

امام مہدی علیہ السلام سے متعلق اخبار صحیحہ کا بھی اصل مقصد اپنی شخصیت میں ان اوصاف [یعنی توحید خالص؛ ہجرت اور جہاد کی خالص نیت کے ساتھ حسب استطاعت مقدور بھر عمل] کا حصول مقصود ہے، جس کی وجہ سے ہمیں اس طائفہ منصورہ سے کسی درجہ کی نسبت نصیب ہو سکے؛ کیونکہ اگر ان کی ظاہری رفاقت نہ بھی نصیب میں ہوئی تو پھر بھی اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے؛

- ✓ وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا [سورة النساء؛١٠٠] اور جو شخص خدا کی راہ میں گھر بار چھوڑ جائے وہ زمین میں بہت سی جگہ اور کشائش پائے گا اور **جو شخص خدا اور رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے پھر اس کو موت آ پکڑے تو اس کا ثواب خدا کے ذمے ہو چکا** اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔
- ✓ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا جو شخص **صدق دل کے ساتھ شہادت کی تمنا کرے** تو اللہ اس کو شہیدوں کا مرتبہ عطا فرمائے گا اگرچہ وہ اپنے بستر پر ہی پڑ کر کیوں نہ مرے۔ [سنن ابوداؤد۔ جلد اول۔ استغفار کا بیان۔ حدیث ١٥١٦]

امام مہدی علیہ السلام کی خلافت، انسانی نفس پر دو انتہائی بھاری عملی مطالبوں کی متقاضی ہو گی؛ **ہجرت** اور **جہاد فی سبیل اللہ**۔ کتنے مسلمان آج ان دو عملی مطالبوں کو پورا کرنے کے لیے تیار ہیں؟ جبکہ موجودہ حالات میں عام مسلمان کے لیے ہی نہیں، بلکہ ہمارے علماء کی اکثریت کے نزدیک بھی طاغوتی اور کفریہ معاشروں سے ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی دینی ضرورت اور عصر حاضر میں ان اعمال کی اہمیت کا ذکر تک شجر ممنوعہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

لا الہ الا اللہ؛ لا الہ الا اللہ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك و سلم تسلیماً کثیرا کثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

اسراف، ابذار اور تکلف

- لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا [سورۃ الاحزاب:۲۱] تم کو **پیغمبر خدا کی پیروی (کرنی) بہتر ہے** (یعنی) اس شخص کو جسے خدا (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی اُمید ہو اور وہ خدا کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔

گو باطنی نیت کے اعتبار سے تو دین کا ایک ہی درجہ ہے؛ یعنی عمل کی نیت اللہ تعالٰی کے لیے خالص ہو؛ مگر ظاہری دینی و دنیاوی اعمال کے دو درجات ہیں؛ بلند ترین درجہ اور قابل قبول درجہ۔ بلند ترین درجہ کا معیار رسول اللہ ﷺ کی سنت مطہرہ کی صورت میں موجود ہے۔ نیت کو خالص رکھتے ہوئے، جو شخص بھی اپنے ظاہری اعمال میں سنت رسول ﷺ کے جتنا قریب ہو گا اتنا ہی قبولیت کے لحاظ سے ان ظاہری اعمال کا درجہ بلند ہو گا اور اتنا ہی ان ظاہری اعمال سے منسلک دینی اور دنیاوی فوائد کا حصول ممکن ہو گا۔

اعمال کا قابل قبول درجہ، شریعت میں موجود رسول اللہ ﷺ کی سنت سے وہ شرعی دوری ہے جس کا شمار اللہ کی معصیت اور نافرمانی میں شمار نہیں ہوتا اور یہی وہ حد ہے جہاں سے جائز معاملات میں اسراف اور ناجائز معاملات میں ابذار جنم لیتا ہے۔ گو اسراف، ابذار اور تکلف کا تعلق دین و دنیا کے تمام معاملات سے ہے مگر اس مختصر سے مضمون میں صرف مالی معاملات کے تناظر میں ان اصطلاحات کو بیان کیا جا رہا ہے۔ اہل دل دیگر معاملات پر انہیں اصولوں کا اطلاق کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالٰی نے قرآن کریم میں فرمایا

- -----ا وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ----[سورۃ البقرۃ:۲۱۸]-----اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کون سا مال خرچ کریں۔ کہہ دو کہ **جو ضرورت سے زیادہ ہو**-----

اس آیت کی زندہ تفسیر رسول اللہ ﷺ کی سنت مطہرہ ہے جس کی بدولت آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی اتباع میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سمیت کئی صحابہ رضی اللہ عنہم نے تمام زندگی نہ تو مال جمع فرمایا اور نہ ہی اس سبب زکوٰۃ ادا فرمائی۔ مال کے سلسلے میں قرآن پاک کا یہ خصوصی حکم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت مطہرہ ایک عام مسلمان کے لیے مالی معاملات میں عملی لحاظ سے بلند ترین درجہ کا مقام رکھتی ہے۔

مگر قرآن عظیم میں زکوٰۃ کے فرضیت کے باعث مالی معاملات میں قابل قبول درجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دے تو باقی مال اس کے لیے حلال اور پاک ہے بشرطیہ کہ اس میں دو شرائط موجود ہوں؛

أ. مال کی کمائی کے ذرائع حلال؛ جائز اور مباح ہوں۔

ب. مال کے مصارف (ضروریات وخواہشات کی شکل میں) حلال؛ جائز اور مباح ہوں۔

اگر مال کی کمائی کے ذرائع حرام اور ناجائز ہوں تو محض زکوٰۃ کی ادائیگی ایسے مال کو نہ تو حلال کر سکتی ہے اور نہ ہی پاک۔ بعینہ اگر حلال وپاک مال کے مصارف (ضروریات وخواہشات کی شکل میں) حرام اور ناجائز ہوں تو یہ اسراف کی بدترین شکل یعنی ابذار کو جنم دیتا ہے، جس کے بارے قرآن حکیم کا فتویٰ ہے؛

✓ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴿٢٦﴾ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا [سورۃ الاسراء؛۲۶۔۲۷] اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو۔ اور فضول خرچی سے مال نہ اُڑاؤ۔ کہ **فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی** ہیں۔ اور شیطان اپنے پروردگار (کی نعمتوں) کا کفران کرنے والا (یعنی ناشکرا) ہے۔

رہا یہ سوال کہ کب حلال وپاک مال کے مصارف حلال اور جائز ہونے کے باوجود اسراف کی حد میں داخل ہو کر مندرجہ ذیل آیت کے مطابق اللہ کی معصیت کا روپ ڈھال لیتے ہیں؛

✓ ــــــ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ [سورۃ الاعراف؛۳۱]

ــــــ اور کھاؤ اور پیؤ اور بے جانہ اڑاؤ کہ **خدا بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔**

اس کا تعلق انسان کی نیت سے ہے؛ جب بھی انسان کے مال کے مصارف کا محرک اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں بلکہ غیر اللہ کی خوشنودی کا حصول ہو تو یہ مال ضائع کرنے یعنی اسراف کے مترادف ہے۔ اس نیت کا بگاڑ کے دو بنیادی محرک ہیں اول نفس اور دوم معاشرہ۔

ایک موقع پر حضرت جابرؓ گوشت لیے حضرت عمرؓ کے قریب سے گزرے تو حضرت عمرؓ نے پوچھا "اے جابرؓ ہاتھ میں کیا ہے؟" انہوں نے کہا" گوشت ہے؛ اچھا لگ گیا تو میں نے اسے خرید لیا"، حضرت عمرؓ نے کہا" کیا جو چیز تمہیں بہتر لگ جائے گی تو تم اسے خرید ہی لو گے؟ کیا تم اس آیت کا مصداق قرار پانے سے نہیں ڈرتے؟"

- ✓ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ [سورة الاحقاف؛٢٠] اور جس دن کافر دوزخ کے سامنے کئے جائیں گے (تو کہا جائے گا کہ) **تم اپنی دنیا کی زندگی میں لذتیں حاصل کر چکے اور ان سے متمتع ہو چکے** سو آج تم کو ذلت کا عذاب ہے، (یہ) اس کی سزا (ہے) کہ تم زمین میں ناحق غرور کیا کرتے تھے۔ اور اس کی بدکرداری کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے اس آیت سے استدلال کے دو غالب احتمال ہیں؛ اول یہ کہ اپنے نفس کی خوشنودی کے حصول کے لیے دنیاوی لذتوں کے پیچھے بھاگنا کفار کا شیوہ ہے نہ کہ کسی مسلمان کا۔ اور دوم یہ کہ وہ دنیاوی لذتیں جن کا محرک اللہ کی خوشنودی کا حصول نہیں؛ ان کی حیثیت محض اس دنیا میں انسان کے نیک اعمال کے بدلے کی سی ہے اور آخرت میں خالی ہاتھ۔

معاشرتی محرک کا تعلق تکلف سے ہے؛ تکلف کے لغوی معنی "زحمت اٹھا کر کوئی کام کرنا، اپنے اوپر تکلیف گوارا کرنا، اہتمام یا التزام [خود عائد کردہ شرط یا پابندی، لازم قرار دے لینا] " کرنے کے ہیں۔ شرعی طور پر ہر وہ تکلف جس کا دین اسلام نے انسان کو مکلف نہیں ٹھہرایا وہ مکروہ یا حرام کی صورت میں غیر مطلوب ہے، چاہے عبادات میں ہو یا معالات میں کیونکہ اس تکلف کے نتیجہ میں انسان کے عمل کی نیت کا محور خالق نہیں بلکہ مخلوق ہوتی ہے۔

مالی معاملات میں عمومی طور پر غیر شرعی تکلف اختیار کرنے کے کئی اسباب ہیں؛ مثلاً رسم ورواج کی صورت میں معاشرتی دباؤ؛ لوگوں کی نظروں میں اپنے دنیاوی مقام کی فکر؛ نمود ونمائش وغیرہ۔ غیر شرعی تکلف کے حوالے سے معاشرہ میں دو ہی طرح کے طبقات کا وجود ممکن ہے؛ پہلا طبقہ جو نمود ونمائش کے باعث معاشرہ میں "اہتمام یا التزام" کے ذریعے اس غیر شرعی تکلف کا باعث بنے اور دوسرا طبقہ جو "زحمت اٹھا کر کوئی کام کرے یا اپنے اوپر تکلیف گوارا کرکے" معاشرہ میں اسی غیر شرعی تکلف کے استحکام کا باعث بنے۔

اب ہر وہ مالی مصرف، چاہے بظاہر چھوٹی نوعیت کا ہو یا بڑی نوعیت کا، جو معاشرہ میں غیر شرعی تکلف کو جنم دے یا غیر شرعی تکلف کے استحکام کا باعث بنے اس کا تعلق اسراف سے ہے؛ کیونکہ اس غیر شرعی تکلف اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اسراف کی صورت میں نعمتوں کا حصول اللہ سبحان وتعالٰی کے شکر کے بجائے مخلوق پر بڑائی کا اظہار یا ان کی خوشنودی کے حصول کی کوشش کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ہماری ذاتی زندگیوں میں رسم ورواج اور خوشی وغمی کے مواقع پر اسراف کی لاتعداد مثالیں موجود ہونے کے باعث اس گناہ کی حرمت ہی اکثریت کے ذہنوں سے محو ہو چکی ہے (الا ماشاء اللہ)۔

- ✓ قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ [سورۃ المائدۃ:۱۰۰] کہہ دو کہ ناپاک چیزیں اور پاک چیزیں برابر نہیں ہوتیں گو **ناپاک چیزوں کی کثرت تمہیں خوش ہی لگے** تو عقل والو خدا سے ڈرتے رہو تاکہ رستگاری حاصل کرو۔

ہمارے باہمی تحفے تحائف اور معمولی دعوتیں بھی اسی غیر شرعی تکلف کے باعث اسراف کا شکار ہیں؛ حتٰی کہ وہ اعمال جو بذات خود سنت کے درجہ میں ہیں، وہ بھی اس گناہ کی زد سے آزاد نہیں ہیں۔ مثلاً ولیمہ کی سنت؛ جس کا مقصد محض نکاح کی تشہیر ہے؛ وہ آج مکمل طور پر یا تو معاشرہ میں پہلے طبقہ کے باعث اسراف میں اضافہ کا باعث ہے یا دوسرے طبقہ کے باعث اس میں استحکام کا۔

✓ حضرت انس ؓ روایت کرتے ہیں ہم حضرت عمر ؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، تو انہوں نے کہا کہ "ہم تکلف سے منع کئے گئے ہیں"۔ [صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ کتاب اور سنت کو مضبوطی سے پکڑنے کا بیان۔ حدیث ۲۱۹۶]

ہمارا دین ہر قسم کے تکلف سے پاک ہے اور رسول اللہ ﷺ سمیت صحابہ ؓ انتہائی بے تکلف اشخاص تھے۔ ان کے تمام رسوم و رواج اور خوشیوں و غموں کا محور محض اللہ کی خوشنودی کا حصول اور اس کی نعمتوں کے شکر کا ذریعہ۔ اور اسی بے تکلفی کے باعث وہ ہر قسم کے اسراف سے پاک تھے؛ حتّٰی کہ حضرت عمر ؓ کے دور خلافت میں مفتوح زمین کا مال غنیمت میں شمار ہونے کی واضح سنت موجود ہونے کے باجود، اسی اسراف کے خدشہ کے باعث، اس سنت کو معطل ٹھہرا دیا اور اسی طرح جب معاشرہ میں ایک نشست میں تین طلاقوں کا رواج اسراف کی حد تک پھیل گیا تو باوجود سنت رسول ﷺ کے موجودگی کے جس کے مطابق ایسی طلاق صرف ایک طلاق ہی مانی جاتی تھی؛ حضرت عمر ؓ نے ایک نشست کی تین طلاقوں کو نافذ کرنا شروع کر دیا اور صحابہ ؓ نے اس کو قبول بھی کر لیا اور آج بھی امت میں یہی راجح نقطہ نظر ہے۔

عصر حاضر کے تناظر میں موزوں مثال

عصر حاضر میں مروجہ شادی کی مثال شاید اس مضمون کو سمجھنے کے لیے موزوں ترین ہے۔ احادیث میں سرکارِ دوعالم ﷺ نے اس اُمت کو ہدایت اور رہنمائی دی ہے کہ شادیاں ہلکی پھلکی اور کم خرچ ہوا کریں، اور بشارت سنائی گئی ہے کہ اگر ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شادیوں میں اور اُن کے نتیجوں میں بڑی برکتیں ہوں گی۔

اس سنت رسول ﷺ کے بلند ترین درجہ کا معیار اس حدیث پر ہے جس میں ہمیں یہ علمی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ نکاح بہت بابرکت ہے جس کا بار کم سے کم پڑے۔ [شعب الایمان للبیہقی] اور رسول اللہ ﷺ کی سنت مطہرہ کی شکل میں اس سلسلے میں عملی تعلیم جو موجود ہے، وہ کم سے کم حق مہر، خطبہ نکاح اور حسب استطاعت اسراف سے پاک ولیمہ پر مشتمل ہے۔ اس سنت کے درجہ میں عورت یا اس کے گھر والوں پر کسی بھی قسم کے مالی بوجھ کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔

اس سنت عمل کے قابل قبول درجہ میں حق مہر پر کوئی پابندی نہیں ہے؛ جتنا عورت چاہے۔ اور اسی درجہ کے تحت اگر والدین اپنی رضا وخوشی سے اپنی بیٹی کو رخصتی کے موقع پر حسب استطاعت تحفتاً کچھ دینا چاہے تو یہ شرعی طور پر ممنوع بھی نہیں، لیکن شریعت میں کہیں اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی گئی، نہ ہی کسی واضح روایت میں اس کا تذکرہ یا ترغیب ملتی ہے۔

بارات اور جہیز کا مروجہ تصور شادی کی سنت کے قابل قبول درجہ میں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ قرآن پاک کے مندرجہ ذیل واضح حکم کے مطابق چونکہ شادی کے کل اخراجات اور نان نفقہ کا مکلف مرد ہے؛ تو ان رسومات میں اسراف سے زیادہ ابذار کا پہلو نمایاں ہے؛

- ✓ ----- وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً -----[سورۃ النساء؛۲۴]----- اور ان (محرمات) کے سوا اور عورتیں تم کو حلال ہیں اس طرح سے کہ **مال خرچ کر کے ان سے نکاح کرلو** بشرطیکہ (نکاح سے) مقصود عفت قائم رکھنا ہو نہ شہوت رانی تو جن عورتوں سے تم فائدہ حاصل کرو ان کا مہر جو مقرر کیا ہو ادا کردو-----
- ✓ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ -----[سورۃ النساء؛۳۴] مرد عورتوں پر مسلط وحاکم ہیں اس لئے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس لئے بھی کہ **مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں**-----

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں اگر خطبہ نکاح کے بعد کھانا [معروفاً بارات کا کھانا] تکلف کے باعث، لازم ہی ٹھہر جائے، تو بھی اس کا بوجھ مرد پر ہے نہ کہ عورت پر۔ اس عمل کو سنت کے قابل قبول درجہ میں لانے کے لیے بہتر ہے کہ اس ضیافت کو مرد کی طرف سے بطور ولیمہ ادا کیا جائے۔ اس صورت میں خطبہ نکاح کا ولیمہ کی ضیافت سے پہلے ہونا لازم ہے۔

ولیمہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ بلا تکلف اختصار کے ساتھ جس قدر میسر ہو جائے اپنے خاص لوگوں کو کھلا دے، ولیمہ اسی حد تک مسنون ہے جس کو اسلام نے متعین کر دیا ہے، جس میں غرباء بھی ہوں، اور ولیمہ اپنی حیثیت کے مطابق ہو اور اسراف سے پاک ہو۔

اس سنت کی ادائیگی کے لیے گو شرعاً نہ مہمانوں کی کوئی تعداد مقرر ہے، نہ کھانے کا کوئی معیار، بلکہ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق کر سکتا ہے؛ مگر اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ کتنے ہی اکابر صحابہؓ کی شادیاں ہوئیں اور سرکارِ دوعالم ﷺ کو اطلاع تک نہیں تھی۔ اس کی وجہ رسول اللہ ﷺ کی وہ تعلیم وتربیت تھی جس کی بدولت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی شادی اور نکاح کی تقریبات میں بھی حضور ﷺ کو شرکت کی زحمت نہیں دیتے تھے، بلکہ اطلاع کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہی اس میں کوئی عار سمجھتے۔ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور خواص اصحاب میں شامل ہیں، انہوں نے خود اپنی شادی کی اور حضور ﷺ کو خبر بھی نہیں ہوئی۔

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك وسلم تسلیماً كثیرا كثیرا

بسم الله الرحمان الرحیم

اللھم ارنا الحق حقاً و رزقنا اتباعا و ارنا الباطل باطلاً و رزقنا اجتنابا

اسبال ازار

میرے عزیز بھائیوں اور بزرگوں؛ آج ہم نافرمانیوں پر نافرمانیاں کرتے جاتے ہیں اور دل ہے کہ احساس کرتا ہی نہیں۔ کئی ایسے اعمال جن کا دین میں کبائر کی فہرست میں شامل ہونا مُسَلّم ہے؛ وہ آج ہماری نظر میں صغائر کی فہرست میں بھی جگہ نہیں پاتے۔ انہیں اعمال میں سے ایک عمل اِسبالِ ازار [کپڑے ٹخنوں سے نیچے لٹکانا] کا ہے؛یعنی پاجامے، لنگی، پینٹ، وغیرہ کا ٹخنوں سے نیچے پہننا؛ جسے آج ایک عام مباح بات سمجھ لی گئی ہے۔

دین اسلام صرف حلال اور حرام کا مرکب نہیں ہے؛ بلکہ حلال و حرام کے درمیان لکیر دراصل دین کا سب سے پہلا درجہ ہے اور اِس لکیر کی پاسداری دین اسلام کا اولین تقاضا ہے۔ ایک مومن دین کے معاملات کو "**حلال و حرام کے ترازو**" پر نہیں بلکہ دین میں "**اس سے مطلوب کیا ہے**" پر پرکھتا ہے۔ آج کے دور میں ہم ہر مسئلہ کو حرام یا حلال کی فہرست میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں مگر اِس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا اصل میں ایک مومن مسلمان سے مطالبہ کیا ہے؟؛

"**وہی مطالبہ جس کی وجہ سے ایک مباح فعل بھی حرام یا فرض؛ پسندیدہ یا مکروہ قرار پا سکتا ہے**"۔

کیا اِسبالِ ازار [کپڑے ٹخنوں سے نیچے لٹکانا] تکبر کی علامت ہے؟

اَ. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اس کی طرف (قیامت کے دن) نظر نہیں کرے گا **جو اپنا کپڑا غرور کے سبب** سے زمین پر گھسیٹ کر چلے"۔ [صحیح بخاری ۔ جلد سوم ۔ لباس کا بیان ۔ حدیث ۷۴۸]

ب. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ اپنے ازار کو گھسیٹتے ہوئے جا رہا تھا۔ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس آدمی سے فرمایا تو کس قبیلے سے ہے اس نے اپنا نسب بیان کیا تو معلوم ہوا کہ وہ قبیلہ لیث سے ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پہچانا تو اسے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ

سے اپنے ان دونوں کانوں سے سنا ہے آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ "جو آدمی **اپنے ازار کو لٹکائے اور اس سے اس کا مقصد تکبر اور غرور کے سوا اور کچھ نہ ہو** تو اللہ قیامت کے دن اُس کی طرف نظر (کرم) نہیں فرمائے گا"۔ [صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ لباس اور زینت کا بیان۔ حدیث ۹۶۲]

ت. سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ایک شخص **ازار گھسیٹتے ہوئے کبر کے ساتھ چل رہا تھا** کہ زمین میں دھنسا دیا گیا اور وہ یوم قیامت تک زمین میں دھنستا ہی جائے گا"۔ [صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ لباس کا بیان۔ حدیث ۷۵۵]

ث. سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما اپنے والد (عبد اللہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص **اپنا کپڑا پہن کر غرور کے ساتھ چلے** تو اللہ تعالیٰ اُس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں فرمائے گا"؛ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرا تہہ بند ایک طرف لٹکا ہوا ہوتا ہے یا اِس میں گرہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے، تو نبی ﷺ نے فرمایا "تم ان میں سے نہیں ہو جو غرور کے سبب سے ایسا کرتے ہیں"۔ [صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ لباس کا بیان۔ حدیث ۷۴۹]

ج. رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے **اپنے ازار کو تکبر کرتے ہوئے لٹکایا** (ٹخنوں سے نیچے) اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے (نظر رحمت سے) نہیں دیکھیں گے"؛ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک میرا ایک طرف تہبند ڈھیلا رہتا ہے۔ الّا یہ کہ میں اسے باندھ لوں حضور ﷺ نے فرمایا کہ "تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو اسے غرور و تکبر کی وجہ سے کرتے ہیں"۔ [سنن ابوداؤد۔ جلد سوم۔ لباس کا بیان۔ حدیث ۶۹۴]

کیا تکبر کے بغیر اِسبالِ ازار [کپڑے ٹخنوں سے نیچے لٹکانا] جائز ہے؟

ح. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا اس حال میں کہ میری ازار لٹک رہی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا "اے عبد اللہ **اپنی ازار اونچی کر**" میں نے اُسے اوپر اٹھا لیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا "اور اٹھا" میں نے اور اٹھائی؛ میں اپنی ازار اٹھاتا رہا یہاں تک کہ کچھ

لوگوں نے کہا؛ کہاں تک اٹھائے؛ آپ ﷺ نے فرمایا "آدھی پنڈلیوں تک"۔ [صحیح مسلم۔ جلد سوم۔ لباس اور زینت کا بیان۔ حدیث ۹۶۵]

خ. ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جس نے **ٹخنوں کے نیچے ازار باندھا** وہ دوزخ میں ہو گا"۔ [صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ لباس کا بیان۔ حدیث ۷۵۲]

د. حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "مسلمان کا ازار نصف پنڈلی تک ہوتا ہے اور نصف پنڈلی اور ٹخنوں کے درمیان رکھنے میں کوئی حرج نہیں اور جو **حصہ ٹخنوں سے نیچے ہو** تو وہ جہنم کی آگ میں ہو گا جس نے **اپنے تہبند کو غرور کی وجہ سے لٹکایا** تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُسے نہیں دیکھیں گے"۔ [سنن ابوداؤد۔ جلد سوم۔ لباس کا بیان۔ حدیث ۷۰۲]

ذ. ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "تین آدمی ایسے ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا نہ انہیں گناہوں سے پاک وصاف کرے گا (معاف کرے گا) اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے"؛ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تین بار یہ فرمایا؛ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ یہ لوگ تو سخت نقصان اور خسارے میں ہوں گے یہ کون لوگ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "**ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والا** اور دے کر احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر سامان بیچنے والا"۔ [صحیح مسلم۔ جلد اول۔ ایمان کا بیان۔ حدیث ۲۹۳]

ر. رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛ "۔۔۔۔ اور اپنے تہبند کو نصف ساق (آدھی پنڈلی) تک اونچا رکھو، پس اگر اس سے انکار کرو تو **کم از کم ٹخنوں سے اونچا رکھو** اور تہبند (شلوار یا پاجامہ وغیرہ) ٹخنوں سے نیچے لٹکانے سے بچتے رہو اس لئے کہ یہ تکبر میں سے ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں فرماتے۔۔۔۔" [سنن ابوداؤد۔ جلد سوم۔ لباس کا بیان۔ حدیث ۶۹۳]

تو پھر کیا اِسبالِ ازار [کپڑے ٹخنوں سے نیچے لٹکانا] گناہ کبیرہ ہے؟

اہل علم نے کبیرہ گناہوں کی فہرست میں ان گناہوں کو شمار کیا ہے جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں واضح طور پر جہنم کی سزا بتائی گئی ہے یا جن کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے شدید غصہ کا اظہار فرمایا ہے۔

احادیث نمبر [أ] تا [ج] کی ایک تاویل امت کا ایک طبقہ یہ کرتا ہے "کہ بلا کبر وغرور کے ٹخنے سے نیچے لباس لٹکا لینے میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ احادیث میں تو کبر وغرور کی قید لگی ہے اور ہمارے اندر تکبر نہیں ہے، بلکہ ایک عام چلن کے طور پر ہم ایسا کرتے ہیں"۔

جبکہ اس کے برعکس جمہور علمائے حق احادیث نمبر [أ] تا [ج] اور احادیث نمبر [ح] تا [ر] میں موافقت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل وجوہات کے سبب فرماتے ہیں کہ سبالِ ازار [کپڑے ٹخنوں سے نیچے لٹکانا] بذات خود کبیرہ گناہ ہے اور کبر وغرور اس کبیرہ گناہ کی موجودگی میں ایک اور اضافی کبیرہ گناہ ہے؛

- ابو بکر رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ نے خیلاء [تکبر اور گھمنڈ] سے بری قرار دیا تھا تو کیا ہمارے لیے بھی کوئی ایسی ضمانت ہے جس کی بنیاد پر ہم اپنے آپ کو خیلاء سے پاک قرار دے رہے ہیں؟ بلکہ حدیث رسول ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ دل میں کچھ مرض ہے؛ جس کی وجہ سے حدیث کی تاویل کی جارہی ہے۔
- مذکورہ تاویل کی تردید اور اس شبہہ کا ازالہ خود حدیث نمبر [د] نے کر دیا ہے؛ جس میں دونوں اعمال کی علیحدہ علیحدہ وعید کا ذکر ہے۔
- نبی اکرم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ [أ] تا [ر] اس مسئلہ میں بالکل صریح اور واضح ہیں کہ اسبالِ ازار علامتِ تکبر ہے، لہٰذا اس کے بعد تکبر نہ ہونے کا دعویٰ کرنا نفسانی اور شیطانی دھوکہ ہے۔
- سلف رحمہم اللہ کے آثار واقوال سے بھی اسی موقف کی تائید ہوتی ہے؛

- ✓ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما **ہر حال میں** زمین پر ازار گھسیٹنے کو ناپسند فرماتے تھے۔ [ابن ابی شیبہ، فتح الباری:۱۰/۳۱۴]
- ✓ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ابو بکر ابن العربی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے کپڑے کو ٹخنے سے نیچے پہنے اور اس کی **یہ تاویل کرے کہ میرے اندر کبر نہیں ہے**۔ [فتح الباری:۱۰/۳۲۵]

آج بھی یہ مسئلہ ہمارے کسی بھی مکتب فکر کے دینی طبقے میں کسی نزاع کا باعث نہیں ہے؛ بلکہ اس مسئلہ کی اصل اس دنیاوی طبقہ میں ہے جو یہود و نصاریٰ کے چلن کو باعث فخر سمجھتے ہوئے؛ جدید فیشن پرستی کے سبب؛ دین کے شعائر پر عمل, معاشرہ میں باعث عار سمجھتا ہے۔

کیا نماز میں ٹخنے ننگے رکھنا لازمی ہے؟

جس اِسبالِ ازار [کپڑے ٹخنوں سے نیچے لٹکانا] کی حرکت سے اللہ کے رسول ﷺ نے اتنی سختی سے منع فرمایا ہے، اور جس پر اتنی شدید وعیدیں سنائی ہیں، اسی حرکت کو نماز میں کرنا، اللہ تعالیٰ کے سامنے اور اُس کے دربار میں کرنا، کس درجہ کا قبیح، مذموم اور کتنا گھناؤنا اور برا عمل ہو گا، اس کا فیصلہ ہر ایمان رکھنے والا دل کر سکتا ہے؛ اِسی لیے جمہور علماء نے لکھا ہے کہ اِسبالِ ازار کے ساتھ جو نماز ادا کی جائے، وہ مکروہ ہوتی ہے۔

کیا نماز سے قبل پائنچے موڑنا بھی حدیث اور فقہ کی رو سے مکروہ نہیں ہے؟

- ✓ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور یہ کہ **کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹوں**۔ [صحیح مسلم۔ جلد اول۔ نماز کا بیان۔ حدیث ۱۰۹۱]

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ کپڑوں کا سمیٹنا ممنوع ہے، اور پائینچے موڑنا بھی کپڑے کا سمیٹنا ہے، لہذا وہ بھی ممنوع ہو گا۔ اِسی مضمون سے مطابقت میں ایک دوسری حدیث بھی موجود ہے؛

- ✓ عون بن ابی جحیفہ رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ بلال کو میں نے دیکھا کہ وہ ایک نیزہ لے کر آئے اور اس کو زمین میں گاڑ دیا، پھر نماز کی اذان کہی، میں نے رسول اللہ ﷺ کو

دیکھا کہ آپ ﷺ حلہ پہنے ہوئے اس طرف اس کو سمیٹے ہوئے [حُلَّةٍ مُشَمِّرًا] تھے، باہر تشریف لائے اور نیزہ کی طرف منہ کرکے دو رکعت نماز پڑھی، میں نے دیکھا کہ آدمی، چوپائے آپ ﷺ کے سامنے سے نیزہ کے پرے چل رہے تھے۔ [صحیح بخاری۔ جلد سوم۔ لباس کا بیان۔ حدیث ۷۵۱]

اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے "مُشَمِّراً" جو "تشمیر" سے بنا ہے، اور "تشمیرُ الثوبِ" کے معنی لغت میں ہیں: آستین چڑھانا، پائینچے موڑنا، پاجامہ ٹخنوں سے اوپر کرنا۔ اسی لیے علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ نماز میں "کف ثوب" کی ممانعت "ازار" کے نچلے حصے کے علاوہ میں ہے۔ [فتح الباری ۳۱۶/۲]

لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ ؛ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی الہٖ و صحبہٖ و بارك وسلم تسلیماً کثیرا کثیرا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

"ابتداء میں اسلام اجنبی [مسافر کی مانند غیر معروف] تھا اور **عنقریب پھر غیر معروف ہو جائے گا** پس خوشخبری ہے بیگانہ بن کر رہنے والوں کے لئے"۔

[سنن ابن ماجہ۔ جلد سوم ۔ فتنوں کا بیان ۔ حدیث ۸۶۶]

اس کتاب میں ان مضامین کی حیثیت محض تذکیر کی سی ہے اور بنیادی مقصد قاری کے ذہن میں اس تصنیف کے ذریعے اس **اجنبی اسلام** کا تصور اجاگر کرنا ہے جس کے تصور سے بھی ہر مسلمان معاشرہ عمومی طور پر محروم ہے۔

حق کے پہچان کی حقیقت	رخصت اور حفاظتی تدبیر کی حقیقت
تقلید کی حقیقت	محاسبہ کی حقیقت
اولاد۔[صدقہ جاریہ] کی حقیقت	عقیدہ توحید کی حقیقت
عقیدہ رسالت کی حقیقت	عبادت اور عبادات کی حقیقت
تقدیر کی حقیقت	ضروریات دین کی حقیقت
ایمان کی حقیقت	طاغوت کی حقیقت
نظام کی حقیقت	شریعت کی حقیقت
گناہوں کی حقیقت	نفاق کی حقیقت
کفر کی حقیقت	نواقض اسلام کی حقیقت
تبلیغ کی حقیقت	الولاء والبراء کی حقیقت
جہاد کی حقیقت	جہاد پر عمومی اعتراضات کی حقیقت
اصطلاحات کی حقیقت	جمہوریت کی حقیقت
آئین پاکستان کی حقیقت	علمائے حق کی حقیقت
فتنہ عظیم کی حقیقت	امام مہدی کی حقیقت
اسراف، ابذار اور تکلف	اسبال ازار